ایک قرض جو امت مسلمہ کے کندھے سے چکا دیا گیا

صحیح بخاری پر کیے گئے فنی، تاریخی اور عقلی اعتراضات کے لاجواب جواب

صحیح بخاری

کا مطالعہ

اور فتنہ انکارِ حدیث

تالیف

حافظ ابو یحییٰ نور پوری

صحیح بخاری
کا مطالعہ
اور فتنہ انکار حدیث

فہرست ابواب

فہرست مضامین

پندرھواں باب — 402

تیمم سے متعلق سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا مباحثہ

حرفِ نظرثانی

حدیث کا دفاع کرنے والے زندہ ہیں!

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الأمین، أما بعد:

قرآن مجید کے بعد صحیح بخاری سب کتابوں سے زیادہ صحیح کتاب ہے جیسا کہ امتِ مسلمہ کے متفقہ تلقی بالقبول والے اصول (أصح الکتب بعد کتاب اللہ) اور اجماع سے ثابت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منکرینِ حدیث نے صحیح بخاری کو اپنے حملوں کا نشانہ بنایا ہے اور اسی سلسلے میں شبیر احمد ازہر میرٹھی نامی ایک منکرِ حدیث نے اسنادِ دار یاں کے بھیس میں ایک کتاب لکھی ہے:

"صحیح بخاری کا مطالعہ بخاری کی کچھ کمزور احادیث کی تحقیق و تنقید"

یہ کتاب [illegible] (۲۸۴ + ۲۸۰) صفحات پر مشتمل ہے۔

امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: یہ جعلی احادیث؟ [illegible] تو انھوں نے فرمایا: تعیش لھا الجھابذۃ ان کے لئے [illegible] ماہر محدثین زندہ ہیں۔ ❶

فی زمانہ منکرینِ حدیث کے مقابلے میں قرآن و سنت کا دفاع کرنے والے علمائے حدیث

---

❶ [illegible]

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کے مصنف کو اس کا بہت بڑا اجر عطا فرمائے، اُن پر اپنی رحمتوں اور فضل وکرم کی بارش نازل فرمائے اور کتاب وسنت کے دفاع اور دینِ حق کے فروغ کی مزید توفیق بخشے۔ آمین!

انکارِ حدیث کے مجرم ڈاکٹر بشیر نامی ایک منکرِ حدیث کی کتاب "اسلام کے مجرم" کا جواب راقم الحروف نے "صحیح بخاری پر اعتراضات کا علمی جائزہ" کے نام سے لکھا ہے جو مکتبہ اسلامیہ سے مطبوع ہے۔ والحمد للہ!

منکرینِ حدیث پر مزید ردود کے لئے دیکھئے ماہنامہ محدث لاہور (ح ۳۳ ص ۱۰۸،۱۱۰)

من اللّٰہ عزّ وجلّ الرسالۃ، وعلی رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم البلاغ، وعلینا التسلیم.

حافظ زبیر علی زئی

مدرسہ اہل الحدیث حضرو اٹک (۱۹/جولائی ۲۰۱۰ء)

کچھ مؤلف کے بارے میں

﴿ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ لِيَبْلُوَنِيْ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ﴾

یہ ۱۹۹۰ء کے اوائل کی بات ہے۔ صبح کے کوئی آٹھ بجے ہوں گے۔ میں حسب معمول دارالعلوم ضیاء السنہ، رائیونڈ جنگل، قصور میں شعبہ تحفیظ القرآن کی ایک کلاس میں تدریس کا مصروف تھا کہ اچانک ایک شخص اپنے ایک چودہ سالہ عزیز کی معیت میں نمودار ہوا۔ بات چیت سے معلوم ہوا کہ میری کلاس میں حفظ القرآن کے لیے ایک اور طالب علم کا اضافہ ہونے جا رہا ہے۔ مختصر سی گفتگو سے پتا چل گیا کہ یہ بچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہے اور میٹرک کے امتحانات سے ابھی فارغ ہوا ہے۔ حفظ قرآن کے لیے اس بچے کا جو شوق تھا اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا رہا تھا کہ پرائمری پاس کرنے سے اب تک اس کا گھر والوں سے مسلسل اصرار تھا کہ اسے حفظ القرآن کی اجازت دی جائے، لیکن گھر والوں نے پہلے مڈل اور پھر مڈل کے بعد میٹرک تک کے لیے اس کام کو مؤخر کیا۔

میں نے اللہ کے خاص فضل و کرم سے پانچ ماہ کے عرصہ میں قرآن کریم مکمل یاد کیا تھا۔ اس بچے کے ذوق و شوق کو دیکھ کر بے ساختہ میری زبان پر یہ الفاظ آ گئے کہ بیٹا مرا تب ہے کہ تم میرا ریکارڈ توڑ دو اور چار ماہ میں قرآن کریم مکمل یاد کر لو اور ان شاء اللہ تم نے ضرور ایسا کرنا ہے۔

میری اتنی سی بات اس بچے نے پلّے باندھ لی۔ پھر وقت پہ لگا کر پڑھنے لگا۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہونے لگے، لیکن موصوف نے بھی پرواز میں کوتاہی نہ آنے دی اور محض اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے چار ماہ کے قلیل عرصہ میں حفظ القرآن کی منزل طے کر لی۔

یہ بات جہاں بچے اور اس کے والدین کے لیے باعثِ سعادت تھی، وہاں استاذ ہونے کے ناطے میرے لیے بھی فضلِ الٰہی اور خوش بختی کی آئینہ دار تھی۔

اس بچے کا نام محمد اعجاز بن نذیر احمد تھا، جسے لوگ اب حافظ ابو یحییٰ نور پوری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حافظ موصوف ۱۷ فروری ۱۹۸۳ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی گاؤں نور پور ضلع قصور ہے۔ میٹرک تک کی تعلیم انہوں نے تھہ پالی تب رحیم جناب قصور میں حاصل کی۔ اس کے فوراً بعد حفظ القرآن کریم کے لیے دار العلوم ضیاء السنہ مرجع جناب میں داخلہ لیا۔ پھر ایک سال کے لیے جامعہ لاہور الاسلامیہ لاہور میں استاذ القراء قاری محمد ابراہیم میر محمدی حفظہ اللہ کی خدمت میں رہ کر تجوید القرآن کی تکمیل کی۔

راقم الحروف سے چونکہ حافظ موصوف سے بہت گہرے تعلقات قائم ہو چکے تھے اور محض الحب فی اللہ کے تحت پیدا ہونے والا یہ تعلق باپ بیٹے کے تعلق میں تبدیل ہو چکا تھا، لہٰذا دل میں ایک تڑپ تھی کہ میرا یہ بیٹا اپنے دور کا ایک عظیم محدث بنے۔ اس مقصد کے لیے تجوید القرآن سے فراغت کے بعد میں نے موصوف کو مرکز الدعوۃ السلفیہ ستیانہ بنگلہ، فیصل آباد کی طرف رختِ سفر باندھنے کا مشورہ دیا، جسے موصوف نے بخوشی قبول کر لیا۔ پھر وہ دن بھی آیا، جب حافظ موصوف نے درجہ ثانیہ کے سالانہ امتحانات میں مرکز کی تاریخ میں ایک ریکارڈ قائم کرتے ہوئے ۸۰۰ میں سے پورے ۸۰۰ نمبر حاصل کیے۔ اس دوران شیخوپورہ میں شیخ القرآن مولانا محمد حسین شیخوپوری رحمہ اللہ کے مدرسہ میں حفظِ حدیث کے سلسلے میں بلوغ المرام کو زبانی یاد کرنے کے مقابلہ کا اہتمام ہوا، جس میں موصوف نے پورے پاکستان میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔

مرکز الدعوۃ السلفیہ، ستیانہ بنگلہ سے حصول علم کے بعد انہوں نے دار التخصص والتحقیق، راولپنڈی سے علم رجال اور فن حدیث میں تخصص بھی کیا۔

دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ موصوف کی عصری تعلیم بھی جاری رہی۔ اب ماشاءاللہ ایم اے اسلامیات اور ایم اے عربی کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم فل بھی جاری ہے۔

موصوف دینی علوم میں رسوخ رکھنے کی بنا پر ایک کامیاب مدرس ہیں۔ جامعہ محمد بن اسمٰعیل البخاری بڑھتے، گندھیاں اوتاڑ، چونیاں، ضلع قصور کے ایک مخلص خادم ہونے کے ناطے انہوں نے دو سال تدریسی خدمات انجام دیں اور اب ایم فل کے سلسلے میں چونکہ لاہور میں قیام ضروری تھا، لہٰذا ایک دفعہ جامعہ کو خیرباد کہنا پڑا۔

موصوف بحمد اللہ ایک معروف قلمکار بھی ہیں۔ ماہنامہ السنۃ جہلم کے نائب مدیر کے عہدے پر عرصہ دو سال سے فائز ہیں۔ نیز اس کتاب کے علاوہ کئی ایک کتب بھی تصنیف کی ہیں، جو اشاعت کی منتظر ہیں۔ ان دنوں عالم اسلام میں کتاب و سنت کے معروف اشاعتی ادارے دار السلام نے سیرت انسائیکلوپیڈیا کی تدوین کے لیے ان کی خدمات حاصل کی ہیں۔

میں ایک دفعہ پھر کہنا چاہوں گا کہ اس سارے سلسلے میں نہ میرا کوئی کمال ہے نہ موصوف کا، بلکہ یہ ہم پر اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہے۔

میری مخلصانہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے اس بیٹے کو دین اور دنیا کے ہر میدان میں دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی نصیب فرمائے۔ آمین!

قاری محمد ادریس ثاقب

[illegible]

[illegible]

۲۸ دسمبر ۲۰۱۲ء

اظہارِ تشکر

سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھ جیسے ناچیز سے بخاری، حدیث اور دفاعِ اسلاف کا کام لیا۔ اس کی توفیق اگر شاملِ حال نہ ہوتی تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد میں ان تمام لوگوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میری ابتدائی تعلیم و تربیت کے لیے محض رضائے الٰہی کی خاطر محنت کی۔ وہ اساتذہ ہوں یا دیگر محسنین، میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ میری اس حقیر سی کوشش کو قبول کر کے ان سب کے لیے صدقۂ جاریہ بنا دے۔

خصوصاً میرے نانا مرحوم جن کی یاد جب بھی آتی ہے تو میری آنکھیں چھلک جاتی ہیں۔ وہ اس دنیا میں سب سے پہلے شخص تھے۔ جو مجھے دین کا ایک عظیم سپاہی بنانا چاہتے تھے۔ میرے والدین بھی شکریہ کے حقدار ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کو میری دینی تعلیم کے حصول میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ اسی طرح میری تعلیم و تربیت میں نمایاں کردار ادا کرنے والے استاذ محترم مولانا قاری محمد ادریس ثاقب، مدیر جامعہ محمدیہ اسماعیل البخاری کراچی جن کی مساعی جمیلہ میرے لیے ناقابلِ فراموش ہیں۔ مرکز الدعوۃ السلفیہ ستیانہ بنگلہ کے مدیر مولانا عتیق اللہ سلفی صاحب اور دیگر اساتذہ کرام بھی یقیناً اس موقع پر قابلِ ذکر ہیں۔

پھر ایک ایسی شخصیت جنہوں نے میری تحقیقی صلاحیتوں کو جلا بخشی، وہ مولانا علامہ غلام مصطفےٰ ظہیر امن پوری حفظہ اللہ ہیں۔ ان کی خصوصی توجہ اور شفقت نے میرے لیے کامیابیوں کے بہت سے دروازے کھولے۔ یہ کتاب خصوصاً اور میرے دوسرے تحقیقی مضامین ان ہی کے اشراف اور رہنمائی سے تکمیل تک پہنچے ہیں۔ اسی طرح میں محدث العصر مولانا حافظ زبیر علی زئی حفظہ اللہ کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات سے خصوصی وقت نکال کر اس کتاب کو مکمل طور پر حرف بحرف پڑھا اور میری بہت زیادہ عزت افزائی کی۔

آخر میں اپنے علاقے کے ان دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میری حوصلہ افزائی کی، خصوصاً محترم بھائی جمال الدین افغانی صاحب کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے کتاب کی تیاری اور طباعت میں بے لوث معاونت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میرے اس تحقیقی کام کو سب کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے۔ آمین!

مقدمہ

ایک مسلمان کے لیے جس طرح قرآن کریم پر ایمان لانا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے، اسی طرح نبی اکرم ﷺ کے فرامین کو بھی بلا چوں چرا تسلیم کرنا اور ان کی تعمیل کرنا بھی فرض ہے، کیونکہ قرآن کریم میں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کا حکم دیا، وہاں نجات اخروی کے لیے اپنے نبی کی اطاعت و فرمانبرداری کو بھی لازمی و حتمی قرار دیا ہے، اس لیے کہ کلام الٰہی کو سمجھنا توضیح رسول پر موقوف ہے، مثلاً قرآن کریم میں نماز قائم کرنے، زکوٰۃ ادا کرنے، روزہ رکھنے، حج کرنے اور دیگر شرعی احکام کو بجا لانے کا اجمالی حکم تو موجود ہے، لیکن اس اجمال کی تفصیل اور ان عبادات کے طریقہ ادائیگی کا علم ارشادات نبوی کی رہنمائی سے ہی ممکن ہو گا۔

رسول کریم ﷺ کے انہی ارشادات کو بحفاظت اور ملاوٹ سے پاک رکھنے کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور سے لے کر محدثین نے اپنی زندگیاں وقف کیں، تب یہ ذخیرہ حدیث ہم تک پہنچا، اور پہنچا بھی کیوں نہ کہ یہ دین ہے اور دین کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ یہی ارشادات نبوی کتب احادیث کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں، ان کتب کے محدثین نے سند کا اہتمام کر کے ایک ایسا عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ اسلام کے علاوہ کسی اور دین میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ قیامت تک کے لیے اسلام کا ایک معجزہ ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ اور ان کی عظیم الشان کتاب "صحیح بخاری" کو جو مقام و مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوا اور تمام اہلِ اسلام نے متفقہ طور پر صحیح بخاری کو جس قدر کامل یقین سے قبول کیا وہ محتاجِ بیان نہیں، یہی وجہ ہے کہ منکرین حدیث کو احادیث رسول ﷺ کا یہ صحیح ترین مجموعہ ایک آنکھ نہیں بھاتا، کیونکہ اس کتاب کی صحت ان کے انکارِ حدیث پر ضربِ کاری ہے لہٰذا امتِ مسلمہ کے اتفاق کو لات مارتے ہوئے انہوں نے صحیح بخاری پر اعتراضات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے لیکن ان ناعاقبت اندیشوں کو شاید یہ معلوم نہیں کہ صحیح بخاری پر اعتراض چاند پر تھوکنے کے مترادف ہے، چنانچہ ان کے اعتراضات صحیح بخاری کی شان کم کرنے کے بجائے ان کی اپنی ہی دروغ گوئی، لاعلمی اور جہالت کا پول کھولتے ہیں۔

پھر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان معترضین کو اپنے اعتراضات کی بوچھاڑ کرنے کے لیے عموماً امام بخاری رحمہ اللہ کی ذات ہی نظر آتی ہے، حالانکہ جن صحیح احادیث پر یہ لوگ حملہ کرتے ہیں، وہ امام بخاری رحمہ اللہ کے علاوہ ان سے پہلے اور بعد کے دوسرے محدثین نے بھی اپنی اسانید کے ساتھ بیان کی ہوتی ہیں، لیکن چونکہ ذخیرۂ حدیث میں صحیح بخاری کو سب سے اعلیٰ و ارفع مقام حاصل ہے لہٰذا ان کی ہر چند یہ کوشش ہوتی ہے کہ احادیثِ نبوی کے اسی صحیح ترین مجموعہ کو مشکوک بنا دیا جائے تاکہ عوام کے ذہن سے دوسری کتبِ حدیث کی وقعت خود بخود ختم ہو جائے، مگر ان کی یہ کوشش کبھی بھی ثمر آور نہ ہو سکے گی۔ ان شاء اللہ!

شبیر احمد ازہر میرٹھی نامی ایک شخص نے "صحیح بخاری کا مطالعہ، بخاری کی کچھ کمزور احادیث کی تحقیق و تنقید" کے نام سے ایک ایسی ہی بے کار کوشش کی ہے، آئیے عدل و انصاف کے ترازو میں اس کاوش کا وزن کرتے ہیں اور یہ بات عیاں کرتے ہیں کہ تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر ان کے یہ اعتراضات کوئی بھی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ صحیح بخاری پر ان کی یہ خامہ فرسائی خود ان کی رسوائی کا سبب بنی ہے۔ انہوں نے صحیح بخاری کو انکارِ حدیث کی عینک لگا کر پڑھا ہے۔ صحیح بات ہے کہ

اس صورت حال میں اعتراضات کے سوا، کسی رد عمل کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ اس طریقے سے تو اگر کسی نے قرآن کریم کا بھی مطالعہ کیا ہے تو اسے بھی اعتراضات کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا، مشرکین مکہ نے کیا قرآن مجید پر طرح طرح کے اعتراضات نہیں کیے تھے؟

اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان معترضین کی طرح ان منکرین قرآن کا بڑا اعتراض یہی تھا کہ قرآن کا کلام الٰہی ہونا ہماری عقل میں نہیں آتا، یہ اللہ کا کلام نہیں، بلکہ خود گھڑ لیا گیا ہے۔۔۔ حالانکہ اگر قرآن کریم کے لطیف معانی ان کی عقل میں نہ آتے تھے تو ان کا فرض اپنی عقل کا قصور تسلیم کرتے، اس اپنی عقل کو بیدار کرنا تھا نہ کہ قرآن کریم کا انکار کرنا۔ اور اب میرٹھی صاحب بھی صحیح بخاری کی احادیث پر جا بجا اعتراضات کرتے ہوئے بڑے غرور سے کہتے ہیں:

"کیا یہ ممکن ہے؟ اگر کوئی کہے کہ یہ ممکن ہے تو محال یا ناممکن، سب کس بات ہے۔۔۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بالکل عقل میں آنے والی نہیں ہے۔۔۔ ہرگز سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔۔۔"❶

حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اپنی عقل نارسا کو اس قابل بناتے کہ احادیث نبویہ ان کی سمجھ میں آ جاتیں، لیکن انھوں نے ان پر اعتراضات کرنے کی ٹھان لی ہے۔ اگر اسی طرح کوئی منکر قرآن کہہ دے کہ قیامت وغیرہ کے حالات کے بارے میں قرآنی تصریحات میری عقل تسلیم نہیں کرتی تو کیا وہ حق پر ہوگا؟ جو جواب قرآن کریم کی طرف سے منکرین قرآن کو دیا جائے گا، وہی صحیح احادیث کی طرف سے میرٹھی صاحب اور ان کے معتقدین کو دیا جائے گا۔

پھر اس سے بڑھ کر بدذوقی کیا ہوگی کہ آج کے دور میں کوئی شخص اٹھ کر امام بخاری سمیت تمام محدثین و فقہاء اور سلف صالحین کو فہم حدیث سے کورا قرار دے کر خود کو بڑا محقق و ناقد خیال کرتا

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/ ۱۴۹ - ۱۵۰

پھر سے، جیسے کہ شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب نے لکھا ہے:

"اسے پڑھنے والوں کے دلوں میں یہ خلش ضرور پیدا ہوگی کہ صحیح بخاری بڑی معروف و مستند اور مقبول عام کتاب ہے، جب سے یہ کتاب معرض وجود میں آئی ہے، ہر دور میں ہزاروں کی تعداد میں طلبہ علم مدارس دینیہ میں صحیح بخاری پڑھنے سننے کا شرف حاصل کر کے فارغ التحصیل ہوتے ہیں اور سند و دستار فضیلت پاتے ہیں، بلند پایہ علمائے کرام کے جم غفیر نے یکے بعد دیگرے اس کی مبسوط شرحیں لکھی ہیں، لیکن کسی شارح، کسی محشی اور کسی مستند عالم نے یہ لکھنے کی جسارت نہیں کی کہ اس اصح الکتب بعد کتاب اللہ میں بے سر و پا اور باطل حدیثیں بھی ہیں، جو بات متقدمین و متاخرین علمائے اعلام میں سے کسی پر نہیں کھلی، وہ اس کسمپرسی شخص شبیر احمد ازہر میرٹھی پر کیسے کھل گئی۔ ۔ ۔؟"

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ٹھیک ہے کہ مجھ سے پہلے کسی نے اول سے آخر تک صحیح بخاری کی ہر حدیث کو اس انداز سے (انکار حدیث کی عینک لگا کر۔ ازناقل) نہیں پڑھا، اس لیے کوئی صاحب نظران اغلاط سے واقف بھی نہیں ہوا جن سے میں واقف ہوا ہوں۔ ۔ ۔

اور دیگر تمام محدثین کی طرح بخاری کے یہاں بھی بھول چوک اور قصور بیان۔ غلط فہمی کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں۔ ۔ ۔ ❶

[illegible] آپ نے [illegible] بے باکی سے یہ [illegible] صاحب [illegible] صالحین کی [illegible] اور [illegible] سے [illegible] کر رہے ہیں۔

امام بخاری جیسے انسان تھے [illegible] سے غلطیوں کا صدور یقینی ممکن تھا [illegible] بخاری

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" [illegible] PART [illegible]

پر اعتراض کرنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم صرف ان کے صحیح کہہ دینے کی بنا پر یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ صحیح بخاری کی تمام "مرفوع، متصل" احادیث صحیح ہیں، بلکہ امت کے اس کی صحت پر اتفاق کر لینے کی وجہ سے یہ دعویٰ کرتے ہیں اور امت کا اجماع بالاتفاق ایک شرعی دلیل ہے، کیونکہ بقول رسول کریم ﷺ امت مسلمہ کبھی گمراہی پر اجماع نہیں کر سکتی۔ ❶

یعنی جب کسی بات پر مسلمانوں کا اجماع ہو جائے تو یہ اس کے حق ہونے کی دلیل ہے۔

تو صحیح بخاری کی صحت پر پوری امت مسلمہ کے اجماع و اتفاق کے باوجود منکرین صاحب کو جو اس میں بھول چوک، قصور، بے ربط اور غلط فہمی کی [illegible] مثالیں ملی ہیں تو کیا یہ خود کو علم ہی سے بری سمجھتے ہیں؟! کیا عجب ہے کہ ان کو ساری امت مسلمہ کے اتفاقی فیصلے میں جو غلط فہمیاں نظر آئی ہیں وہ درحقیقت ان کی اپنی ہی غلط فہمیاں ہوں اور یقیناً یہی ہے جیسا کہ ہم بیان کریں گے، پھر انہی غلط فہمیوں پر یہ خوش فہمی کا شکار ہو بیٹھے ہیں!!!

اس خوش فہمی یعنی غلط فہمی میں انہوں نے صحیح بخاری کے متعلق امت مسلمہ کے اجماعی عقیدے کو "ایک مبالغہ آمیز بات" قرار دیے بیٹھے ہیں۔

[illegible] اہل علم و نظر صحیح بخاری کی حدیثوں کو دیکھنے سے [illegible] [illegible] کی [illegible] نے [illegible] بالاتفاق [illegible] أصح الكتب بعد كتاب الله صحيح البخاري [illegible] مبالغہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ❷

❶ [illegible]

❷ [illegible]

اسکی عقل کا ماتم ہی کیا جا سکتا ہے جو امت کے کبار علماء کرام و محدثین و فقہاء کو بے علم و واعظین اور غیر محتاط مصنفین قرار دیتی ہے، کیونکہ:

امام نسائی ❶، امام دارقطنی ❷، امام بیہقی ❸، شارح مسلم علامہ نووی ❹، شیخ الاسلام ابن تیمیہ ❺، حافظ ابن الصلاح ❻، حافظ ابن کثیر ❼، علامہ زرکشی ❽، حافظ ابن ملقن ❾ اور شارح بخاری حافظ ابن حجر ❿ وغیرہم جیسے کبار محدثین اور ائمہ دین نے صحیح بخاری کو "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" قرار دیا ہے۔

امت کے اجماع و اتفاق کو ٹھکرانے اور علمائے امت کو بے علم اور غیر محتاط قرار دینے والے شخص کو اگر کوئی انہی کے الفاظ میں "بے علم واعظ اور غیر محتاط مصنف" قرار دے دے تو پھر؟

افسوس کی بات ہے کہ میرٹھی صاحب نے احادیث نبوی کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کرنے والے راویانِ حدیث اور ائمہ دین کے خلاف زبان درازی کرنے میں بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ قارئین کرام ذرا ان کی ہرزہ سرائی ملاحظہ فرمائیں، وہ لکھتے ہیں:

"عموماً راویانِ احادیث عقل و فہم سے بے بہرہ تھے، نقل کرنے کے لیے عقل کی ضرورت کے قائل نہ تھے" ⓫

یہ بھی حقیقت ہے کہ موصوف ایک ایک محدث کی شان میں گستاخی کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے

---

❶ [illegible] للخطیب [illegible] ❷ اطراف الغرائب والافراد للدارقطنی [illegible]

❸ معرفة السنن والآثار للبیہقی [illegible] ❹ شرح صحیح مسلم للنووی [illegible]

❺ مجموع الفتاوی لابن تیمیہ [illegible] ❻ مقدمة ابن الصلاح ص [illegible]

❼ اختصار علوم الحدیث لابن کثیر [illegible] ❽ النکت للزرکشی ص [illegible]

❾ [illegible] لابن الملقن [illegible] ❿ ھدی الساری لابن حجر ص [illegible]

⓫ صحیح بخاری کا مطالعہ حصہ اول ص [illegible]

امام مسلم رحمہ اللہ کے بارے میں لکھا ہے:

"امام مسلم نے بھی اپنی کتاب صحیح مسلم میں یہ جھوٹی کہانی ثبت فرما دی تھی۔" ❶

امام ابو داود رحمہ اللہ کے متعلق اپنی زبان کو بے لگام کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اس کو تخریج کرنے کی حماقت صرف امام ابو داود سجستانی نے کی ہے۔" ❷

امام ترمذی رحمہ اللہ کے بارے میں ہے

"ابو عیسیٰ ترمذی نے یہ حدیث اپنی کتاب میں ذکر کر کے کس اجر و ثواب کی توقع کی تھی؟" ❸

محدثین اور علمائے اسلام کو "غیر محتاط محققین" قرار دینے والے میرٹھی صاحب کی امام ابن ماجہ اور ان کے اساتذہ رحمہم اللہ کے بارے میں "احتیاط" کچھ اس طرح ہے:

"یہ بات نقل کرتے ہوئے نہ امام ابن ماجہ نے کچھ عقل سے کام لیا، نہ ان کے شیخ علقمہ بن عمرو دارمی نے، نہ ان کے شیخ ابو بکر بن عیاش نے۔" ❹

ورنہ تو اور موصوف نے صحابہ کرام کی عزت پر ہاتھ صاف کرنے سے احتراز نہیں کیا، سید المحدثین والفقہاء اور صحابی رسول سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"پھر ابو ہریرہ سے یہ غلطی سرزد ہوئی۔۔۔" ❺

نیز صحابی رسول سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث کو مشکوک قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ حضور اکرم ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے وقت بوام

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ج ۱/ ۳۶

❷ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ج ۱/ ۳۷

❸ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ج ۱/ ۱۰۱

❹ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ج ۱/ ۲۸۸

❺ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ج ۲/ ۲۵

ابن عازب نابالغ اور تقریباً نو سال کے بچے تھے، اکابر صحابہ میں سے کسی سے بھی یہ حدیث مروی نہیں ہے۔" ❶

صحابہ کرامؓ کی نفوسِ قدسیہ کی "غلطیاں" نکالنے کی جرأت شنیعہ سے خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں موصوف در پردہ ان لوگوں میں سے تو نہیں، جو تقیہ کر کے مسلمانوں کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں اور دشمنِ اسلام کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں!

کاش کہ جہالت و ظلمت کے اندھیروں میں مشعلِ راہ ثابت ہونے والے سلف صالحین و محدثین کو "بے عقل" اور "احمق" کہنے والے "عقل مند" حضرات اپنی زبان کو عقل مندی کی لگام دیتے!

چونکہ حدیثِ نبوی کا دفاع ہمیں محدثین کرام سے وراثت میں ملا ہے۔ ہر دور میں حدیث کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو ہمارے اسلاف نے دبایا ہے، لہٰذا سلف صالحین کی پیروی میں ہم بھی اس کتاب میں صحیح بخاری پر کیے گئے ایک ایک اعتراض کا جواب قرآن و سنت اور فہمِ سلف کی روشنی میں پیش کریں گے اور قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے احادیث صحیحہ پر اعتراضات کرنے والوں کو نشانِ عبرت بنا دیں گے۔ ان شاء اللہ العزیز!

طعن و تشنیع کرنا مسلمانوں کا شیوہ نہیں۔ ہم میرٹھی صاحب کی سخت بیانی اور شعلہ افشانی کے جواب میں اپنی قلم کو بندوق نہیں بنائیں گے، بلکہ ہر ممکن کوشش کریں گے کہ تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے حق دفاعِ حدیث کا فریضہ سرانجام دیا جا سکے۔ البتہ ہمیں صحابہ کرامؓ، ائمہ دین اور ثقہ محدثین کرامؒ کے بارے میں میرٹھی صاحب کے طرزِ بیان سے شکوہ ضرور رہے گا، اس لیے ہم میرٹھی صاحب کی عبارات کو پیش کرتے وقت وقتاً فوقتاً ان کی زبان درازیوں کو نشان زد کرتے

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۲۰

رہیں گے تاکہ ہر قاری میرٹھی صاحب کے جبر اور ہمارے صبر کا موازنہ کرتا رہے۔ اگر تحت احتیاط کے باوجود اس کتاب میں کہیں کوئی سخت جملہ قارئین کرام کو نظر آئے تو سمجھ لیں کہ وہاں میرٹھی صاحب کے جبر پر ہمارا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا ہے۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ کم پڑھے لکھے عام قاری کو بھی اس کتاب پر دسترس کا موقع دیا جائے، لہٰذا میرٹھی صاحب نے جس بھی حدیث پر اعتراض کیا ہے، ہم نے اسے ایک الگ باب کی شکل میں پیش کیا ہے۔ پھر چونکہ احادیث صحیحہ پر کیے گئے "میرٹھی اعتراضات" مختلف قسم کے ہیں، اس لیے ہم نے ہر باب کے تحت فصول بنا دی ہیں۔ فصل اول میں فنی اعتراضات کا اصولِ محدثین کی روشنی میں جائزہ لیا جائے گا، اسی طرح فصل دوم میں عقلی اور فصل سوم میں تاریخی اعتراضات کا منصفانہ تجزیہ کیا جائے گا۔ اگر کسی حدیث پر اعتراضات کرتے ہوئے میرٹھی صاحب سے کوئی فنی اعتراض نہ بن پائے گا تو ہم فصل اول کو حذف کر دیں گے، اسی طرح اگر کوئی تاریخی اعتراض نہ ہوا تو فصل ثالث حذف کر دی جائے گی۔

ہر حدیث پر فنی اعتراضات کے جوابات دیتے وقت بفضل اللہ رجالِ حدیث اور اصولِ حدیث کی تمام معتبر کتب ہمارے مدنظر رہی ہیں، نیز حدیث اور رواۃِ حدیث کے بارے میں محدثین کے اقوال اور ان کے اتفاقی اصول ہی حرفِ آخر سمجھے گئے ہیں۔ عقلی اعتراضات کے جوابات میں بھی ہماری ہر ممکن کوشش رہی ہے کہ اپنی طرف سے کوئی بات نہ کی جائے، بلکہ اس حوالے سے محدثین کرام اور شارحین حدیث کے اقوال نقل کرنے اور ان کی توضیح کرنے پر اکتفا کیا جائے۔ اسی طرح تاریخی اعتراضات کے جواب میں بھی تاریخ کی معتبر کتب اور محدثین کے اقوال کو ہی مدار بنایا گیا ہے۔

چونکہ میرٹھی صاحب کی طرف سے زیادہ تر اعتراضات صحیح بخاری کی ان احادیث پر کیے گئے ہیں، جو قرآن کریم کی تفسیر کرتی ہیں، لہٰذا اس حوالے سے امت مسلمہ کے ہاں مسلمہ مفسرین اور

ماہرینِ لغت وادب ائمہ کے اقوال کو بھی جگہ دی گئی ہے۔

پھر اس کتاب میں کوئی حدیث اور کسی صحابی، تابعی، تبع تابعی یا کسی امام کا کوئی قول بھی بغیر تحقیق کے نہیں لکھا گیا، بلکہ ہر حدیث اور ہر قول کی سند کو پرکھا گیا ہے، اگر وہ تحقیق کی کسوٹی پر پوری اتری ہے تو اسے درج کیا گیا ہے، ورنہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ کسی جگہ اگر کسی غیر صحیح حدیث یا قول کو کسی مقصد کے لیے پیش کیا گیا ہے تو وضاحت کر دی گئی ہے۔ اگر کہیں کوئی وضاحت نہیں ہے تو وہ بھی ہمارے نزدیک صحیح ہے۔

ان شاء اللہ ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کا مقصد کسی کی پگڑی اچھالنا یا تنقید برائے تنقید نہیں، بلکہ محض حدیث اور محدثین کے دفاع کے ذریعے رضائے الٰہی مقصود ہے۔ بارگاہ الٰہی میں یہی کاوش اگر شرفِ قبولیت سے ہمکنار ہو جائے تو یقیناً نجات کے لیے کافی ہو گی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری طرف سے کیے گئے حدیث اور اسلافِ امت کے اس دفاع کو قبول کر کے روزِ قیامت محدثین کا ساتھ نصیب فرما دے، نیز مجھ جیسے طالبِ علم کی اس ادنیٰ سی کوشش کو محض اپنے فضل سے تمام مسلمانوں کے لیے پیغامِ ہدایت بنا کر میرے لیے توشۂ آخرت بنا دے! اسی کے ہاتھ میں سب توفیق ہے۔

خادم اسلاف

حافظ ابو یحییٰ نور پوری

02 دسمبر 2010ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلا باب

حدیث تحریک شفتین

(لا تحرک به لسانک لتعجل به) کی تفسیر

(آغاز امر میں وحی کے وقت رسول اللہ ﷺ کا

بھول جانے کے ڈر سے جلدی جلدی ہونٹ ہلانے کا واقعہ)

سورۃ قیامہ کی آیات (۱۶-۱۹) میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو یہ تعلیم دی تھی کہ جب جبریل علیہ السلام آپ کی طرف وحی کرتے ہیں تو اس وقت آپ بھول جانے کے اندیشے سے جلدی جلدی ہونٹ نہ ہلایا کریں، بلکہ جب جبریل پڑھ کر وحی مکمل پہنچا چکیں تو آپ پڑھیں۔ وحی کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے، وہ اسے ضائع نہیں ہونے دے گا۔

قرآن کریم کے الفاظ بھی یہی بتاتے ہیں اور صحیح بخاری میں موجود سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ان آیات کی یہی تشریح کرتی ہے۔ صحابہ، تابعین، اتباع تابعین اور ائمہ دین، سب نے اتفاقی و اجماعی طور پر یہی تفسیر کی ہے۔

چودہ سو سال تک کسی مسلمان نے اس تفسیر کو غلط نہیں کہا۔ آپ کسی مسلمان کا نام بتائیں جو کوئی بھی تفسیر اٹھا کر دیکھیں، ان آیات کی یہی تفسیر آپ کو ملے گی۔ لیکن چودہ سو سال کے تمام مسلمانوں کو یکسر "عقل و فہم سے بے بہرہ، بے وقوف اور نہایت غیر محتاط طرز فکر کے حامل" قرار دے کر شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب نے اس حدیث اور اس تفسیر پر بہت سے بے تکے اعتراضات کیے۔ آپ ذرا ان سے پوچھئے کہ چودہ سو سال میں کیا کوئی بھی اتنی سمجھ بوجھ والا انسان پیدا نہیں ہوا جسے ان صاحب سے پہلے اس "حقیقت" کا ادراک ہو جاتا؟"

دراصل یہ لوگ چاہتے ہیں کہ صحیح حدیث پر اعتراضات کر کے اس کی دینی حیثیت کو مشکوک بنا دیا جائے اور پھر قرآن کی من مانی تفسیر و تشریح کرتے ہوئے اصل اسلام کو ختم کر دیا جائے۔

حدیث تو حدیث ہے، بڑے افسوس کی بات ہے کہ یہ صاحب قرآن کریم میں بھی عربیت کے لحاظ سے غلطیوں کے وجود کے قائل ہیں۔ ❶

لیکن پھر بھی بعض لوگ انہیں "مفسرِ قرآن" سمجھتے ہیں اور ان کی نام نہاد تفسیر "مفتاح القرآن" کو بڑا علمی خزینہ سمجھتے ہیں۔

آیئے صحیح بخاری کی اس صحیح حدیث پر ساری امت کے اتفاق کے خلاف انہوں نے جو اعتراضات کئے ہیں اس کا علمی تحقیقی اور عقلی جائزہ لیتے ہیں:

فصلِ اوّل: فنی اعتراضات کا جائزہ

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس واقعہ کے وقت عدم موجودگی

میرٹھی صاحب لکھتے ہیں:

"ابوعوانہ راوی نے جس کا نام وضاح بن عبداللہ یشکری ہے، یہ حدیث موسیٰ بن ابی عائشہ سے سنی تھی۔ موسیٰ بن ابی عائشہ کا بیان ہے کہ یہ حدیث بیان کرتے ہوئے عبداللہ بن عباس نے سعید بن جبیر سے فرمایا تھا کہ دیکھو، میں تمہیں اپنے ہونٹ ہلا کر دکھاتا ہوں، جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ آغاز امر میں حضرت جبرئیل کے ساتھ ایک ایک لفظ پڑھتے ہوئے ہونٹ ہلاتے تھے اور سعید بن جبیر نے موسیٰ بن ابی عائشہ سے کہا کہ دیکھو، میں تمہیں اپنے ہونٹ ہلا کر دکھاتا ہوں، جیسے عبداللہ بن عباس نے مجھے اپنے ہونٹ ہلا کر دکھائے تھے۔

اس پر یہ بجا یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس نے رسول اللہ ﷺ کے مقدس لبہائے مبارک جبرئیل کے ساتھ ساتھ لفظ لفظ پڑھنے کی وجہ سے ہلتے ہوئے کب دیکھے تھے؟

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ": 1/24

جب سورۃ القیامہ نازل ہوئی ہے تو ابن عباس پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے جب مکہ سے ہجرت فرمائی ہے تو ابن عباس اپنی عمر کے تیسرے سال میں تھے۔ انہیں ہوشمند ہونے کے بعد پہلی بار حضور اکرم ﷺ کو دیکھنے کا موقع ذی تعدہ سنہ ۷ ہجری میں میسر ہوا تھا، جب آپ عمرۃ القضاء کے لیے مکہ تشریف لے گئے تھے، اور اس روایت کے بموجب رسول اللہ ﷺ کا وحی اخذ کرتے ہوئے ہونٹوں کو ہلانا نبوت کے ابتدائی دور کی بات ہے، جسے عبداللہ بن عباس نے یقیناً نہیں دیکھا، کیونکہ وہ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے، پھر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سعید بن جبیر سے یہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ

أنا أحركهما لك كما كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يحركهما. (میں تمہیں اپنے ہونٹ ہلا کر دکھاتا ہوں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے ہونٹ ہلایا کرتے تھے) ہرگز نہیں۔ اس لیے یقین ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے سعید بن جبیر سے یہ نہیں کہا تھا اور غالباً سعید بن جبیر نے بھی موسیٰ بن ابی عائشہ سے یہ فضول اور غلط بات نہیں کہی ہوگی۔۔۔ بلکہ یہ خود موسیٰ بن ابی عائشہ کی طبع زاد اضافہ ہے۔۔۔" [1]

جواب: لیکن یہ اعتراض حدیث اور اصولِ حدیث سے تحت ناواقفیت کا نتیجہ ہے، کیونکہ بات یہ نہیں ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نزولِ وحی کے وقت آپ ﷺ کے جلدی جلدی ہونٹ ہلانے کی کیفیت کو آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا، بلکہ بعد میں نبی کریم ﷺ نے ان کو سورۃ القیامہ کی تفسیر سمجھاتے ہوئے اپنا یہ واقعہ سنایا تھا اور وہ کیفیت بھی دکھائی تھی، جو آپ ﷺ ان آیات کے نزول سے پہلے اختیار کیا کرتے تھے۔

مستخرج ابی نعیم میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے یہ صریح الفاظ ہیں:

---

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/ ۱۸-۱۰

رأیت رسول الله صلّی الله علیه وسلّم یحرّک شفتیه .

"میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے ہونٹ ہلاتے ہوئے دیکھا۔" ❶

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ یہی اعتراض نقل کرکے جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

لکن یجوز أن یکون النبی صلّی الله علیه وسلّم أخبره بذلک بعد أو بعض الصحابة أخبره أنه شاهد النبی صلّی الله علیه وسلّم ، والأوّل هو الصواب ، فقد ثبت ذلک صریحاً فی مسند أبی داوٗد الطیالسیّ ...

"ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بعد میں خود ان کو یہ بیان کیا ہو یا کسی اور صحابی نے ان کو بتایا کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا، لیکن پہلی بات (کہ خود رسول اللہ ﷺ نے ان کو بعد میں بتلایا تھا) کیونکہ مسند ابی داؤد طیالسی میں یہ صریح طور پر ثابت ہے۔" ❷

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ مفسر قرآن ہیں اور تفسیر انہوں نے رسول کریم ﷺ سے حاصل کی ہے، کیا یہ بات سمجھ میں نہ آنے والی ہے کہ آپ ﷺ نے ان آیات کی تفسیر بتاتے وقت ان کو وہ کیفیت بتادی تھی؟

معلوم ہوا کہ میرٹھی صاحب کا یہ اعتراض علم حدیث سے ناواقفیت کا کرشمہ ہے اور ان کا یہ کہنا نہایت بے جا ہے کہ:

"ابن عباس نے واقعتاً یہ بات کسی سے بھی نہیں سنی، نہ خود حضور کریم ﷺ سے، نہ کسی صحابی سے، ورنہ وہ ضرور بتاتے کہ مجھے یہ بات فلاں سے معلوم ہوئی تھی۔" ❸

---

❶ المسند المستخرج علی صحیح الإمام مسلم لأبی نعیم الأصبهانی: ٢/ ١٤٦٠ و مسند صحیحہ

❷ فتح الباری ٨/ ... ٢٩١

❸ تفہیم بخاری ... ۱۹/ ۳۰

ایک ہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آپ نے بہت زیادہ روایات کی ہیں اور بہت عمدہ (غلطیوں سے پاک بیان) کی ہیں۔۔۔ انہوں نے قرآن کریم بھی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ہی پڑھا تھا۔“ [1]

قارئین کرام کو ہم نے مقدمہ میں ہی بتا دیا تھا کہ یہ صاحب ایک ایک محدث کی شان میں گستاخی کرکے مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں اور آپ ان کا یہ فعل شنیع ملاحظہ کرتے ہی رہیں گے۔

تیسرا اعتراض: عدم سماع کا شبہ اور اس کا ازالہ

میرٹھی صاحب لکھتے ہیں:

”سعید بن جبیر نے بہت سی حدیثیں حضرت عبداللہ بن عباس سے براہ راست سنی تھیں اور بہت سی حدیثیں دیگر شاگردوں نے انہیں ابن عباس کی طرف منسوب کرکے بتائی تھیں۔ سعید نے ہر دو قسم کی حدیثوں کی روایت کی ہے مگر جب وہ پہلی قسم کی کوئی حدیث روایت کرتے تھے موصوف نے براہ راست ابن عباس سے سنی ہوتی تو حدثني ابن عباس یا سمعت ابن عباس یا اخبرني ابن عباس کہہ کر بیان کرتے تھے اور دوسری قسم کی کوئی حدیث روایت کرتے ہوئے یا تو اس شخص کا نام بتاتے تھے [illegible] حدثني عكرمة عن ابن عباس یا حدثني مجاهد عن ابن عباس یا اس شخص کا نام نظر انداز کرتے ہوئے عن ابن عباس کہہ دیتے۔“

یہ حدیث بھی اسی قسم کی ہے اس کے کسی بھی طریق میں سعید بن جبیر سے کوئی ایسا لفظ مروی نہیں جس سے ثابت ہو کہ سعید نے یہ قصہ براہ راست حضرت ابن عباس سے سنا تھا۔ یہ

---

[1] [illegible]

طریق کی اسناد میں سعید بن جبیر عن ابن عباس ہے۔۔۔۔

لیکن کسی بھی روایت میں یہ مذکور نہیں کہ سعید نے حدثنی یا اخبرنی یا سمعت یا انبانی ابن عباس کہا ہو۔ ہر طریق کی اسناد میں "عن ابن عباس" ہے۔" ❶

جواب: آیئے! اگر میرٹھی صاحب اور ان کے معتقدین کو سعید بن جبیر رحمہ اللہ کے "یہ قصہ براہ راست "سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے سننے پر دلالت کرنے والا کوئی لفظ" کسی طریق" میں نظر نہیں آیا تو ہم دکھا دیتے ہیں، وہ ذرا اپنی آنکھوں سے تعصب کی عینک اتار دیں اور میرٹھی صاحب کی اسی کتاب کو کھول کر صفحہ نمبر 17 نکالیں اور ان ہی کی ذکر کردہ حدیث پڑھیں، انہی کے ذکر کردہ "طریق" میں یہ الفاظ موجود ہیں:

وقال سعید: انا احرکھما لک کما رأیت ابن عباس یحرکھما ...

"سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے (اپنے شاگرد موسیٰ بن ابی عائشہ رحمہ اللہ سے) فرمایا: میں اسی طرح اپنے دونوں ہونٹوں کو حرکت دے رہا ہوں، جس طرح میں نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔" ❷

مزے کی بات یہ ہے کہ خود میرٹھی صاحب یہی بات صفحہ نمبر 18 پر ذکر کر چکے ہیں۔

پھر مسند احمد میں سعید بن جبیر رحمہ اللہ کے یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

فقال لی ابن عباس ...

"سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مجھے فرمایا۔۔۔" ❸

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" [illegible]

❷ صحیح بخاری: [illegible]

❸ مسند الامام احمد [illegible] وسندہ صحیح

ساتھ حدیث بیان نہ کریں ان کی حدیث قبول نہیں ہوتی۔

جب کہ امام سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ قطعاً "تدلیس" کے مرتکب نہ تھے، لیکن نہ جانے میرٹھی صاحب نے کون سی کتاب میں پڑھ لیا ہے کہ ہر راوی سے سماع کی تصریح کا مطالبہ کیا جائے۔ اور کہا جائے کہ اس نے کہیں بھی حدثنی یا سمعت یا اخبرنی نہیں کہا؟

کوئی میرٹھی ہی ہمیں بتائے کہ ان کے اس اصول کے مطابق کتنی احادیث بچیں گی، جن میں پوری سند میں سماع کی تصریح پر مشتمل ہے؟ کیا یہ منکرینِ حدیث و محدثین و محققین کا شاخسانہ نہیں؟

سعید بن جبیر کا تفرد

میرٹھی صاحب لکھتے ہیں:

"علاوہ بریں یہ حقیقت ہے کہ سعید بن جبیر کی بہ نسبت عکرمہ اور مجاہد حضرت عبداللہ بن عباس سے زیادہ مستفید ہوئے ہیں اور ان کے ملازمِ صحبت رہے ہیں اور بھی بہت سے بندگانِ خدا نے ابن عباس سے حدیثیں اور آیاتِ قرآن کی تفسیریں سنی ہیں، لیکن سعید بن جبیر اس حدیث کی روایت میں متفرد ہیں۔ ان کے علاوہ کسی نے بھی ابن عباس سے اس قصہ کی روایت نہیں کیا۔

اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ حضرت ابن عباس نے یہ قصہ بیان نہیں کیا تھا۔ کسی نے خواہ مخواہ اسے ابن عباس کی طرف منسوب کر کے سعید بن جبیر سے بیان کر دیا تھا اور سعید نے اس پر اعتماد کر کے اس کا ذکر بھی دوسروں سے کیا ہو، اور انہوں نے ابن عباس کی طرف منسوب کر کے اس کی روایت کر دی ہو۔" [1]

 قارئین انصاف سے بتائیں کہ اگر ایک استاد سے کئی شاگرد پڑھتے ہوں تو

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ" 1/171

کیا سب شاگرد ایک ہی جیسا علم حاصل کرتے ہیں، خصوصاً جبکہ موجودہ کلاس سسٹم نہ ہو؟ موجودہ نظام میں بھی سب شاگرد استاذ سے یکساں استفادہ نہیں کرتے، چہ جائیکہ اس دور میں ایسا ممکن ہوتا جب ہر کوئی اپنے طور پر کسی استاذ سے علم حاصل کرتا تھا، واضح بات ہے کہ یہ اعتراض انتہائی نامعقول ہے۔

روایتِ حدیث میں ثقہ کا تفرد مضر نہیں ہوتا

کیا سب احادیث سب صحابہ نے بیان کی ہیں؟ اب صحیح بخاری کی پہلی حدیث کو ہی لیں، جسے میرٹھی صاحب یقیناً صحیح سمجھتے ہیں، کیونکہ انہوں نے اسے چھیڑا تک نہیں، بلکہ سب سے پہلا اعتراض ہی دوسری حدیث پر کیا ہے۔

یہ حدیث صحابہ کرام میں سے صرف سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیان کی ہے، کیا اس شخص کی بات درست ہوگی جو میرٹھی صاحب کی طرح یہ راگ الاپنے لگے؟:

"یہ حقیقت ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی نسبت سیدنا ابو ہریرہ، سیدنا ابن عمر، سیدنا ابن عباس، سیدہ عائشہ ۔۔۔ وغیرہم رضی اللہ عنہم رسول کریم ﷺ سے زیادہ مستفید ہوئے ہیں اور ان کے ملازم صحبت رہے ہیں اور بھی بہت سے صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے حدیثیں سنی ہیں، لیکن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس حدیث کی روایت میں اکیلے ہیں، ان کے علاوہ کسی صحابی نے بھی رسول اللہ ﷺ سے اس حدیث کی روایت نہیں کی، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حدیث بیان نہیں کی۔۔۔"

حدیث کو پرکھنے کے لیے اصول محدثین کے ہی لاگو ہوں گے، محدثین میں سے کسی نے اس وجہ سے اس حدیث کو رد نہیں کیا۔ آپ کے مجتہدین کو یہ حق کس نے دیا ہے؟ میرٹھی صاحب خود لکھتے ہیں:

"محدثین کی اصطلاح میں صحیح حدیث وہ ہے جس کی اسناد متصل ہو اور راوی سب کے سب ثقہ وضابط ہوں اور اس کی اسناد یا متن میں نہ کوئی شذوذ ہو نہ کوئی علت ہو۔"❶

یہ تعریف خود میرٹھی صاحب نے ذکر کی ہے، اب قارئین ہی بتائیں کہ کیا اس میں یہ شرط موجود ہے کہ راوی کے دوسرے سب ساتھی بھی وہی حدیث بیان کریں تو تسلیم ہوگی؟

فصلِ ثانی — عقلی اعتراضات کا جائزہ

ضمیر بلا مرجع ہونے کا اعتراض

میرٹھی صاحب لکھتے ہیں:

"رہا اس کا متن تو اس میں دو زبردست خرابیاں ہیں، اول یہ کہ اس کی رو سے ضمیر غائب جو ان آیت میں سات بار آئی ہے:

﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۝ ﴾

(وہ ضمیر) قرآن کی طرف راجع ہے، حالانکہ سابقہ آیات میں قرآن کا کوئی تذکرہ نہیں ہے جس کی طرف ان ضمیروں کا راجع ہونا درست ہو، قرآن کی طرف یہ ضمیریں راجع ماننے کے لیے کوئی قرینہ چاہیے لفظی ہو یا معنوی اور یہاں کوئی قرینہ نہیں ہے۔"❷

جواب: آیئے اب میرٹھی صاحب کی طرف سے متن میں بیان کی گئی پہلی "خرابی" کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ میرٹھی صاحب کی اپنی سمجھ کی خرابی ہے یا (معاذ اللہ) حدیث کے متن کی۔

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/۲۰۔ ❷ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/۲۱۔۲۲

① جب ہم نے میرٹھی صاحب کی طرف سے کیے گئے اعتراضات رفع کر کے اس کی سند کو بالکل صحیح ثابت کر دیا ہے تو ضمیر کے بلا لوٹنے کا اعتراض ہم پر نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ پر ہے، کوئی مسلمان یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ آپ ﷺ کی بات باسند صحیح ثابت ہو جانے کے بعد ایسے احتمال پیش کرے۔

② آج تک کے تمام مسلمان مفسرین سورۃ القیامہ کی تفسیر میں اس حدیث کو ذکر کرتے رہے ہیں، اگر میرٹھی صاحب کے ذہن میں آنے والا اشکال کوئی علمی حیثیت رکھتا ہوتا تو صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ دین و محدثین کو ضرور معلوم ہوتا، وہ تو سب اس ضمیر کا مرجع قرآن کریم ہونا ثابت کرتے رہے ہیں، اگر یقین نہ آئے تو تفاسیر کا مطالعہ کر کے دیکھ لیں۔

درحقیقت یہ لوگ اس کاوش کے درپے ہو کر سب اسلافِ امت کی کردار کشی چاہتے ہیں، جیسا کہ وہ صریح طور پر بھی ان کو "عقل و فہم سے بے بہرہ" کہہ کر اس کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

③ رہا قرینہ کا سوال تو مفسر علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

والضمير للقرآن لدلالة سياق الآية نحو: ﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾...

"یہ ضمیر قرآن کریم کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ آیت کا سیاق اس پر دلالت کر رہا ہے، جیسا کہ سورۃ القدر کی پہلی آیت میں بھی یہی ضمیر ہے۔۔۔" ❶

علامہ ابن جزی لکھتے ہیں:

الضمير في به يعود على القرآن دلت على ذلك قرينة الحال...

"بہ میں ضمیر قرآن مجید کی طرف لوٹتی ہے، قرینہ حال اس پر دلالت کر رہا ہے۔" ❷

---

❶ تفسیر روح المعانی [illegible] ❷ کتاب التسہیل لعلوم التنزیل، سورۃ القیامۃ، آیت: [illegible]

لکھتے ہیں:

"دوم یہ کہ ﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ﴾ کو اس معنی و مطلب پر محمول کیا جائے، جو اس حدیث میں مذکور ہے تو اسے پچھلی اور بعد کی آیتوں سے کوئی ربط نہیں رہتا اور قرآن تو بہت بڑی چیز ہے اس کی بے ربطی تو کسی عقلمند انسان کے کلام میں بھی نہیں ہو سکتی... لہٰذا اصولِ حدیث کی رو سے یہ حدیث صحیح نہیں ہے، اگرچہ امام بخاری اور امام مسلم نے اس کی تخریج فرمائی ہے۔" [1]

تبصرہ برقی صاحب کا یہ اعتراض رافضیت کا پروردہ ہے، ہم ہی نہیں کہتے، تقریباً آٹھ سو سال پہلے امام رازی (م ۶۰۶ھ) اس آیت کی تفسیر میں لکھ گئے ہیں:

زعم قدماء الروافض أن هذا القرآن قد غيّر وبدّل وزيد فيه ونقص عنه، واحتجوا عليه بأنه لا مناسبة بين هذه الآية وبين ما قبلها، ولو كان هذا الترتيب من الله تعالى لما كان الأمر كذلك...

"قدیم رافضیوں نے دعویٰ کیا تھا کہ قرآن کریم (نعوذ باللہ) تغیر و تبدل اور کمی و بیشی کا شکار ہو گیا ہے، اس پر دلیل انہوں نے یہی پیش کی ہے کہ اس آیت اور پہلی آیات میں کوئی ربط نہیں ہے، اگر یہ ترتیب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی تو ایسا نہ ہوتا۔" [2]

صاحب تفسیر اللباب لکھتے ہیں:

قال بعض الرّافضة عدم مناسبتها لما قبلها يدلّ على تغيير القرآن..

"بعض رافضی لوگوں نے کہا ہے کہ ان آیات کا پہلی آیات سے ربط نہیں ہے، جس سے

---

[1] صحیح بخاری کا مطالعہ ۱/۲۴

[2] التفسیر الکبیر للرازی ج ۱۶/۱۹۰

انکارِ حدیث انکارِ قرآن ہے

ایک نکتہ یہ بھی یاد رہے کہ رافضیوں کو قرآن کریم میں بے ربطی اسی لیے نظر آئی تھی کہ وہ اس کی تفسیر حدیث سے نہیں کرتے تھے۔ اگر اس حدیث کو مانتے تو یقیناً بات ان کی سمجھ میں آ جاتی اور وہ انکارِ قرآن سے بچ جاتے۔ معلوم ہوا کہ انکارِ حدیث انکارِ قرآن ہے۔ یہی بات اگر سمجھ میں آ جائے تو میرٹھی صاحب کے معتقدین کی مشکل حل ہو سکتی ہے۔

تنبیہ:

اعتراضات سے فارغ ہو کر میرٹھی صاحب نے انکارِ حدیث کی روشنی میں سورۃ القیامہ کی ان آیات کی "تفسیر" کی ہے۔ جو کہ بالکل باطل اور بے ہودی ہے، لیکن ہم ابھی اس سے کوئی تعرض نہیں کریں گے، کیونکہ جب بفضل اللہ ہم نے صحیح بخاری کی اس حدیث پر وارد کیے گئے ان کے تمام اعتراضات کے کافی و شافی جوابات دے دیئے ہیں تو ان کی "تفسیر" خود بخود ہی مردود ہو جائے گی، دوسری بات یہ ہے کہ وہ ہمارے "موضوع یعنی صحیح بخاری" سے متعلق نہیں، تیسری بات یہ ہے کہ ابھی تک ان کی تفسیر نایاب ہے۔ امید ہے کہ عنقریب وہ منظرِ عام پر آ جائے گی، اللہ تعالیٰ نے موقع دیا تو ہم ان کی اس کتاب "مفتاح القرآن" کا ایک مستقل جواب لکھیں گے۔

ان شاء اللہ!

دوسرا باب

تحویلِ قبلہ سے متعلق

سیدنا براء بن عازب کی حدیث

صحابہ و تابعین سے لے کر آج تک کے مسلمانوں کا یہ اتفاقی نظریہ رہا ہے کہ رسول کریم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی آپ کی اقتدا میں اسی طرح نماز پڑھتے رہے لیکن آپ ﷺ کی دیرینہ خواہش یہی تھی کہ آپ کا قبلہ مسجد حرام ہو، تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی خواہش پر قبلہ تبدیل کر دیا۔

سورۃ البقرۃ کی آیت (۱۴۴) میں اسی بات کا تذکرہ ہے، صحابہ و تابعین و ائمہ دین نے اس آیت کی بالاتفاق یہی تفسیر کی ہے، اس بات کا تفصیلاً تذکرہ یہاں بہت زیادہ طوالت کا باعث ہوگا۔ پھر یہ ہمارے موضوع سے خارج بھی ہے۔ اس کی تفصیل ہم میرٹھی صاحب کی "تفسیر مطالب الفرقان" کے جواب میں پیش کریں گے۔ ان شاء اللہ!

مشہور مفسر قرآن امام قرطبی نے [illegible] اس بات کا انکار نہیں کیا، بلکہ حافظ [illegible] فرماتے ہیں:

وأجمع العلماء أن شأن القبلة أول ما نسخ من القرآن، وأجمعوا أن ذلك كان بالمدينة، وأن رسول الله صلى الله عليه وسلم إنما صرف عن الصلاة إلى بيت المقدس وأمر بالصلاة إلى الكعبة بالمدينة.

"علماء نے امت کا اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ قرآن میں سب سے پہلے منسوخ

ہوئے اس معاملہ فہمی سے ہی ان کا اس بات پر بھی اجماع ہے کہ تحویلِ قبلہ والا معاملہ مدینہ منورہ میں ہوا اور رسول اللہ ﷺ بیت المقدس سے ہٹ کر کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم مدینہ میں دیئے گئے۔" ❶

نیز لکھتے ہیں:

ولم يختلف العلماء في ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا قدم المدينة صلى الى بيت المقدس ستة عشر شهرا ...

"اس بات میں علمائے امت کا اختلاف نہیں (بلکہ اجماع) ہے کہ جب رسول اکرم ﷺ مدینہ تشریف لائے تو آپ نے (حکمِ الٰہی) سولہ ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں ادا کیں۔" ❷

مگر اپنی "روایت" کو برقرار رکھتے ہوئے پوری امت مسلمہ کے اس اتفاقی نظریے کو بھی یہ عثمانی صاحب نے ٹھکرا کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ

"آپ ﷺ نے اور آپ کے پیچھے نماز پڑھنے والے مہاجرین نے کبھی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے کوئی فرض نماز ادا نہیں کی اور ہمیشہ آپ کا قبلہ خانہ کعبہ ہی رہا ہے۔" ❸

اور انہوں نے اس بارے میں صحیح بخاری کی اس متعلقہ احادیث پر بہت سے غیر علمی قسم کے اعتراضات کیے ہیں۔ ہم نے بھی بدستور ان اعتراضات کے علمی و تحقیقی جوابات دیئے ہیں۔ اب فیصلہ قارئین کے ہاتھ میں ہے کہ وہ محدثین اور ائمہ دین سمیت پوری امت مسلمہ کی اجماعی

---

❶ التمهيد لما في الموطأ من المعاني والأسانيد لابن عبد البر: ٤٩/١٧

❷ تمهيد لابن عبد البر: ١٣٤/٢٣ ـ ١٣٥

❸ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ٤٥/١

متعلق تفصیلی بحث ہے یا چودھویں پندرھویں صدی کے ان "منکرین" کی، جنہیں حدیث، اصولِ حدیث، اور محدثین سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

فصل اول: فنی اعتراضات کا جائزہ

ابو اسحاق السبیعی کے اختلاط کی بحث

میرٹھی صاحب لکھتے ہیں:

"حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث صرف ابو اسحاق ہمدانی کوفی نے روایت کی ہے۔۔۔ جلیل القدر و ثقہ محدث تھے، صحابہ کرام میں سے حضرت براء بن عازب و جابر بن سمرہ و حارثہ بن وہب خزاعی رضی اللہ عنہم سے حدیثیں سنی تھیں، کثیر التعداد محدثین نے ان سے علمی استفادہ کیا اور حدیثیں روایت کی ہیں، لیکن بڑھاپے میں ان کی عقل و قوتِ حفظ میں بہت فتور آگیا تھا، بچوں کی سی باتیں کرنے لگے تھے۔ زہیر بن معاویہ، شعبہ، زکریا بن ابی زائدہ وسفیان بن عیینہ اور اسماعیل بن ابی خالد نے ابو اسحاق سے ان کے آخر زمانہ میں حدیثیں سنی تھیں۔ اس پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے اور ان کے پوتے اسرائیل بن یونس نے ان سے ہوشمندی کے زمانہ میں بھی حدیثیں سنی تھیں اور خبط الحواسی کے زمانہ میں بھی۔

اس لیے زہیر بن معاویہ، شعبہ، زکریا، ابن عیینہ گو ثبت و ثقہ محدث تھے لیکن جو حدیثیں ان لوگوں نے ابو اسحاق سے سن کر روایت کی ہیں، ان میں بکثرت غلط سلط اور بے سر و پا باتیں پائی جاتی ہیں، یہی حال اسرائیل کی روایت کردہ حدیثوں کا ہے، ہاں سفیان ثوری رحمہ اللہ نے ابو اسحاق سے اس زمانہ میں حدیثیں سنی ہیں، جب وہ صحیح الحواس تھے اور عقل و حفظ میں فتور نہ آیا تھا۔۔۔" [1]

---

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۲۵_۲۴/۱

جواب ① اس ایک عبارت میں میرٹھی صاحب نے اپنے خاص روایتی انداز میں کئی خلافِ واقعہ باتیں انتہائی ذوق کے ساتھ کہہ دی ہیں، وہ یوں کہ انہوں نے پانچ راویوں زہیر بن معاویہ، شعبہ، زکریا بن ابی زائدہ، سفیان بن عیینہ اور اسماعیل بن ابی خالد کے بارے میں تمام اہلِ علم کا اتفاق نقل کیا ہے کہ انہوں نے ابو اسحاق سے مختلط الحواس کے زمانہ میں حدیثیں سنی تھیں، حالانکہ

امام شعبہ اور سفیان ثوری کا ابو اسحاق سے سماع قبل از اختلاط ہے

میرٹھی صاحب کے قول کے بالکل برعکس امام شعبہ رحمہ اللہ کے بارے میں محدثین کرام کا اتفاق ہے کہ انہوں نے امام ابو اسحاق سبیعی رحمہ اللہ سے ان کی عقل میں فتور آنے سے پہلے احادیث سنی تھیں۔ امام شعبہ کے ابو اسحاق سے اختلاط کے بعد احادیث لینے پر اتفاق تو درکنار، کسی ایک محدث نے بھی امام شعبہ کے بارے میں یہ نہیں لکھا کہ انہوں نے ابو اسحاق سے مختلط الحواس کے بعد حدیثیں بیان کی ہیں، جیسا امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

زكريا بن أبي زائدة وزهير بن معاوية وإسرائيل حديثهم عن أبي إسحاق سواء وإنما أصحاب أبي إسحاق سفيان وشعبة.

”ابو اسحاق سے زکریا بن ابی زائدہ، زہیر بن معاویہ اور اسرائیل کی حدیث تقریباً برابر ہے، ابو اسحاق کے اصحاب سے پختہ اثبات تو سفیان اور شعبہ ہیں۔“ ①

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ولم أر في البخاري من الرواية عنه إلا عن القدماء من أصحابه كالثوري وشعبة

① [illegible]

"میں نے صحیح بخاری میں ان (ابو اسحاق رحمہ اللہ) کی کوئی روایت نہیں دیکھی، سوائے ان روایات کے جو ان کے (مجموعہ الحواس سے) پہلے شاگرد بیان کرتے ہیں جیسے کہ امام سفیان ثوری اور شعبہ رحمہما اللہ ہیں۔" ❶

محدث البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وكان قد اختلط، إلا من رواية سفيان الثوري وشعبة، فحديثهما عنه حجة..

"وہ (ابو اسحاق) اختلاط کا شکار ہو گئے تھے، سوائے سفیان ثوری اور شعبہ کی روایت کے (کہ انہوں نے اختلاط سے پہلے بیان کیا تھا)، لہٰذا ان دونوں کی ان سے حدیث حجت ہے۔" ❷

فائدہ جلیلہ:

امام ترمذی رحمہ اللہ ایک حدیث کے بارے فرماتے ہیں:

إنّ شعبة والثوري سمعا هذا الحديث من أبي إسحاق في مجلس واحد...

"بلاشبہ امام شعبہ اور امام سفیان ثوری رحمہما اللہ نے یہ حدیث امام ابو اسحاق رحمہ اللہ سے ایک ہی مجلس میں سنی ہے۔" ❸

پھر اس پر دلیل دیتے ہوئے باسند صحیح امام شعبہ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

سمعت سفيان الثوري يسأل أبا إسحاق: أسمعت أبا بردة...

---

❶ هدي الساري مقدمة فتح الباري: ٤٣٦

❷ سلسلة الأحاديث الصحيحة: ٤/ ٨٢٢

❸ جامع الترمذي، تحت حديث: ١١٢٦

"میں نے سفیان ثوری کو سنا کہ وہ امام ابو اسحاق سے یہ پوچھ رہے تھے کہ کیا آپ نے ابو بردہ رضی اللہ عنہ سے سنا ہے کہ ۔۔۔" ❶

جب میرٹھی صاحب یا تمہ جوئی یا اعلان کر رہے ہیں کہ:

"ہاں، سفیان بن سعید ثوری رحمہ اللہ نے ابو اسحاق سے اس زمانہ میں حدیثیں سنی تھیں، جب وہ صحیح الحواس تھے اور عقل میں فتور نہ آیا تھا ۔۔۔"

تو بھلا یہ ذرا کتنی صداقت کا حامل ہے کہ ان کے ساتھ مل کر احادیث سننے والے شعبہ نے ابو اسحاق سے مختلط الحواس ہونے کے بعد حدیثیں لی ہیں؟

نہ جانے میرٹھی صاحب کو اہل علم کے اس اتفاقی فیصلے کے خلاف "اہل علم کا اتفاق" کہاں سے ملا تھا؟ میرٹھی صاحب کا کوئی معتقد مہربانی کر کے ہمیں اپنے صاحب کی اس بات کا ثبوت دے!

ثانیاً: اسی طرح سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کا ابو اسحاق السبیعی سے آخر میں سننا بھی کسی معتبر ذریعے سے ثابت نہیں، چہ جائیکہ اس پر اہل علم کا اتفاق ہو، چنانچہ جب حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ نے ان کے بارے میں فرمایا تھا:

ویقال: انّ سماع سفیان بن عیینة منه بعد ما اختلط ...

"کہا جاتا ہے کہ سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کا سماع ان (یعنی ابو اسحاق السبیعی رحمہ اللہ) سے اختلاط کے بعد ہے۔" ❷

تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حافظ زین الدین عبدالرحیم بن الحسین العراقی (۷۲۵ھ۔ ۸۰۶ھ) فرماتے ہیں:

---

❶ جامع الترمذی، تحت حدیث: ۲۱۱۲

❷ مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۹۸

.. أن المصنف ذكر كون سماع ابن عيينة منه بعد ما اختلط بصيغة التمريض، وهو حسن، فإن بعض أهل العلم أخذ ذلك من كلام ابن عيينة، ليس صريحا في ذلك...

"مصنف (حافظ ابن الصلاح) نے سفیان بن عیینہ کا (ابو اسحاق کے) مخلوط الحواس ہونے کے بعد سننا صیغۂ تمریض (شک والے الفاظ) کے ساتھ ذکر کیا ہے اور یہ درست ہے، کیونکہ بعض اہل علم نے یہ (اختلاط کے بعد سننے والی) بات سفیان بن عیینہ کی اس کلام سے اخذ کی ہے جو کہ اس بارے میں صریح نہیں ہے۔" ❶

اسرائیل بن یونس نے ابو اسحاق سے ان کی ہوشمندی میں سماع کیا تھا

جبکہ: برقی صاحب لکھتے ہیں:

"ان کے پوتے اسرائیل بن یونس نے ان سے ہوش مندی کے زمانے میں بھی کچھ حدیثیں نقل کیں اور کچھ بدحواسی کے زمانے میں بھی۔" ❷

حالانکہ: ① امام عبدالرحمٰن بن مہدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ما فاتني من حديث الثوري عن أبي إسحاق الذي فاتني إلا لما اتكلت به على إسرائيل، لأنه كان يأتي به أتم.

"مجھ سے ابو اسحاق کی جو حدیث بواسطہ سفیان ثوری رہ گئی ہے، وہ اسی وقت رہی ہے جب میں نے اس کے بارے میں اسرائیل پر اعتماد کیا ہے، کیونکہ وہ اسے مکمل بیان کرتے تھے۔" ❸

---

❶ التقييد والإيضاح شرح مقدمة ابن الصلاح (ص ٤٢٨)

❷ صحیح بخاری کا مطالعہ ۱/۲۵

❸ جامع ترمذی، تحت حدیث: ۲۳۱

اگر اسرائیل نے ابو اسحاق سے بعد از اختلاط بیان کیا ہوتا تو عبد الرحمن مہدی جیسے ماہرِ رجال و حدیث امام سفیان ثوری رحمہ اللہ کو چھوڑ کر کبھی اسرائیل پر اعتماد نہ کرتے، حالانکہ یہ بات سب کے ہاں مسلم ہے کہ امام سفیان ثوری نے ابو اسحاق سے قبل الاختلاط سنا ہے۔

نیز ابن مہدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

كان اسرائيل يحفظ حديث أبي اسحاق كما يحفظ الحمد.

”اسرائیل کو ابو اسحاق کی احادیث سورۂ فاتحہ کی طرح یاد تھیں۔“ ❶

(۲) امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک روایت میں سفیان ثوری اور شعبہ کے مقابلے میں ابو اسحاق کی روایت میں اسرائیل کی طرف سے زیادت کو ”ثقہ کی زیادت“ قرار دے کر قبول کیا ہے۔ ❷

اگر امام صاحب کے نزدیک انہوں نے بعد از اختلاط سنا ہوتا تو کبھی ان کی زیادت کو امام صاحب شعبہ اور سفیان ثوری رحمہما اللہ کے مقابلے میں قبول نہ کرتے جنہوں نے بالاتفاق ابو اسحاق السبیعی رحمہ اللہ سے قبل الاختلاط احادیث سنی ہیں۔

(۳) حجاج بن محمد کہتے ہیں: ہم نے امام شعبہ رحمہ اللہ سے ابو اسحاق رحمہ اللہ کی حدیث بیان کرنے کو کہا تو انہوں نے فرمایا:

سلوا عنها اسرائيل، فإنه أثبت فيها مني.

”ان (ابو اسحاق کی احادیث) میں وہ مجھ سے اثبت (زیادہ ثقہ) ہے۔“ ❸

جب امام شعبہ بالاتفاق امام ابو اسحاق سے قبل الاختلاط بیان کرتے ہیں تو جس اسرائیل کو وہ

---

❶ المستدرك على الصحيحين للحاكم: ٢/ ٢٧٢، وسنده صحيح

❷ السنن الكبرى للبيهقي: ٧/ ١٠٨، وسنده صحيح

❸ الكامل لابن عدي: ١/ ٤٦٢، وسنده صحيح

ابو اسحاق سے بیان کرنے میں اپنے سے زیادہ ثقہ قرار دیتے ہیں، وہ تو بالاولیٰ ابو اسحاق سے قبل الاختلاط بیان کرتے ہیں۔

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ امام شعبہ جو اسرائیل کے ہم عصر ہیں اور ابو اسحاق السبیعی سے بیان کرنے میں ان کے ساتھ شامل ہیں، ان سے بڑھ کر اسرائیل کی روایات کو اور کون جان سکتا ہے؟

اسی لیے حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

نعم! شعبة أثبت منه إلا في أبي إسحاق

”ہاں! شعبہ ان (اسرائیل بن یونس) سے اثبت ہیں، سوائے ابو اسحاق کی احادیث کے (ان میں اسرائیل شعبہ سے اثبت ہیں)۔“ ❶

اگر اسرائیل نے بعد الاختلاط ابو اسحاق السبیعی سے احادیث سنی ہوتیں تو وہ شعبہ سے ”اثبت“ کیسے قرار پاتے؟

❷ امام ابو حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

إسرائيل من أتقن أصحاب أبي إسحاق

”اسرائیل ابو اسحاق کے سب سے پختہ کار شاگردوں سے ہیں۔“ ❷

نیز فرماتے ہیں: زهير أحب إلينا من إسرائيل في كل شيء إلا في حديث أبي إسحاق. وزهير متقن صاحب سنة غير أنه تأخر سماعه من أبي إسحاق

”زہیر ہمیں ہر چیز میں اسرائیل سے زیادہ اچھے ہیں، سوائے ابو اسحاق کی حدیث

---

❶ میزان الاعتدال، ج ۱، ص ۲۰۹

❷ الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم ۲/۳۳۰

اسرائیل کو ابواسحاق کی حدیث اس طرح یاد ہے، جس طرح آدمی قرآن مجید کی سورت یاد کرتا ہے۔" [1]

شبابہ بن سوار نے جب یونس بن ابی اسحاق سے ان کے والد (ابواسحاق) کی حدیث لکھوانے کا مطالبہ کیا تو انہوں نے فرمایا:

اكتبه عن إسرائيل، فإن أبي أملاه عليه.

"وہ (ابواسحاق کی حدیث میرے بیٹے) اسرائیل سے لکھ لو، کیونکہ میرے باپ (ابواسحاق) نے اسے لکھوائی تھی۔" [2]

⑨ امام ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وإسرائيل بن يونس بن أبي إسحاق السبيعي كثير الحديث، مستقيم الحديث في أبي إسحاق وغيره، وقد حدث عنه الأئمة، ولم يتخلف أحد في الرواية عنه.

"اسرائیل بن یونس بن ابی اسحاق کثیر الحدیث ہیں، ابواسحاق اور دوسرے شیوخ سے بیان کرنے میں مستقیم الحدیث ہیں، ان سے ائمہ کرام نے احادیث بیان کی ہیں، کسی نے بھی ان سے روایت کرنے سے احتراز نہیں کیا۔" [3]

نیز حدیث «لا نكاح إلا بولي» کے بارے میں لکھتے ہیں:

ومن الأئمة من لم يثبت في هذا الباب إلا حديث إسرائيل هذا لحفظه

---

1. السنن الكبرى للبيهقي ١٠٨/٧، وسنده صحيح
2. الجرح والتعديل لابن أبي حاتم ٣٣٠/٢
3. الكامل في ضعفاء الرجال لابن عدي ٤٥٢/١

لحدیث أبی إسحاق.

"یعنی ان امام اپنے بھی ہیں جنہوں نے اپنے سنن میں حدیث اسرائیل کی اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے کیونکہ اسرائیل ابو اسحاق کی حدیث (خوب) یاد رکھنے والے تھے۔" ❶

(۵) امام دارقطنی جو اسرائیل کی ابو اسحاق سے بیان کی گئی حدیث کو صحیح قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

واسرائیل من الحفاظ عن أبی إسحاق

"اسرائیل، ابو اسحاق سے بیان کرنے والے حفاظ (خوب یاد رکھنے والے لوگوں) میں سے تھے۔" ❷

نیز ایک اور حدیث جو ابو اسحاق کے واسطے سے ہے، کے بارے میں لکھتے ہیں:

ویشبه أن یکون قول إسرائیل محفوظا، لأنه من الحفاظ عن أبی إسحاق.

"(دوسرے راویوں، جن میں ابو اسحاق سے بالاتفاق قول اثبت الناس بیان کرنے والے سفیان ثوری بھی شامل ہیں، کے مقابلے میں) اسرائیل کا قول محفوظ معلوم ہوتا ہے، کیونکہ وہ ابو اسحاق سے احادیث کو (خوب) یاد رکھنے والے لوگوں میں سے تھے۔" ❸

(۶) امام حاکم بھی لکھتے ہیں:

فاتفق اسرائیل بن یونس بن أبی إسحاق الثقة الحجة فی حدیث جده أبی إسحاق.

---

❶ تکمیل لابن عدی: ۱/۴۰۲

❷ العلل للدارقطنی: ۲۰۱/۷

❸ العلل للدارقطنی: ۲۰۸/۳

"اسرائیل بن یونس بن ابی اسحاق اپنے دادا ابو اسحاق سے حدیث بیان کرنے میں ثقہ اور حجت ہیں۔" (1)

(11) عبیداللہ بن عمرو الرقی بیان کرتے ہیں کہ میں محمد بن سوقہ کو لے کر ابو اسحاق کے پاس آیا اور (ان کے پوتے) اسرائیل سے کہا، ہمارے لیے شیخ سے اجازت طلب کریں، انہوں نے کہا:

صلّٰی بنا الشیخ البارحة، فاختلط۔

"شیخ (ابو اسحاق) نے ہمارے ساتھ رات کو نماز پڑھی، پھر وہ اختلاط کا شکار ہو گئے ہیں۔"

(عبیداللہ بن عمرو کہتے ہیں) پھر ہم داخل ہوئے، سلام کہا اور نکل گئے۔ (2)

یہ اسرائیل کے ابو اسحاق سے قبل الاختلاط احادیث سننے کی روز روشن کی طرح عیاں دلیل ہے، کیونکہ ابو اسحاق کے اختلاط کے وقت اسرائیل کی اتنی عمر تھی کہ ان سے اجازت لے کر ان کے دادا ابو اسحاق سے ملتے تھے، نیز وہ اس وقت اختلاط و عدم اختلاط کی تمیز بھی کر رہے تھے۔

نیز عبیداللہ بن عمرو الرقی جو ابو اسحاق سے احادیث سننے آئے تھے، وہ اسرائیل سے ایک سال چھوٹے تھے، اسرائیل 100ھ میں پیدا ہوئے ہیں اور عبیداللہ بن عمرو 101ھ میں، لہٰذا اگر اس وقت عبیداللہ بن عمرو الرقی حدیث سننے کے قابل تھے تو اسرائیل کیوں نہیں تھے، جو کہ عبیداللہ بن عمرو الرقی سے عمر میں بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ ابو اسحاق کے پوتے بھی تھے!

معلوم ہوا کہ امام شعبہ رحمہ اللہ نے یہ جو فرمایا ہے کہ ابو اسحاق سے بیان کرنے میں اسرائیل مجھ سے زیادہ ثقہ ہے، اسی طرح امام ابو حاتم وغیرہ کا ابو اسحاق سے بیان کرنے میں اسرائیل کو سب سے "اثبت" قرار دینا بلا شک و شبہ صحیح اور حق ہے۔

---

(1) المستدرك على الصحيحين للحاكم: 2/184

(2) تاريخ أبي زرعة الدمشقي: 1/469، وسنده صحيح

پھر یہ بات بھی اسرائیل کے ابواسحاق سے کثیر الاختلاط سماع پر اپنی جگہ ایک مستقل دلیل ہے کہ بہت سے ائمہ، جن میں امام علی بن مدینی، محمد بن یحییٰ، ابن مہدی وغیرہ بھی شامل ہیں، نے اسرائیل کی اس حدیث کو "صحیح" قرار دیا ہے، جو وہ ابواسحاق سے بیان کر رہے ہیں۔ ❶

اسی طرح متاخرین ائمہ میں سے:

① حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

واكثر عن جده، وهو ثبت فيه.

"انہوں نے اپنے دادا (ابواسحاق) سے بہت زیادہ احادیث بیان کی ہیں، وہ ان سے بیان کرنے میں ثبت (ثقہ) ہیں۔" ❷

مزید کہتے ہیں:

سمع جده وجوّد حديثه واتقنه

"انہوں نے اپنے دادا سے سنا ہے، ان کی حدیث کو بہت عمدہ (بیان) کیا ہے اور پختہ بیان کیا ہے۔" ❸

پھر آپ حافظ شعبہ اور اسرائیل کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

نعم! شعبة أثبت منه الا في أبي اسحاق.

"ہاں! شعبہ ان سے زیادہ ثقہ ہیں، سوائے ابواسحاق سے بیان کرنے میں (اسرائیل زیادہ ثقہ ہیں)۔" ❹

---

❶ [illegible]

❷ تاريخ الإسلام للذهبي [illegible]

❸ تذكرة الحفاظ للذهبي [illegible]

❹ ميزان الاعتدال للذهبي [illegible]

مزید فرماتے ہیں:

هو ثقة ، نعم ! ليس هو في التثبت كسفيان وشعبة ، ولعله يقاربهما في حديث جده ، فإنه لازمه صباحا ومساء عشرة أعوام .

''وہ ثقہ ہیں، ہاں ! وہ ثقاہت میں شعبہ وسفیان (ثوری) کی طرح تو نہیں ہیں، البتہ اپنے دادا (ابواسحاق) سے حدیث بیان کرنے میں شاید وہ ان سے ملتے جلتے (قابل حجت) ہیں، کیونکہ وہ اپنے دادا کے ساتھ تقریباً دس سال صبح وشام لازم (شاگردی میں) رہے۔'' ❶

امام عبدالرحمن بن مہدی نے ابواسحاق سے بیان کرنے میں اسرائیل کو شعبہ وسفیان سے بھی فوقیت دی ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ ان کا قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وهذا أنا إليه أميل ...

''میں اسی موقف کی طرف مائل ہوں۔'' ❷

❀ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

سماع اسرائيل من أبي اسحاق في غاية الإتقان ، للزومه إياه ، لأنه جده ، وكان خصيصاً به ...

''اسرائیل کا (اپنے دادا) ابواسحاق سے سماع حد درجہ صحیح ہے، کیونکہ دادا ہونے کی وجہ سے انہوں نے ان کو لازم پکڑ رکھا تھا اور ان کے بہت خاص شاگرد تھے۔'' ❸

پھر امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے جو اسرائیل کی حدیث کو ابواسحاق سے متاخر قرار دیا ہے تو ان کا

---

❶ سیر اعلام النبلاء للذہبی: 7/358

❷ سیر اعلام النبلاء للذہبی: 7/359

❸ فتح الباری لابن حجر: 1/351

"صحت احادیث کا اہتمام کرنے کے علاوہ شیخین نے علمائے معاصرین اور بعد میں آنے والے منتقدین و محدثین کے لیے نہایت اچھی مثال پیش کر دی تھی اور تحقیق کی وہ راہ ہموار کی تھی جس پر چلنے سے سنت نبوی کی نقل و ترسیل سے حفاظت ہو سکتی تھی۔" ❶

اتنی سی تمہید کے بعد آپ امام بخاری رحمہ اللہ کے بعد آنے والے محدثین میں سے ایک محدث امام ابن حبان رحمہ اللہ کا اپنی کتاب "صحیح ابن حبان" کے بارے میں تبصرہ پڑھ لیں۔ وہ لکھتے ہیں:

وأما المختلطون في أواخر أعمارهم مثل الجريري وسعيد بن أبي عروبة وأشباههما، فإنا نروي عنهم في كتابنا هذا ونحتج بما رووا، إلا أنا لا نعتمد من حديثهم إلا ما روى عنهم الثقات من القدماء الذين نعلم أنهم سمعوا منهم قبل اختلاطهم، وما وافقوا الثقات في الروايات التي لا نشك في صحتها وثبوتها من جهة أخرى..

"رہے وہ راوی جو اپنی آخری عمروں میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے، مثلاً (سعید بن ایاس) جریری، سعید بن ابی عروبہ وغیرہ، تو ہم ان سے اپنی اس کتاب میں روایت بھی کریں گے اور ان سے حجت بھی پکڑیں گے، لیکن ہم ان کی صرف انہی احادیث پر اعتماد کریں گے جو ان سے ان کے ایسے قدیم ثقہ شاگردوں نے بیان کی ہیں، جن کے بارے میں ہمیں علم ہے کہ انھوں نے ان (مختلطین) سے ان کے اختلاط سے پہلے سنی ہیں، اور (اسی طرح) وہ روایت جس میں (قبل الاختلاط سننے والے شاگرد تو بیان نہیں کرتے، لیکن) ان مختلطین نے ان روایات میں ثقہ راویوں کی موافقت کی ہے اور جن کی صحت اور دوسری سند سے ثبوت میں ہمیں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔" ❷

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" 1/15

❷ صحیح ابن حبان: 1/161

جب امام بخاری رحمہ اللہ کی بتائی ہوئی راہ پر چل کر بعد میں آنے والے محدثین اختلاط کا شکار ہونے والے راویوں کی روایات کے بارے میں اتنی زبردست احتیاط سے کام لے رہے ہیں تو خود امام بخاری رحمہ اللہ کی احتیاط کا عالم بھلا کیا ہوگا؟ کیا انہوں نے اختلاط کا شکار ہونے والے راویوں کی روایات بلا پرکھے اپنی کتاب میں پیش کر دی ہوں گی؟ قطعاً نہیں، بلکہ علامہ سخاوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وما يقع في الصحيحين أو أحدهما من التخريج لمن وصف بالاختلاط من طريق من لم يسمع منه إلا بعده، فإنا نعرف على الجملة أن ذلك مما ثبت عند المخرج أنه من قديم حديثه، وإن لم يكن من سمع منه قبل الاختلاط على شرطه....

"اور صحیحین یا ان میں سے کسی ایک میں اختلاط کا شکار ہونے والے راویوں کی ایسی روایات جنہیں ان کے وہ شاگرد بیان کرتے ہیں جنہوں نے اپنے شیوخ سے صرف اختلاط کے بعد ہی سنا ہے، تو ہم ان سب کے بارے میں یہ جانتے ہیں کہ مصنف کے نزدیک یہ بات ثابت ہے کہ یہ حدیث اس کی پرانی (اختلاط کا شکار ہونے سے پہلے کی) احادیث میں سے ہے، اگرچہ جس راوی نے اس سے اختلاط سے پہلے سنا تھا وہ ان امام (بخاری و مسلم) کی شرط پر نہیں تھا۔" ❶

یعنی ایک حدیث بخاری و مسلم میں اگر اختلاط کے بعد سننے والا شاگرد بیان کر رہا ہے تو امام بخاری و مسلم کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ حدیث مختلط سے پہلے سننے والے شاگرد بھی بیان کرتے ہیں، لیکن انہوں نے ان کی روایت کو اپنی کتاب میں اس لیے جگہ نہیں دی کہ وہ (ثقاہت میں) ان کی

---

❶ فتح المغيث للسخاوي: ٣٦٦/٣

[illegible] تھے۔

نیز حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

واخرج عمن سمع منه بعد الاختلاط قليلاً كمحمد بن عبدالله الانصاري وروح بن عبادة وابن أبي عدي، فاذا اخرج من حديث هؤلاء انتقى منه ما توافقوا عليه ...

"امام بخاری نے ان (سعید بن ابی عروبہ) سے اختلاط کے بعد حدیث سننے والے راویوں، مثلاً محمد بن عبداللہ انصاری، روح بن عبادہ اور ابن ابی عدی سے بہت کم روایات لی ہیں، جب امام صاحب ایسے (اختلاط کے بعد سننے والے) راویوں سے روایت ذکر کرتے ہیں تو (ان کی دوسری روایات میں سے) چھانٹ کر وہ روایت لیتے ہیں، جس پر دوسرے ثقہ راویوں نے ان کی موافقت کی ہوتی ہے۔" [1]

محدثین کرام کی صراحت کی روشنی میں معلوم ہوا کہ اگر بالفرض صحیح بخاری کی روایت صرف اختلاط کے بعد بیان کرنے والے راویوں سے ہو تو بھی اس سے ضعف لازم نہیں آتا، بلکہ وہ بھی دوسرے ثقہ راویوں کی موافقت اور متابعت حاصل کرنے کی وجہ سے "صحیح" ہوتی ہے، اس لیے کہ راوی کے اختلاط کی وجہ سے ہمیں اس روایت میں یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید اس نے بیان میں غلطی کی ہو، مگر جب ثقہ راوی اس کی موافقت کر دیں تو وہ شبہ بالکل کافور ہو جاتا ہے۔

یہ ساری بحث اس صورت میں ہے کہ صحیح بخاری کے راوی نے وہ حدیث اپنے استاد کے حافظے کی خرابی کے بعد سنی ہو، لیکن اگر صحیح بخاری کے راوی نے اختلاط سے پہلے وہ روایت اپنے شیخ سے سنی ہو تو پھر اس کی غلطی پر کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا، وہ صحیح ہو گی، جیسے کہ امام محدثین

[1] مقدمہ فتح الباری لابن حجر، صفحہ [illegible]

کر امام کے ایک جمِ غفیر سے تفصیلاً یہ بات ثابت کر چکے ہیں کہ اسرائیل بن یونس رحمہ اللہ نے اپنے دادا ابواسحاق السبیعی رحمہ اللہ سے ان کے اختلاط سے پہلے احادیث سُنی تھیں۔

پھر اگر تھوڑی دیر کے لیے برقی صاحب کی یہ بات بھی تسلیم کر لی جائے کہ

''اسرائیل نے ان سے ہوش سنبھالنے کے زمانہ میں بھی جو حدیثیں سنی تھیں اور تغیر و اختلاط کے زمانہ میں بھی۔۔۔''

اور خود ان کے بقول امام بخاری چونکہ تغیر سے منکر روایتوں کو چھانٹ کر موتی نکالنے والے اور تحقیق کی وہ راہ دکھانے والے شخص ہوں، جس پر چلنے سے حدیث نبوی کی نقل و نقش سے حفاظت ہو سکتی ہو، اور پھر ان کی دکھائی ہوئی اس راہ پر چل کر ''صحیح'' کے نام سے کتابیں لکھنے والے بعد کے محدثین بھی ان چیزوں کا حد درجہ اہتمام کریں، لیکن خود امام بخاری رحمہ اللہ کو اتنا بھی پتا نہ ہو کہ یہ حدیث اسرائیل نے اختلاط سے پہلے اپنے دادا سے سنی ہے اور یا اختلاط کے بعد؟ ایسا فیصلہ کوئی انکارِ حدیث کے خبط میں مبتلا عقل ہی کر سکتی ہے، کوئی عقل مند آدمی ایسا نہیں کہہ سکتا۔

جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ اسرائیل کی حدیث بالکل ''صحیح'' ہے تو دیگر راویوں، جنہوں نے ابواسحاق السبیعی رحمہ اللہ سے اختلاط کے بعد سنا ہے، مثلاً زہیر بن معاویہ [1] اور ابوالاحوص [2] وغیرہما کی حدیث ان کی موافقت کی وجہ سے بلاشبہ ''صحیح'' ہو گی۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

وسماع زهير منه فيما قال أحمد بعد أن بدا تغيره، لكن تابعه عليه عند المصنف إسرائيل بن يونس حفيده وغيره...

---

[1] صحیح بخاری: ٤٠　　[2] صحیح مسلم: ٥٢٥

”اور زہیر کو سماع ان (ابو اسحاق السبیعی رحمہ اللہ) سے امام احمد رحمہ اللہ کے بقول ان کے حافظہ کی خرابی کے ظاہر ہونے کے بعد ہے، لیکن مصنف (امام بخاری رحمہ اللہ) کے ہاں (صحیح بخاری میں) ہی اس کی متابعت ان کے پوتے اسرائیل بن یونس وغیرہ نے کر دی ہے، لہٰذا یہ تنازع والا ڈیبیٹ دفع ہو گیا ہے۔“ 1

اگرچہ زہیر ابو الاحوص وغیرہ کو سماع ابو اسحاق سے بعد از اختلاط ہے لیکن قبل از اختلاط سماع والے راوی اسرائیل بن یونس نے ان کی متابعت کی ہے لہٰذا ان کی حدیث اصولِ حدیث کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے۔ یوں خود میرٹھی صاحب کی تسلیم کردہ بات سے ہی ثابت ہو گیا ہے کہ ان کا اعتراض علم حدیث سے ان کی ناواقفیت کا کرشمہ ہے اور صحیح بخاری کی یہ حدیث بالکل بے غبار ہے۔ والحمد للہ!

ثابت بن اسلم البنانی کی طرف سے ابو اسحاق کی متابعت

③ رسول اللہ ﷺ کے مدینہ میں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں ادا کرنے والا واقعہ اگر صرف ابو اسحاق ہی صحابی رسول سے بیان کر رہے ہوتے تو شاید میرٹھی صاحب کی بات کچھ قابل غور ہوتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ تابعین میں سے ثابت بن اسلم البنانی جو کہ ثقہ امام ہیں، نے بھی یہی واقعہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے۔ صحابی رسول سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

أنّ رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کان یصلّی نحو بیت المقدس، فنزلت: ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (البقرۃ: ١٤٤)، فمرّ رجل من بني سلمة،

---

1 فتح الباری لابن حجر: ١/٩٦

وهم ركوع في صلاة الفجر، وقد صلوا ركعة، فنادى: الا إن القبلة قد حولت. فمالوا كما هم نحو القبلة.

"بلاشبہ اللہ کے رسول ﷺ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے، پھر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۖ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۚ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (البقرۃ: ۱۴۴) (تحقیق ہم آسمان کی طرف آپ کے چہرے کا بار بار پھرنا دیکھ رہے ہیں، لہٰذا ہم ضرور آپ کو اسی قبلے کی طرف پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں، سو اپنے چہرے کو مسجد حرام کی طرف پھیر دیں)۔ پھر بنو سلمہ میں سے ایک آدمی گزرا، وہ (صحابہ کرام) صبح کی نماز کے رکوع میں تھے، ایک رکعت پڑھ چکے تھے، اس صحابی نے پکار کر آگاہ کیا: خبردار! یقیناً قبلہ بدل دیا گیا ہے، وہ لوگ اسی طرح (نماز کی حالت میں) قبلے کی جانب مائل ہو گئے۔" ❶

اب بھی سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ابو اسحاق اسبیعی رحمہ اللہ کے اختلاط کو ڈھونڈو رانا چنے پھرنا تعصب اور ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں، کیونکہ ثابت بن اسلم البنانی نے بھی سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے یہی بیان کیا ہے کہ تحویل قبلہ کے حکم سے پہلے خود رسول اللہ ﷺ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھتے رہے ہیں۔

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی اس واقعے کے وقت تو عمری!

"حضرت براء بن عازب کی اس حدیث کے متعلق جو تحقیقی مباحث ناظرین کے سامنے رکھے گئے ہیں، ان کے ساتھ یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ حضور اکرم کی مدینہ تشریف آوری کے وقت براء بن عازب نابالغ اور تقریباً نو سالہ بچے تھے۔ اکابر صحابہ میں

---

❶ صحیح مسلم: ۵۲۷.

سے کسی سے بھی حدیث مروی نہیں ہے۔''❶

تبصرہ: ① میرٹھی صاحب کی کی بے ہودہ باتوں سے مرکب ایک ''تحقیق'' بحث تو آپ نے ملاحظہ کر لی ہے، جس میں ''اہلِ علم کے اتفاق'' کا نام لے کر کئی بے اصل دعاوی کیے گئے ہیں، جب کہ حقیقت بالکل برعکس ہے۔ نہ جانے میرٹھی صاحب نے اس سے اسلام کی کونسی خدمت کی توقع کی ہے؟ باقی ''تحقیق'' مباحث کی تحقیق بھی ایک ایک کر کے آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔

سماعِ حدیث کے لیے عمر کی کم از کم حد

② اصولِ حدیث سے تو میرٹھی صاحب اتنے نابلد ہیں کہ اس بارے میں ان کو ''جاہلِ مطلق'' قرار دینا بے جا نہ ہوگا۔ ان کے معتقدین سے ہمارا سوال ہے کہ کیا کسی راوی کا نو سال کی عمر میں حدیث سننا اور جوان ہونے کے بعد بیان کرنا اس روایت کے لیے موجبِ ضعف ہے، خصوصاً جب کہ وہ صحابی ہو؟

حافظ ابن الصلاح (۵۷۷_۶۴۳ھ) رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فتقبل رواية من تحمل قبل الإسلام وروى بعده، وكذلك رواية من سمع قبل البلوغ وروى بعده، ومنع من ذلك قوم فأخطأوا، لأن الناس قبلوا رواية أحداث الصحابة كالحسن بن عليّ وابن عباس وابن الزبير والنعمان بن بشير وأشباههم من غير فرق بين ما تحملوا قبل البلوغ وما بعده، ولم يزالوا قديما وحديثا يحضرون الصبيان مجالس التحديث والسماع ويعتدون بروايتهم لذلك.

---

❶ ''صحیح بخاری کا مطالعہ'' ۱/۱۰۲

"جو شخص اسلام لانے سے قبل روایت سنے اور اسلام لانے کے بعد بیان کرے اس کی روایت قبول کی جائے گی، اسی طرح اس کی روایت بھی قبول کی جائے گی، جس نے بلوغت سے قبل روایت سنی ہو اور بالغ ہونے کے بعد اسے بیان کرے، کچھ لوگوں نے اس سے منع کیا ہے لیکن انہوں نے غلطی کی ہے، کیونکہ (دور سلف کے تمام) لوگوں نے کم سن صحابہ، مثلاً حسن بن علی، ابن عباس، ابن زبیر، نعمان بن بشیر اور ان جیسے دوسرے صحابہ ﷺ کی احادیث کو بے فرق کے بغیر قبول کیا ہے کہ انہوں نے وہ بلوغت سے پہلے سنی ہیں یا بعد میں۔ پھر قدیم و جدید دور میں محدثین بچوں کو حدیث سننے، سنانے کی مجالس میں حاضر کرتے رہے ہیں اور ان کی روایات کو اہمیت دیتے رہے ہیں۔"❶

علامہ سخاوی رحمہ اللہ (م ۹۰۲ھ) لکھتے ہیں:

وردّ على القائلين بعدم قبول الصبيّ باجماع الأئمة على قبول حديث جماعة، ومن صغار الصحابة مما تحملوه في حال الصّغر كالسبطين، وهما الحسن والحسين ابنا ابنته صلّى الله عليه وسلّم فاطمة الزهراء، والعبادلة ابن جعفر بن أبي طالب وابن الزبير وابن عباس والنعمان بن بشير والسائب بن يزيد والمسور بن مخرمة وأنس ومسلمة بن مخلد وعمر بن أبي سلمة ويوسف بن عبدالله بن سلام وأبي الطفيل وعائشة ونحوهم رضي الله عنهم من غير فرق بين ما تحملوه قبل البلوغ وبعده مع احضار أهل العلم خلفا وسلفا من المحدثين وغيرهم للصّبيان مجالس العلم، ثمّ قبولهم أي العلماء أيضا من الصّبيان ما حدّثوا به من ذلك بعد الحلم أي

❶ مقدمة ابن الصلاح، ص ۷۳

البلــــوغ ...

"انہوں نے (الغایۃ الحدیث کے مصنف نے) بچے کی (بچپن میں سنی ہوئی اور بالغ ہونے کے بعد بیان کی گئی) حدیث قبول نہ کرنے والوں کا رد اس طرح کیا ہے کہ ایسے بہت سے راویوں سے روایت لینے پر امت کا اجماع ہے، صحابہ کرام میں سے ہی بہت سے صحابہ ایسے ہیں، جنہوں نے بچپن میں (رسول کریم ﷺ سے) احادیث سنیں، جیسا کہ سیدنا حسن و حسین ہیں جو کہ آپ ﷺ کی بیٹی فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کے صاحبزادے ہیں، نیز عبداللہ بن جعفر، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عباس، نعمان بن بشیر، سائب بن یزید، مسور بن مخرمہ، انس بن مالک، مسلمہ بن مخلد، عمر بن ابی سلمہ، یوسف بن عبداللہ بن سلام، ابو الطفیل، سیدہ عائشہ وغیرہم رضی اللہ عنہم ہیں، امت نے ان کی احادیث کو مطلق طور پر قبول کیا ہے، بغیر یہ فرق کیے کہ انہوں نے بلوغت سے پہلے وہ حدیثیں سنی ہیں یا بعد میں۔ مزید برآں سلف و خلف محدثین و دیگر علمائے کرام علم کی مجالس میں بچوں کو بٹھاتے رہے ہیں، پھر ان بچوں نے بالغ ہونے کے بعد جب ان حدیثوں کو بیان کیا تو محدثین نے ان کو قبول بھی کیا۔۔۔" [1]

صحابہ و تابعین اور محدثین کا تو کسی راوی کی پانچ سال کی عمر میں سنی ہوئی حدیث کو قبول کرنے پر بھی اجماع ہے۔ صحیح بخاری ہی مکمل پڑھ لیتے تو شاید میرٹھی صاحب یہ اعتراض نہ کرتے، امام صاحب نے ان الفاظ میں باب قائم کیا ہے:

متی یصح سماع الصبی "بچے کا حدیث کو سماع کرنا کب درست ہے؟"

پھر صحابی رسول سیدنا محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ کی حدیث پیش کی ہے وہ بیان کرتے ہیں:

عقلت من النبی صلی اللہ علیہ وسلم مجۃ مجہا فی وجہی، وانا ابن

---

[1] فتح المغیث للسخاوی: ۲/۷

خمس سنين، من دلو...

"مجھے نبی کریم ﷺ کا ڈول سے پانی لے کر اپنے منہ مبارک سے میرے چہرے پر ڈالنا یاد ہے حالانکہ میں اس وقت پانچ سال کا تھا۔" [1]

❁ اصول حدیث پر پہلے پہل مستقل تصنیف کرنے والوں میں سے ایک معروف محدث قاضی عیاض بن موسیٰ الیحصبی رحمہ اللہ (م ۴۷۶ھ-۵۴۴ھ) لکھتے ہیں:

إنما صحة سماعه فمتى ضبط ما سمعه صح سماعه، ولا خلاف في هذا. وقد حدد أهل الصنعة في ذلك أن أقله سن محمود بن الربيع..

"یعنی اس (بچے) کے سماع کا صحیح ہونا تو جب وہ اپنی سنی ہوئی بات کو محفوظ کر لے گا تو اس کا سماع حدیث صحیح ہوگا، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ محدثین نے سماع کی کم از کم عمر کی تحدید میں سیدنا محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ کی عمر کو کسوٹی بنایا ہے۔" [2]

حافظ ابن الصلاح، ابن دقیق العید، خطیب بغدادی، ابن کثیر، ابن حجر وغیرہم رحمہم اللہ جیسے سب علمائے حدیث بھی اپنی کتابوں میں یہی بات ذکر کرتے اور اس کی تائید کرتے چلے آئے ہیں، پھر صحیح بخاری کی صحت پر امت کا اجماع ہی خود ایک مستقل دلیل ہے۔

معلوم ہوا کہ حدیث کی صحت کے لیے یہ قطعاً ضروری نہیں ہے کہ وہ صحابی نے بالغ ہونے کے بعد سنی ہو۔ یہ محدثین کا اجماعی و اتفاقی فیصلہ ہے، جس کی مخالفت کوئی اصول حدیث سے جاہل آدمی ہی کر سکتا ہے۔

اب قارئین کرام ہی بتائیں کہ میرٹھی صاحب اصول حدیث سے ناواقف ہیں یا نہیں؟

---

1. صحیح بخاری: ۷۷، صحیح مسلم: ۳۳
2. الإلماع إلى معرفة أصول الرواية وتقييد السماع، ص: ۶۲

مسلمانو!

اللہ کے لیے انصاف کریں! کیا اب بھی آپ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی کہ صحیح بخاری پر یہ اعتراضات کسی تحقیق کا نتیجہ نہیں، بلکہ وحی الٰہی کی صورت میں قرآن کی تشریح و توضیح کے انکار کا دروازہ کھولا جا رہا ہے۔ کیونکہ صحابی کے کم عمر ہونے کا اعتراض کسی ایک حدیث کی "تحقیق و تنقید" نہیں، بلکہ کم سنی کی حالت میں رسول اللہ ﷺ سے احادیث سننے والے بیسیوں صحابہ کرام کی ہزاروں صحیح احادیث کے انکار کی خفیہ سازش ہے۔ کیا اس کے بعد اسلام کی صحیح شکل بصورت باقی رہے گی؟ اور کیا اس طرح کی روش اختیار کرنے والے لوگ اسلام سے مخلص ہو سکتے ہیں؟ فیصلہ آپ پر ہے!

معزز قارئین! جب سند کے اعتبار سے صحیح بخاری کی تحویل قبلہ والی حدیث بالکل "صحیح" ہے تو اس پر عقلی اعتراضات کی کوئی علمی حیثیت نہیں، اس طرح کے اعتراضات تو منکرین قرآن، قرآن کریم پر بھی کرتے آئے ہیں، ان کا جواب دینے کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں، البتہ اس سے منکرین حدیث کی اپنی عقلی کیفیت ضرور ظاہر ہو گی، لہٰذا ہم ایک ایک کا جواب عرض کرتے ہیں۔

فصلِ ثانی: تحویل قبلہ پر عقلی اعتراضات کا جائزہ

پچھلے صفحات میں ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ سند کے اعتبار سے تحویل قبلہ والی حدیث براء بن عازب بالکل صحیح ہے اور اس کی سند پر کیے گئے "میرٹھی اعتراضات" محض کم علمی اور تعصب کی پیداوار ہیں، اب ہم میرٹھی صاحب کی طرف سے اس حدیث کے متن پر کیے گئے بے تکی یعنی "عقلی اعتراضات" کا جائزہ لیتے ہیں:

روایات کا تعارض!

"زہیر و اسرائیل کی روایت میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ۱۶ یا ۱۷ ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھنے کے بعد جو سب سے پہلی نماز کعبہ کی طرف رخ کر کے پڑھی ہے، وہ نماز عصر تھی، جو آپ نے اپنی مسجد میں ادا فرمائی تھی۔
اس کے معنی یہ ہیں کہ تحویل قبلہ کا حکم اس نماز عصر سے پہلے ہوا تھا، لیکن ابو الاحوص کی روایت میں، جو صحیح مسلم میں ہے، یہ تصریح ہے کہ یہ حکم اس نماز کے بعد ہوا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سب سے پہلی نماز جو آپ نے کعبہ کی طرف رخ کر کے ادا فرمائی تھی، وہ نماز مغرب تھی۔ تینوں راوی ثقہ ہیں اور کوئی دلیل ایسی نہیں ہے کہ جس کی بنا پر ہم زہیر و اسرائیل کی بیان کردہ بات کو یا ابو الاحوص کی بیان کردہ بات کو ترجیح دیں، یہ غلط ہوا تعارض خود ابو اسحاق کی طرف سے ہے، ابو اسحاق نے زہیر و اسرائیل سے جو بیان کیا تھا، ابو الاحوص سے اس کے خلاف بیان کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی جانے کہ براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے فی الواقع کیا بیان کیا تھا؟ ابو اسحاق کو ان کی بتائی ہوئی بات صحیح طور پر یاد نہ تھی۔۔۔" ❶

جواب: ① صحیح مسلم کی جس صحیح حدیث کی وجہ سے میرٹھی صاحب نے صحیح بخاری کی ایک صحیح حدیث پر ایک غلط اعتراض کرنے کی کوشش کی ہے، آپ اس کے الفاظ بھی ملاحظہ کریں اور ان کا "میرٹھی ترجمہ" بھی، پھر فیصلہ کریں کہ انہوں نے حق و سچ، عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑا ہے یا نہیں؟ صحیح مسلم کے اصل الفاظ جو میرٹھی صاحب نے اپنی کتاب میں درج کیے ہیں، یہ ہیں:

عن أبي إسحاق عن البراء بن عازب، قال: صليت مع النبي صلى الله

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" [illegible]

علیہ وسلم الی بیت المقدس ستۃ عشر شہرا ، حتی نزلت الآیۃ التی فی سورۃ البقرۃ .... فنزلت بعد ما صلی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ....

اس کا ترجمہ مفتی صاحب نے یوں کیا ہے:

"ابو اسحاق نے براء بن عازب سے روایت کی ہے، براء نے کہا کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے ۱۶ ماہ نماز ادا کی ہے، یہاں تک کہ سورۃ البقرہ کی آیت نازل ہوئی، جس میں ہر حیثیت خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم ہے۔ یہ آیت آپ پر نمازِ عصر کے بعد اتری، یعنی نمازِ عصر تو آپ نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے اسی کی سمت ہی پڑھی تھی، اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی..."

یہ ترجمہ حدیثِ نبوی کی مراد کے بالکل خلاف ہے، اس حدیث میں صرف یہ بیان ہے کہ تحویلِ قبلہ والی آیات نبی ﷺ کے نماز پڑھ لینے کے بعد نازل ہوئیں، اس کا ترجمہ کرتے ہوئے محض انکارِ حدیث کا جواز بنانے کے لیے "عصر" کا لفظ اپنی طرف سے چڑھا دینا میرٹھی صاحب کی "دیانتِ علمی" کی ایک جھلک ہے!

جب دوسری احادیث سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ آیات عصر کی نماز سے پہلے نازل ہوئی تھیں تو اس حدیث میں جس نماز کے بعد نازل ہونے کا تذکرہ ہے، وہ یقیناً ظہر کی نماز ہے، اگر ایک کام کے بارے میں یہ مرتبہ کہا جائے کہ وہ عصر سے پہلے ہوا ہے اور دوسری مرتبہ کہہ دیا جائے کہ وہ ظہر کے بعد ہوا ہے تو کیا اس پر اعتراض کرنا عقل مندی ہے؟

(۲) مسلمان اتفاقی طور پر حدیثِ رسول کو کوئی وقعت نہیں سمجھتے تھے، یہ بھی ممکن ہے کہ نمازِ عصر سے پہلے وحی آئی تھی لیکن حدیث کے ذریعے آپ نے تحویلِ قبلہ کی ہدایت دی گئی ہو اور اس وحی پر عمل کر کے آپ نے عصر کی نماز کعبہ کی طرف پڑھی ہو، پھر نماز کے بعد یہ وحی جلی یعنی قرآن کریم کی آیت بھی نازل کر دی گئی ہو!

④ اگر کسی سچے طالبِ علم کو قرآنِ کریم میں "ایسا کھلا ہوا تعارض" محسوس ہو تو کیا میرٹھی صاحب اور ان کے ہم نواؤں کے ہاں اس کی یہ بے عقلی معتبر ہوگی؟ مثلاً اگر وہ کہہ دے کہ:

"سورۂ بقرہ میں بیان ہے کہ زمین کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کی طرف قصد کیا اور سات آسمان بنائے، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ ❶

"وہی ذات ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے، تمہارے لیے پیدا کیا، پھر آسمانوں کی طرف قصد کیا تو ان کو سات آسمان بنایا۔"

جبکہ یہی بات سورۃ النازعات میں اس کے الٹ بیان ہوئی ہے، وہاں ہے:

﴿أَأَنتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ ۚ بَنَاهَا ۝ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوَّاهَا ۝ وَأَغْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ ضُحَاهَا ۝ وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَٰلِكَ دَحَاهَا ۝﴾ ❷

"کیا تم (دوبارہ) پیدا کیے جانے کے اعتبار سے زیادہ سخت ہو یا آسمان؟ اس (اللہ) نے اسے بنایا، اس نے اس کی چھت بلند کی، پھر اس کو درست کیا، اس کی رات کو تاریک کیا اور اس کے دن کو ظاہر کیا اور اس کے بعد زمین کو پھیلایا۔"

یہاں بتایا جا رہا ہے کہ آسمان کو پہلے اور زمین کو بعد میں پیدا کیا گیا ہے۔۔۔ اللہ تعالیٰ ہی جانے کہ اس نے فی الواقع کیا فرمایا تھا؟ (معاذ اللہ) مسلمان اس کی نازل کی ہوئی بات کو صحیح طور پر یاد نہیں رکھ سکے۔۔۔" ❸

---

❶ البقرۃ: ۲۹

❷ النازعات: ۲۷-۳۰　　❸ [illegible]

تو میرٹھی صاحب کے معتقدین کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا؟ جو جواب وہ قرآن کریم کی آیت کے بارے میں دیں گے، وہی ہم ان کو احادیث نبویہ کے بارے میں دے دیں گے۔

زہیر کی روایت کی "نا معقولیت"!

"زہیر کی روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے تو یہود کو یہ بات بڑی اچھی لگتی تھی، کیونکہ ان کا قبلہ بھی بیت المقدس ہی تھا مگر جب آپ نے بحکم حق خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا تو انہیں برا لگا اور لگے اس پر اعتراض کرنے۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ نامعقول بات حضرت براء نے بیان نہ کی ہوگی، اس لیے کہ یہود من حیث القوم اول روز سے ہی رسول اللہ ﷺ کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ مدینہ منورہ آپ کے تشریف لانے پر انہوں نے طے کر لیا تھا کہ ہمیں اس شخص کی کوئی بات نہیں ماننی ہے۔ آپ سے بغض و کینہ رکھنے میں قوم یہود نے کفار مکہ کو بھی مات کر دیا تھا۔ اگر رسول اللہ ﷺ نے مدینہ آنے کے بعد ڈیڑھ سال تک بیت المقدس کو قبلہ بنائے رکھا ہوتا تو وہ آپ کے اس عمل کو مزید طعن و تشنیع کا ہدف بنالیتے اور لوگوں سے کہتے کہ ہماری نقالی کے سوا ان صاحب کے پاس ہے ہی کیا؟" [1]

ازالہ: واقعی یہود شروع سے ہی مسلمانوں کے دشمن تھے اور ان سے کبھی خوش نہیں ہوئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ منکرین حدیث کو عقل دے کہ اس حدیث میں ان کی جس خوشی کا ذکر ہے، اس سے مراد ان کا مسلمانوں سے خوش ہونا نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کے خلاف طعن و تشنیع کرنے کا یہ موقع ملنے کی وجہ سے آپس میں وہ خوش ہوئے تھے اور یہی وجہ تھی

---

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/ ۱۰۲

کہ آپ ﷺ قبلہ کی تبدیلی کے سخت خواہش مند تھے، پھر جب قبلہ تبدیل ہو گیا تو یہودیوں کے ہاتھ سے یہ موقع نکل گیا اور مسلمانوں کا اس اعتراض سے حق ہو نا ان کی پسند آیا، جب وہ اس تبدیلی پر اعتراض کرنے لگ گئے۔

اتنی سی بات میرٹھی صاحب کی سمجھ میں نہیں آ سکی اور وہ شروع ہو گئے ہیں امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری پر اعتراض کرنے۔ کس سے بھلا صحیح بخاری کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے؟

② جب کسی کے ذہن میں انتشار ہو جائے تو وہ اس طرح کے سینکڑوں بے وقوفانہ اعتراضات قرآن کریم پر بھی کر سکتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ:

”جب تک مسلمان اپنے دین پر قائم ہیں، یہود و نصاریٰ ان کے دوست نہیں ہو سکتے، یہ دونوں قومیں شروع سے ہی اسلام کی سخت دشمن ہیں، یعنی اسلام دشمنی میں دونوں متحد ہیں، جیسا کہ قرآن نے بھی بیان کیا ہے:

﴿ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ﴾ ❶

(یہود و نصاریٰ آپ سے راضی نہیں ہو سکتے، یہاں تک کہ آپ ان کے دین کی پیروی کریں) لیکن اس کے برعکس سورۂ مائدہ میں ہے:

﴿ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ ﴾ ❷

(آپ مومنوں کے ساتھ سب سے بڑھ کر محبت کرنے والے ان لوگوں کو پائیں گے، جنہوں نے کہا ہم نصاریٰ ہیں، اس لیے کہ ان میں پڑھے لکھے اور راہب لوگ موجود ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے) یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دشمن ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں سے محبت

---

❶ البقرۃ: ۱۲۰ ❷ المائدۃ: ۸۲

رکھتے ہوں؟۔۔۔۔''

تو کیا اس اعتراض کی وجہ سے قرآن کریم کی صحت پر شک کیا جائے گا یا اس کی صحت کا دعویٰ باطل ہو جائے گا؟ جو جواب قرآن کے بارے میں ہوگا، وہی صحیح بخاری کی اس حدیث کے بارے میں ہو جائے گا!

جنگ بدر سے پہلے کسی مسلمان کے قتل نہ ہونے کا دعویٰ!

''زیر بحث روایت میں حضرت براء بن عازب کا یہ قول مذکور ہے کہ ۱۶ یا ۱۷ ماہ کی اس مدت میں جبکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کا قبلہ بیت المقدس تھا، متعدد مسلمان وفات پا گئے تھے اور متعدد مسلمان قتل ہو گئے تھے، پھر جب بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ قبلہ قرار پایا تو ہمیں ان قتل ہو جانے اور مر جانے والے مسلمانوں کے متعلق فکر و تردد ہوا کہ ان کے بارے میں کیا کہیں۔ اسی فکر و تردد کو دور کرنے کی غرض سے ارشاد ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (البقرہ: ۱۴۳) نازل ہوا جس کے متعلق میں دو باتیں عرض کرتا ہوں۔ اول یہ کہ تحویل قبلہ غزوۂ بدر سے قبل کا واقعہ بتایا جاتا ہے اور جنگ بدر سے پہلے مدینہ میں کوئی مسلمان قتل ہوا تھا نہ مدینہ سے باہر کسی علاقہ میں، پھر حضرت براء بن عازب یہ غلط اور خلاف واقعہ بات کیسے بیان کر سکتے تھے؟ دوم یہ کہ۔۔۔۔'' ❶

جواب ① میرٹھی صاحب جیسے تاریخ و حدیث سے ناواقف انسان کی طرف سے یہ دعویٰ بڑا مضحکہ خیز ہے کہ جنگ بدر سے پہلے نہ مدینہ میں کوئی مسلمان قتل ہوا تھا نہ مدینہ سے باہر کسی علاقہ میں۔ نہ جانے سوا چودہ سو سال کے بعد کون سا ''کشف'' ہوا کہ میرٹھی

❶ ''صحیح بخاری کا مطالعہ'' ۱/۱۴۲

صاحب نے دیکھا ہے کہ اس عرصہ میں کہیں بھی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔ اگر وہ کسی عظیم مؤرخ کا قول نقل کرتے تو شاید اس پر غور کیا جاتا۔ ان کی اپنی تاریخ دانی کا ایک "شاہکار" آپ کو غزوہ بنی المصطلق کے تذکرے کے تحت ہم کرا چکے ہیں۔ جہاں انہوں نے بے محل دعویٰ کیا تھا کہ تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ غزوہ بنی المصطلق غزوہ احزاب کے بعد ہوا ہے، حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔

جس شخص کی یہ حالت ہو اسے ایسا بلند بانگ دعویٰ تحقیق زیب نہیں دیتا، خصوصاً جب محدثین و مؤرخین اس کے خلاف بھی ہوں۔

عدم ذکر عدم وجود کو مستلزم نہیں

چنانچہ حافظ ابن حجر خود لکھتے ہیں: لکن لا یلزم من عدم الذکر عدم الوقوع۔

"(اس دور میں کسی مسلمان کے قتل ہونے کے) ذکر نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ (ایسا کوئی واقعہ) رونما ہی نہیں ہوا۔" ❶

بلکہ برقی صاحب کے دعویٰ کے بالکل برعکس وہ تو فرماتے ہیں:

فیحمل علی أن بعض المسلمین ممن لم یشتہر قتل فی تلک المدۃ فی غیر الجہاد، ولم یضبط اسمہ لقلۃ الاعتناء بالتاریخ اذ ذاک۔

"(اس حدیث میں تحویل قبلہ سے قبل مسلمانوں کے قتل ہونے کا ذکر) اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ کچھ مسلمان جو کہ مشہور نہ ہوئے تھے اس عرصے میں جہاد کے علاوہ کسی اور لڑائی میں قتل کر دیئے گئے تھے، لیکن اس وقت تاریخ کا زیادہ اہتمام نہ ہونے کی وجہ سے ان کا نام ضبط نہیں کیا جا سکا۔" ❷

---

❶ فتح الباری لابن حجر ۹۸/۱ ❷ فتح الباری لابن حجر: ۹۸/۱

(۲) اس بات میں تو کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ مکہ مکرمہ میں کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید کیے گئے تھے اور قبلہ مدینہ میں جا کر تبدیل ہوا تھا، جب قبلہ تبدیل ہوا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ہمارے جو مسلمان بھائی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھتے رہے ہیں اور اسی پر ان کی وفات ہوئی تھی، شاید ان کی نمازیں قبول نہ ہوں گی؟

کیا اب بھی میر جی صاحب کے معتقدین کو اس بات میں شک ہے کہ تحویلِ قبلہ سے پہلے کوئی مسلمان قتل ہوا تھا؟

پہلے فوت ہونے والوں کے بارے میں صحابہ کی فکرمندی!

"دوسری اطاعت موجودہ حکم کی ہی کی جا سکتی ہے جب کہ اس حکم کی جو منسوخ ہو چکا ہو۔ ہر حکم نفاذ کے بعد ہی فرمان برداری و نافرمانی کی کسوٹی بنتا ہے۔ موجودہ حکم کی تعمیل کرتا ہوا جو شخص دنیا سے رخصت ہوا ہو وہ بلاشبہ فرمانبرداری کرتا ہوا رخصت ہوا ہے۔ اس کے مر جانے کے بعد حاکم اس حکم کے بجائے دوسرا حکم نافذ کرے تو مرنے والے شخص سے متعلق کسی بھی عقل مند کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس نے جو موجودہ حکم کا زمانہ نہ پانے کی وجہ سے اس پر عمل نہ کیا تو وہ حاکم کا قصور وار سمجھا جائے یا نافرمان؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کرنے والے جو مومنین حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے وفات پا چکے تھے، کیا ان کے مومن و فرمانبردار ہونے میں اس وجہ سے شبہ کیا جا سکتا ہے کہ حضور ﷺ کا عہد نہ پانے کی وجہ سے انہوں نے آپ کی پیروی نہیں کی تھی؟ اور ظاہر ہے کہ براء بن عازب رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام عقل سے بے بہرہ نہ تھے کہ اتنی موٹی سی بات بھی ان کی سمجھ میں نہ آتی۔

یقین کیجئے کہ براء بن عازب نے یہ بات نہیں کی تھی۔ ابو اسحاق السبیعی نے ہی ہوش و حواس اور عقل میں فتور آ جانے کی وجہ سے یہ بے ہودہ بات گھڑی تھی اور اسے براء بن عازب کی

طرف منسوب کر دیا تھا۔" ❶

جواب: ① برقی صاحب تو فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے (معاذ اللہ!) صحابہ کرام کا عقل سے بے بہرہ ہونا ثابت ہوتا ہے، حالانکہ اس کے بالکل برعکس یہ حدیث تو اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دینی معاملات میں انتہائی احتیاط سے کام لیتے اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کی بجا آوری میں خرابی پیدا ہونے سے بہت زیادہ ڈرتے رہتے تھے، جیسا کہ صحیح مسلم میں حدیث ہے، کاتبِ رسول سیدنا حنظلہ اسیدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

لقيني أبو بكر، فقال: كيف أنت يا حنظلة؟ قال: قلت: نافق حنظلة، قال: سبحان الله! ما تقول؟ قال: قلت: نكون عند رسول الله صلى الله عليه وسلم، يذكرنا بالنار والجنة، حتى كأنا رأي عين، فإذا خرجنا من عند رسول الله صلى الله عليه وسلم عافسنا الأزواج والأولاد والضيعات، فنسينا كثيرا، قال أبو بكر: فوالله إنا لنلقى مثل هذا، فانطلقت أنا وأبو بكر، حتى دخلنا على رسول الله صلى الله عليه وسلم، قلت: نافق حنظلة يا رسول الله! فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: وما ذاك؟ قلت: يا رسول الله نكون عندك، تذكرنا بالنار والجنة، حتى كأنا رأي عين، فإذا خرجنا من عندك عافسنا الأزواج والأولاد والضيعات نسينا كثيرا، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: والذي نفسي بيده! إن لو تدومون على ما تكونون عندي وفي الذكر لصافحتكم الملائكة على فرشكم وفي طرقكم، ولكن يا حنظلة ساعة وساعة، ثلاث مرات.

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/۳۱-۳۲

"مجھے ابوبکر رضی اللہ عنہ ملے اور کہا، اے حنظلہ کیسے ہو؟ میں نے کہا، حنظلہ منافق ہو گیا ہے، انہوں نے کہا، سبحان اللہ! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں نے کہا، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتے ہیں، آپ ہمیں جنت و جہنم کے بارے بتاتے ہیں تو (ایمان کی زیادت کی وجہ سے) گویا ہم (یہ سب کچھ) آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں، لیکن جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے نکل آتے ہیں تو بیویوں، اولادوں اور مال و دولت میں مگن ہو جاتے ہیں تو بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے، اللہ کی قسم! ہمیں ایسی ہی صورت حال سے سابقہ پڑتا ہے، چنانچہ میں اور ابوبکر رضی اللہ عنہ چلے حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے، میں نے عرض کی، اے اللہ کے رسول! حنظلہ منافق ہو گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کیا معاملہ ہے؟ میں نے عرض کی، ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں، آپ ہمیں جنت و جہنم یاد دلاتے ہیں تو گویا ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں، لیکن جب ہم آپ کے پاس سے نکل آتے ہیں تو اپنی بیویوں، اولادوں اور مال و دولت میں مگن ہو جاتے ہیں تو بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم اسی حالت پر رہو جس پر تم میرے پاس ہوتے ہو اور (ہر وقت) ذکر کرتے رہو تو تمہارے بستروں اور راستوں پر فرشتے تمہارے ساتھ مصافحہ کریں، لیکن اے حنظلہ! کبھی (ایمان زیادہ ہوتا ہے) اور کبھی (ایمان کم ہوتا ہے)۔ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمائی۔"

اب اگر کوئی سرپھرا اس حدیث پر بھی یہ اعتراض کر دے کہ یہ حدیث بھی صحیح نہیں اور کہہ دے کہ "صحابہ کرام عقل سے بے بہرہ تھے کہ ذرا سی سادہ سی بات کو سمجھ نہ پاتے اور اپنے آپ کو بشمول ابوبکر منافقین کی صف میں شمار کرنے لگے۔۔۔" [1]

---

[1] صحیح مسلم، ۲۷۵۰

تو کیا اس وجہ سے اس حدیث کا بھی انکار کر دیا جائے گا؟ ہاں! کچھ عجب نہیں کہ مہری صاحب کے معتقدین اس حدیث کا بھی انکار کر دیں، تو کیا پھر وہ خود کو اعتراض سے بچا لیں گے؟ نہیں، بلکہ یہ اعتراض تو قرآن کریم پر بھی آ جائے گا کہ اس میں کتنی ہی واضح ترین باتیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے لیے بیان کی ہیں مثلاً جب مسلمان بار بار آپ ﷺ سے سوالات کرتے، آپ ﷺ ان کا جواب دینے کے لیے وحی کا انتظار فرماتے تو اللہ تعالیٰ ان کے جوابات نازل فرماتے، جیسا کہ درج ذیل سوالات ہیں:

﴿ وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ﴾ ❶

"وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔"

﴿ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ ﴾ ❷

"وہ آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔"

﴿ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ﴾ ❸

"وہ آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔"

﴿ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ ... ﴾ ❹

"وہ آپ سے پہاڑوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ ان سے کہہ دیجیے۔۔۔"

[illegible]

اس کا مطلب ہے کہ (معاذ اللہ!) یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اتنی سادہ باتوں کے بارے میں بھی علم نہ تھا۔ [illegible] تو کیا یہ بات صحیح ہوگی؟

---

❶ البقرة: ۲۱۹ ❷ البقرة: ۲۲۰

❸ البقرة: ۲۲۲ ❹ طٰہٰ: ۱۰۵

کے مقتدی تھے تو ان میں سے ایک صاحب نماز سے فارغ ہو کر چلے تو ایک جگہ انہوں نے دیکھا کہ انصاری مسلمانوں کی ایک جماعت نماز ادا کر رہی ہے اور حسب دستور وہ لوگ کعبہ کی طرف پشت اور بیت المقدس کی طرف رخ کیے ہوئے تھے۔ اس شخص نے یہ آواز بلند پکار کر کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی ہے اور میں خود اس نماز میں شریک تھا۔ اس وقت وہ لوگ رکوع کی حالت میں تھے، یہ سنتے ہی سب کے سب کعبہ کی سمت گھوم گئے۔

ناظرین! سمجھنے کی کوشش کریں، اس بیان میں دو قصور ہیں:

اول یہ کہ اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ حکم تحویل آ جانے پر آپ نے اپنی مسجد میں تو نماز رو بکعبہ ہو کر پڑھائی تھی، لیکن عام مسلمانوں کو بروقت اس حکم سے آگاہ فرما دینے کا اہتمام نہیں فرمایا۔ ابو اسحاق کی اس حدیث میں یہ بھی مذکور نہیں کہ آپ نے مسجد میں یہ اعلان کروا دیا تھا کہ حاضرین، غائبین کو آگاہ کر دیں، نہ یہ کہ آپ نے مدینہ میں اس کی عام منادی کرائی تھی، جیسے شراب کی حرمت کے موقع پر آپ نے منادی کرائی تھی کہ "الا ان الخمر قد حرمت! سنو! شراب حرام کر دی گئی ہے۔" (1)

ازالہ (1) پہلے تو میرٹھی صاحب یہ وضاحت کریں کہ تحویل قبلہ والی آیات عصر کی نماز سے کتنی دیر قبل نازل ہوئی تھیں کہ نماز سے پہلے لوگوں میں اعلان کروا دیا جا سکتا تھا، پھر اس حدیث پر اعتراض کریں، جب یہ آیات نازل ہی نماز عصر سے تھوڑی دیر پہلے ہوئی ہیں تو نماز سے پہلے اعلان کیسے کروایا جا سکتا تھا؟ نہ معلوم معترضین امت مسلمہ کے اتفاقی فیصلے کے خلاف بولنے سے پہلے اپنی بات کو تول کیوں نہیں لیتے؟

---

(1) صحیح بخاری کا مطالعہ [illegible]

دورخی پالیسی!

❁ آیئے چلتے چلتے میرٹھی صاحب کی "دورخی پالیسی" کا بھی اندازہ کرلیں۔ انہوں نے اس حدیث پر اعتراض یہ کیا ہے کہ آپ نے "عام مسلمانوں کو بروقت اس حکم سے آگاہ فرمادینے کا اہتمام نہیں فرمایا" جبکہ انہیں یہ یاد نہیں رہا کہ اپنے موقف کی تائید کرتے ہوئے مثال میں حرمتِ شراب والی جو حدیث انہوں نے پیش کی ہے اس میں بھی یہ بات موجود نہیں کہ آپ ﷺ نے منادی کرنے والے کو فوراً ہی بھیج دیا تھا اور لمحہ بھر بھی توقف نہ فرمایا ہو۔ لہٰذا کوئی آدمی بھی اعتراض ان کی بیان کردہ حدیث پر بھی کرسکتا ہے۔ پھر میرٹھی صاحب کس کس حدیث کو چھوڑیں گے؟

❁❁ اس اعتراض کے ضمن میں میرٹھی صاحب کی دورخی پالیسی کی دوسری دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اپنے موقف کی تائید کے لیے جس حدیثِ مبارکہ کے چند الفاظ پیش کیے ہیں وہ حدیث خودان کے قاعدے کے مطابق (معاذ اللہ!) "بے ہودہ بات" ہے۔ ذرا اس حدیث کے بقیہ الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

فقال بعض القوم: قد قتل قوم وهي في بطونهم، فأنزل الله ﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا﴾ [1]

"(حرمتِ شراب کے اعلان کے بعد) بعض صحابہ نے کہا، یقیناً کچھ لوگ (مسلمان) اس حال میں شہید کردیے گئے تھے کہ شراب ان کے پیٹوں میں موجود تھی (تو جانے ان کا کیا بنے گا؟) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا﴾ [المائدۃ: ۹۳] "جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان پر اس چیز

[1] المائدۃ: ۹۳

سے پہلے ہی دنیا سے جا چکے ہیں اور ان پر یہ حکم لاگو ہی نہیں ہوا تھا، لہٰذا وہ نافرمان شمار نہیں کیے جا سکتے۔ پھر تو صحابہ کرام کا ان کے بارے میں پریشانی کا اظہار کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ صحابہ کرام عقل سے بے بہرہ نہ تھے کہ اتنی موٹی سی بات ان کی سمجھ میں نہ آتی۔۔۔۔؟؟؟

ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اب دو ہی باتیں ہیں۔ یا تو میرٹھی صاحب کے نزدیک یہ حدیث بھی اس اعتراض کے وارد ہونے کی وجہ سے صحیح نہیں یا پھر ان کو اس حدیث میں یہ اعتراض نظر ہی نہیں آیا، اگر ان کے ہاں یہ حدیث صحیح نہیں تھی تو اسے اپنے موقف کی تائید میں پیش کرنا دیانتِ علمی نہیں اور اگر ان کو اس اعتراض کا پتا ہی نہیں چلا تو یہ بات ان کے کم فہم ہونے کی دلیل ہے!

کسی عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے!

ان كنت لا تدري فتلك مصيبة

وان كنت تدري فالمصيبة أعظم!

صحابہ کرام نے فعلِ نبوی کو تشریع پر کیوں محمول کیا؟

”دوم یہ کہ اس حدیث کی رو سے اس مخبر نے انہیں صرف فعلِ نبوی کی خبر دی تھی، یہ نہیں (کہا تھا) کہ میں رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم لے کر آیا ہوں کہ ہر شخص رو بکعبہ ہو کر نماز پڑھے، اس نے تو انہیں صرف آپ کے عمل کی اطلاع دی تھی، اسے انہوں نے تشریع پر کیسے محمول کر لیا؟ اس کے متعلق صحیح و بے غبار حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی ہے۔۔۔۔“ [1]

جواب: ① میرٹھی صاحب کو اگر معلوم نہیں ہو سکا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے عمل کی اطلاع کو تشریع پر کیسے محمول کر لیا تھا تو ہم ان کو بتا دیتے ہیں کہ

[1] صحیح بخاری کا مطالعہ: ۱/ ۳۰

آپ ﷺ کا عمل حدیث ہے اور حدیث کو صحابہ کرام حجت سمجھتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے، کیونکہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ ۝ ﴾ ❶

"اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور (ان کی نافرمانی کرکے) اپنے اعمال کو ضائع مت کرو۔"

﴿ مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ﴾ ❷

"جس نے رسول کی اطاعت کی درحقیقت اس نے اللہ کی اطاعت کی۔"

﴿ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ﴾ ❸

"(اے نبی!) کہہ دیجیے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو، (اس کے نتیجے میں) اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ معاف فرما دے گا۔"

معلوم ہوا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے ساتھ ساتھ اپنے نبی کی اطاعت کو بھی لازم قرار دیا ہے، بلکہ اپنی اطاعت کو نبی کی اطاعت سے مشروط کیا ہے اور اپنی محبت [illegible] کا ذریعہ بتایا ہے [illegible] صحابہ کرام ؓ [illegible] آپ ﷺ کے ہر قول و فعل کی پیروی کرتے تھے خصوصاً نماز جیسی اہم عبادت [illegible] آپ ﷺ کا ارشاد [illegible] بھی موجود ہے [illegible] «صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي»

"[illegible] اسی طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے پڑھتے دیکھا ہے۔" ❹

❶ [illegible] ❷ [illegible] ❸ [illegible]

❹ [illegible]

صحابہ کرام عاملین بالحدیث تھے، منکرینِ حدیث نہ تھے کہ آپ ﷺ کی احادیث کا انکار کردیتے۔

میرٹھی صاحب کی ''دیانتِ علمی''!

صحیح بخاری ([illegible]) وصحیح مسلم ([illegible]) وغیرہما کی جس حدیث کو میرٹھی صاحب نے خود ''صحیح وبے غبار'' قرار دیا ہے، اسی حدیث میں ان کے درج ذیل دعویٰ کا بطلان موجود تھا کہ

''خود آپ (ﷺ) نے کبھی کوئی فرض نماز بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نہیں پڑھی۔''

لہٰذا ''دیانتِ علمی'' سے کام لیتے ہوئے میرٹھی صاحب نے اس کا ترجمہ ہی غلط کردیا ہے۔ حدیث کے اصل الفاظ ملاحظہ فرمائیں اور پھر انکارِ حدیث کے نتیجہ میں واقع ہونے والی معنوی تحریف بھی دیکھیں:

بینما الناس بقباء فی صلاۃ الصبح اذ جاءہم آت، فقال: ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قد أنزل علیہ اللیلۃ قرآن، وقد أمر أن یستقبل الکعبۃ، فاستقبلوہا ....

ان الفاظ کا ''میرٹھی ترجمہ'' یہ ہے:

''لوگ قبا میں تھے کہ ایک آنے والے نے آکر کہا کہ رات رسول اللہ ﷺ پر کچھ آیاتِ قرآن اتری ہیں اور ان کے مطابق آپ نے حکم فرمایا ہے کہ کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھی جائے لہٰذا تم کعبہ رخ ہو جاؤ۔۔۔'' ❶

حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے:

''لوگ قبا میں تھے کہ ایک آنے والے نے آکر کہا: آج رات رسول اللہ ﷺ پر قرآن

---

❶ ''صحیح بخاری کا مطالعہ'' ۱/۳۳

(کی کچھ آیات) اتری ہیں اور (ان آیات میں) آپ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ کعبہ کو قبلہ بنا لیں، لہٰذا (اے اہل قباء!) تم بھی اس (کعبہ) کی طرف رخ کر لو۔“

چونکہ آپ ﷺ کو کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیئے جانے والے الفاظ میرٹھی صاحب کے مذکورہ بالا دعوی کے خلاف تھے اور ان الفاظ سے ثابت ہو رہا تھا کہ آپ ﷺ بھی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھتے رہے تھے، جب ہی تو آپ ﷺ کو اللہ کی طرف سے کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم ملا ہے، لہٰذا انہوں نے انتہائی تکلف کیا ہے اور فعل ”معروف“ کو فعل ”مجہول“ میں بدل کر ترجمہ بدلنے کی سعی نا حاصل کی ہے۔

لیکن اگر کوئی منصف مزاج آدمی صحیح بخاری میں ہی اس روایت کو دوسری جگہ پڑھ لے تو وہ میرٹھی صاحب کے اس کارنامے سے بخوبی واقف ہو سکتا ہے اور انکارِ حدیث کے فتنہ سے اپنا دامن بچا سکتا ہے، صحیح بخاری ہی میں یہ روایت ان الفاظ سے بھی آئی ہے:

بینما النّاس یصلّون الصّبح فی مسجد قباء اذ جاء جاءٍ، فقال: انزل اللّٰہ علی النّبیّ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم قرآنا أن یستقبل الکعبۃ، فاستقبلوھا...

”لوگ مسجد قباء میں صبح کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک آنے والا آ کر کہنے لگا، اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر قرآن نازل کیا ہے کہ آپ ﷺ کعبہ کی طرف رخ کر لیں، لہٰذا (اے اہل قباء!) تم (بھی) اس (کعبہ) کی طرف رخ کر لو۔“ [1]

اسی طرح سنن دار قطنی کی یہ روایت بھی بالکل صریح ہے کہ:

انّ رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم انزل علیہ اللّیلۃ قرآن وامرہ أن یستقبل الکعبۃ، الا فاستقبلوھا...

[1] صحیح بخاری: ۴۴۸۸

''(اس آدمی نے کہا) کہ آج رات کو رسول اللہ ﷺ پر قرآن نازل ہوا ہے اور اس نے آپ ﷺ کو حکم دیا ہے کہ آپ قبلے کی طرف رخ کرلیں، خبردار! تم اسی طرف رخ کرلو۔'' ❶

معلوم ہوا کہ یہاں حکم دینے والا اللہ تعالیٰ ہے، رسول کریم ﷺ نہیں، لہٰذا میرٹھی صاحب کی طرف سے فعل مجہول کے بجائے فعل معروف کا ترجمہ کرکے تحویل قبلہ کا حکم اللہ تعالیٰ کے بجائے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنا دیانت علمی کے خلاف ہے۔

اب قارئین ہی فیصلہ کریں کہ ایسے شخص کو بھلا پوری امت کی مخالفت کرتے ہوئے صحیح بخاری پر اعتراضات کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے؟

صحابہ کرام کو نبی اکرم ﷺ کی دلی خواہش کیسے معلوم ہوئی؟

''اس حدیث میں ابو اسحاق نے حضرت براء بن عازب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے کے زمانہ میں حضور اکرم ﷺ کی دلی خواہش یہ تھی کہ بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کو ہمارا قبلہ قرار دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ حضرت براء کو رسول اللہ ﷺ کی اس خواہش کا علم کیسے ہوا؟ زبان مبارک سے تو آپ نے کبھی اس خواہش کا اظہار فرمایا نہ تھا، صحیح تو کجا کسی ضعیف حدیث میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے کہ آپ نے یہ فرمایا ہو کہ میرا دل چاہتا ہے کہ خانہ کعبہ کو قبلہ بنا دیا جائے۔۔۔۔'' ❷

جواب: میرٹھی صاحب کا یہ اعتراض بالکل بچگانہ ہے۔ بھلا مزاج شناس اور قابل شاگردوں کو اپنے مہربان و شفیق استاد کی بے چینی و پریشانی، نیز دلی خوشی کا احساس کیے بغیر بتائے صرف چہرے سے پتا نہیں چل جاتا؟

---

❶ سنن دار قطنی ۱/ ۲۷۳ وسندہ صحیح

❷ ''صحیح بخاری کا مطالعہ'' ۱/ ۳۳-۳۴

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے اپنے امیر (محمد رسول اللہ ﷺ) کی مزاج شناسی تو قیامت تک آنے والے تمام لوگوں کے لیے نمونہ اور مشعل راہ ہے۔ صحیح احادیث میں موجود ایسے واقعات کی ایک لمبی فہرست پیش کرنا بے جا طوالت کا باعث ہوگا، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ کے چہرہ مبارک کو دیکھ کر نہ صرف آپ ﷺ کے غم وغصہ یا فرحت وخوشی کو محسوس کیے، بلکہ اس کے اسباب کا بھی اندازہ کرلیا تھا۔ ہم صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

ع جس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قسم النبي صلى الله عليه وسلم قسما، فقال رجل: إن هذه قسمة ما أريد بها وجه الله! فأتيت النبي صلى الله عليه وسلم فأخبرته، فغضب، حتى رأيت الغضب في وجهه...

"نبی کریم ﷺ نے (غزوہ حنین کا) مال غنیمت تقسیم کیا تو انصار کے ایک (خارجی) شخص نے کہا، اس تقسیم میں اللہ کی رضا کا ارادہ نہیں کیا گیا (انصاف نہیں کیا گیا)۔ میں نے اس بات کی خبر رسول اللہ ﷺ کو دی تو آپ ﷺ غصہ میں آگئے، یہاں تک کہ میں نے غصہ آپ ﷺ کے چہرہ مبارک میں دیکھا۔" ❶

اور صحیح مسلم کے الفاظ ہیں کہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس آدمی کی بات کی وجہ سے آپ ﷺ کے غصہ کو بھانپ گئے اور آپ رضی اللہ عنہ نے قسم کھاتے ہوئے اپنے دل میں کہا کہ

لا جرم، لا أرفع إليه بعدها حديثا

---

❶ صحیح بخاری: ۳۱۵۰، صحیح مسلم: ۱۰۶۲

"یقیناً میں اس کے بعد کوئی شکایت آپ ﷺ کی طرف لے کر نہیں جاؤں گا۔"

اب قارئین خود سوچیں کہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے غصہ اور اسی غصہ کے سبب کو جان لیا ہے کہ نہیں؟ کیا اس وضاحت کے بعد برقی صاحب کے اس اعتراض کا بطلان واضح نہیں ہو جاتا؟

④ - اگر شاگرد اپنے استاذ کے کسی فعل سے اس کی پسند و ناپسند کا پتا چلا لے تو کیا شاگرد کا یہ کہنا غلط ہے کہ میرے استاذ کی یہ خواہش تھی؟ ہرگز نہیں، جیسا کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم کی حدیث ہے، سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

إن خياطا دعا رسول الله صلى الله عليه وسلم لطعام صنعه ... فذهبت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى ذلك الطعام، فقرب إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم خبزا ومرقا فيه دباء وقديد، فرأيت النبي صلى الله عليه وسلم يتتبع الدباء من حوالي القصعة ... فلم أزل أحب الدباء من يومئذ

"ایک درزی نے رسول اللہ ﷺ کو اس کھانے کی دعوت دی جو اس نے تیار کیا تھا، میں بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس کھانے کی طرف گیا، اس (درزی) نے روٹی اور شوربہ پیش کیا، جس میں کدو اور گوشت کے ٹکڑے تھے، میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ برتن کی تمام اطراف سے کدو تلاش کر (کے تناول فرما) رہے تھے۔" [1]

صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں:

يأكل من ذلك الدباء ويعجبه

---

[1] صحیح بخاری: ۲۰۹۲، صحیح مسلم: ۲۰۴۱

"آپ ﷺ اس (برتن) سے کدو تناول فرما رہے تھے اور اسے پسند فرما رہے تھے۔"

اب محترمی صاحب کے عقیدت مندوں سے پوچھیں کہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ، رسول اللہ ﷺ کے ایک فعل کو دیکھ کر اس کو آپ کی پسند قرار دے رہے ہیں یا نہیں؟ کیا رسول اللہ ﷺ نے ان کو بول کر بتایا تھا کہ میں کدو کو پسند کرتا ہوں؟

پھر یہ بالکل وہی يُعْجِبُهُ کے الفاظ ہیں، جو کہ تحویلِ قبلہ والی حدیث میں تھے، اسی طرح سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے افعالِ مبارکہ سے معلوم کر لیا تھا کہ آپ ﷺ کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنا پسند کرتے تھے اور یہ آپ ﷺ کی خواہش تھی۔

اتنی سی بات بھی اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اس میں امام بخاری یا صحیح بخاری کا کوئی قصور نہیں۔

④ کوئی صحابی جس کام کے بارے میں بتائے کہ رسول اللہ ﷺ اس کی خواہش رکھتے تھے یا اسے پسند کرتے تھے، ضروری نہیں کہ اس کام کے پسندیدہ ہونے کے بارے میں رسول اکرم ﷺ کا فرمان موجود ہو۔ انکارِ حدیث کے خوگر لوگ درج ذیل حدیث کو ذرا ٹھنڈے دل سے پڑھیں:

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

((كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْجِبُهُ التَّيَمُّنُ فِي تَنَعُّلِهِ وَتَرَجُّلِهِ وَطُهُورِهِ وَفِي شَأْنِهِ كُلِّهِ))

"نبی کریم ﷺ جوتا پہنے، کنگھی کرنے، وضو کرنے اور اپنے تمام کاموں میں دائیں جانب (سے شروع کرنا) پسند فرماتے تھے۔" ❶

❶ صحیح بخاری: ١٦٨، صحیح مسلم: ٢٦٨

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کے ہر کام میں دائیں جانب کو پسند کرنے کے لیے بالکل وہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو تحویل قبلہ والی حدیث میں استعمال ہوئے ہیں اور میرٹھی صاحب نے ان پر اعتراض کیا ہے، یعنی اس حدیث میں ہے:

((كان يعجبه أن تكون قبلته قبل البيت))

''آپ کو اپنا قبلہ بیت اللہ کی طرف ہونا اچھا لگتا تھا۔''

اور یہاں بھی وہی الفاظ ہیں کہ:

كان يعجبه التيمن .

''آپ کو دائیں جانب سے شروع کرنا اچھا لگتا تھا۔''

اب کوئی اور شخص بھی میرٹھی صاحب کی بات کو دہراتے ہوئے اگر کہے کہ:

''سوال یہ ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ ﷺ کی اس خواہش کا علم کیسے ہوا؟ زبانِ مبارک سے تو آپ ﷺ نے کبھی اس خواہش کا اظہار فرمایا نہ تھا، صحیح تو کیا کسی ضعیف حدیث میں بھی رسول اللہ ﷺ کی طرف سے نام لے لے کر ایک ایک کام کے دائیں جانب سے شروع کرنے کو پسند یدہ کہنے کا ذکر نہیں ہے۔۔۔''

تو میرٹھی صاحب اور ان کے معتقدین کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ کیا وہ آپ ﷺ کی احادیث سے ثابت کر سکتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ہر ہر کام کا نام لے لے کر اس کو دائیں جانب سے شروع کرنا پسند کیا ہو؟

معلوم ہوتا ہے کہ میرٹھی صاحب درحقیقت احادیث کو سرے سے مانتے ہی نہیں، یہ محض دھوکہ ہے کہ صحیح بخاری کی کچھ احادیث ان کے نزدیک ''ضعیف'' ہیں، نہ ہی اس بارے میں وہ کسی قانون وضابطہ کی پیروی کرتے ہیں، بلکہ صرف اپنی نارسا عقل کے خلاف ہونے کی وجہ سے احادیث صحیحہ پر بے جا اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔

③ پھر یہ بھی مسلّم اصول ہے کہ عدمِ ذکر عدمِ وجود کی دلیل نہیں۔ ہو سکتا ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام ؓ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا ہو، پھر سیدنا براء بن عازب ؓ نے اسے بیان کر دیا ہو۔

اس میں بھلا اعتراض والی کون سی بات ہے؟ صحابیٔ رسول ﷺ کی صراحت کے بعد بھی اس پر دلیل کا مطالبہ کرنا عقل و فہم اور اصولوں کا پاس نہ کرنے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

حدیث تحویلِ قبلہ میں عربیت کے لحاظ سے ''خامیاں''!

تحویلِ قبلہ والی احادیث کی رو سے سورۂ بقرہ کی آیتِ کریمہ ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (۱۴۴) کا ترجمہ یوں ہوتا ہے:

''اے نبی! ہم ضرور آپ کو اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے، جس کو آپ پسند کرتے ہیں، چنانچہ آپ اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں۔''

اس پر اعتراض کرتے ہوئے میرٹھی صاحب کہتے ہیں:

''لیکن یہ مطلب عربیت کے لحاظ سے غلط ہے، اگر قِبْلَةً تَرْضٰىهَا سے پہلے لفظ اِلٰی یا اور کوئی لفظ جو سمت و جہت کے معنی پر دلالت کرے، ہوتا تو یہ مطلب صحیح ہوتا۔ توضیح اس کی یہ ہے کہ فعل وَلّٰی، یُوَلِّیْ کے لغتِ عرب میں دو معنی آتے ہیں:

① والی و حاکم بنا دینا: اس معنی میں اس کا استعمال متعدی بدو مفعول ہوتا ہے اور دونوں منصوب ہوا کرتے ہیں، جیسے:

وَلَّی السُّلْطَانُ فُلَانًا تِلْكَ الْقَرْيَةَ (سلطان نے فلاں شخص کو اس بستی کا والی بنا دیا)

② پھیر دینا: اس معنی میں اس کا استعمال ہو تو وہ چیز جس کی طرف پھیر دینے کا ذکر ہو سمت و جہت پر دلالت کرنے والے کسی لفظ کے ساتھ ذکر کی جاتی ہے، جیسے اِلٰی یا نحو

یا شطر یا قبل یا تلقاء جیسے ولیت زیدا الی ذاک المکان (میں نے زید کو اس جگہ کی طرف پھیر دیا) اور جس چیز سے پھیر دینے کا ذکر ہو اسے عَنْ کے ساتھ لایا جاتا ہے، جیسے ولیت زیدا عن الشمال نحو الجنوب (میں نے زید کو شمال سے جنوب کی طرف پھیر دیا) اس معنی میں اس کا استعمال متعدی بدو مفعول ہو کر نہیں ہوتا۔ لہٰذا ﴿ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ﴾ کا یہ ترجمہ غلط ہے کہ ہم ضرور بضرور تجھے تیرے پسندیدہ قبلہ کی طرف پھیر دیں گے۔ اس کا صحیح و درست ترجمہ یہ ہے کہ ہم ضرور بضرور تجھے والی بنا دیں گے اس قبلہ کا جسے تو نے (ہمارے حکم سے) اختیار کر رکھا ہے۔۔۔"[1]

جواب ① یہ اعتراض میرٹھی صاحب کے لغوی میدان میں کچا ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے، ان کا کہنا ہے کہ ولّی یولّی کا معنی پھیرنا ایک شرط کے ساتھ ہوتا ہے، وہ شرط آپ انہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں:

"پھیر دینا، اس معنی میں اس کا استعمال ہو تو وہ چیز جس کی طرف پھیر دینے کا ذکر ہو سمت وجہت پر دلالت کرنے والے کسی لفظ کے ساتھ ذکر کی جاتی ہے۔۔۔"[2]

میرٹھی صاحب کی لغوی قابلیت

یہ بات بالکل بجا، لیکن میرٹھی صاحب نے لفظ قِبْلَةً پر غور کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اس کا اپنا معنی ہی "جہت و سمت" ہے، چنانچہ عربی کی مشہور و معروف اور معتبر لغت تاج العروس وغیرہ میں لکھا ہے:

القبلة في الأصل: الجهة، يقال: ما لكلامه قبلة، أي: جهة...

[1] دیکھئے: "بخاری کا مطالعہ" ۲/ ۳۴۔ ۳۵

[2] دیکھئے: "بخاری کا مطالعہ" ۲/ ۳۴

معنی کس لغت کے اعتبار سے کیا گیا ہے؟ تَرۡضٰی مضارع کا صیغہ ہے، ماضی کا نہیں کہ اس کا معنی "اختیار کر رکھا ہے" کر دیا جائے۔ اصل معنی یہ تھا کہ:

"ہم آپ کو ضرور اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے، جسے آپ پسند کرتے ہیں"

جیسے کہ امام ابن جریر رحمہ اللہ کی زبانی بتایا جا چکا ہے۔ حدیث کی مخالفت نے ان کو عقل و نقل دونوں کے خلاف معنی کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

یہ ہے لغت عرب میں میرٹھی صاحب کا مبلغ علم اور ان کو اعتراض ہے امت کے اتفاقی فیصلے صحیح بخاری پر!

② تمام محدثین و مفسرین نے اس آیت کا یہی معنی کیا ہے، میرٹھی صاحب سے پہلے اس ترجمہ کو کسی محدث و مفسر نے غلط قرار نہیں دیا، امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ (م ۳۱۰ھ) لکھتے ہیں:

فأما قوله: فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبۡلَةً تَرۡضٰهَا، فإنه يعني: فلنصرفنك عن بيت المقدس إلى قبلة ترضاها، تهواها وتحبها.

"اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ ہم ضرور آپ کو بیت المقدس سے اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے، جس کو آپ پسند کرتے اور چاہتے اور اس سے محبت رکھتے ہیں۔" ❶

ماہرین لغت مفسرین نے بھی اس معنی کو غلط قرار نہیں دیا، جیسے زمخشری، خازن، بیضاوی، ثعلبی، رازی وغیرہ جو کہ لغت عرب کے ماہرین ہیں، سب نے بیک زبان اس معنی کو صحیح قرار دیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا قریباً چودہ سو سال تک مسلمان لغت عرب سے جاہل رہے، کسی کو بھی اس کی سمجھ نہ آسکی، مسلمانوں کے اسلاف کے بارے میں ایسے نظریات رکھنے والا شخص بھلا کیسا مسلمان ہوگا؟

---

❶ تفسیر طبری: ۲/ ۲۷۰

ابن ماجہ کی ایک ضعیف روایت کو آڑ بنا کر محدثین پر طعن و تشنیع!

سنن ابن ماجہ کی روایت پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"یہ روایت غلط بیانیوں اور فضول باتوں کی بے ہودہ معجون ہے اور اس کی دلیل ہے کہ گویا راویانِ حدیث عقل و فہم سے بے بہرہ تھے، نقل کرنے کے لیے عقل کی ضرورت کے قائل نہ تھے۔۔۔ یہ بات نقل کرتے ہوئے نہ ابن ماجہ نے کچھ عقل سے کام لیا، نہ ان کے شیخ ملتھ ابن عمرو دارمی نے، نہ ان کے شیخ ابوبکر بن عیاش نے۔۔۔" ❶

تبصرہ: صحیح بخاری پر اعتراضات کے ضمن میں سنن ابن ماجہ کی ایک "ضعیف" روایت کو تختۂ مشق بنا کر ائمہ دین، محدثین اور تمام راویانِ حدیث کو عقل سے بے بہرہ قرار دینا انصاف کا خون کرنے والی بات ہے۔ برقی صاحب کی عقل نے اتنا بھی کام نہیں کیا کہ سنن ابن ماجہ کی اس "ضعیف" روایت کا صحیح بخاری پر اعتراضات سے کیا تعلق ہے؟

اس روایت کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے شاذ (ضعیف) قرار دیا ہے۔ ❷

پھر ہم گزشتہ تحقیق سے یہ بات ثابت کر آئے ہیں کہ امام ابو اسحاق السبیعی آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے اور اختلاط سے پہلے ان سے ان کے صرف تین شاگردوں امام سفیان ثوری، امام شعبہ اور اسرائیل بن یونس کا سماع ثابت ہے۔

اصولِ حدیث کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ ایسے راوی کی صرف وہ احادیث "صحیح" ہوں گی جو اس سے اختلاط سے پہلے سننے والے شاگرد بیان کریں، جب کہ معلوم ہے کہ ابوبکر بن عیاش کا ابو اسحاق سے قبل از اختلاط سماع ثابت نہیں ہے، لہٰذا یہ روایت "ضعیف" ہے۔

---

❶ صحیح بخاری کا مطالعہ، ج ۲، ص ۱۳۹

❷ فتح الباری لابن حجر: ۱/ ۶۷۰

محدثین، جو کہ حقیقی طور پر اولیاء اللہ ہیں، ان کے خلاف اس "شاذ" روایت کو بنیاد بنا کر جو میرٹھی صاحب نے ہرزہ سرائی کی ہے، ہمیں اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں، اس کا شکوہ ہم اللہ ہی سے کرتے ہیں:

الٰہی! تو جانتا ہے کہ تیرے دین کے ان محافظ محدثین سے ہمیں کتنی محبت ہے! ہم سے ان کی ایسی گستاخیاں برداشت نہیں ہو پاتیں! اگر تیرے علم کے مطابق ان لوگوں کی قسمت میں ہدایت نہیں ہے تو ان کی ایسی ہفوات پر خود ان سے نمٹ لے!

انکارِ حدیث سے انکارِ قرآن تک

ہم پہلے بھی یہ بات بتا چکے ہیں کہ انکارِ حدیث دراصل انکارِ قرآن ہے، اس کی کئی مثالیں آپ میرٹھی صاحب کی کلام سے ملاحظہ فرما چکے ہیں، ان کی طرف سے انکارِ قرآن کی ایک اور مثال پیشِ خدمت ہے، لکھتے ہیں:

"پھر اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہوئے اپنے چہرے کو آسمان میں بہت الٹتے پلٹتے رہتے تھے، کیا یہ ممکن ہے کہ زمین پر کھڑا یا بیٹھا ہوا کوئی انسان خواہ وہ اللہ کا نبی ہی کیوں نہ ہو، آسمان میں اپنا چہرہ الٹے پلٹے؟" [1]

میرٹھی صاحب کا یہ اعتراض درست نہیں، بلکہ قرآن کریم پر ہے، کیونکہ ہم بتا چکے ہیں کہ اصولِ محدثین کے مطابق یہ روایت ثابت ہی نہیں، البتہ میرٹھی صاحب نے جس پر اعتراض کر کے اپنی عاقبت خراب کر لی ہے، وہ اسی طرح بالکل ہی بعینہ قرآن کریم میں موجود ہے، پہلے آپ اس روایت کے الفاظ پڑھیں:

وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا صلى الى بيت المقدس اكثر

[1] صحیح بخاری کا مطالعہ: ۱/ ۲۸

تو شاید ایسا نہ کرے!

اب قارئین ہی بتائیں کہ ان کی اس بے اصولی کو کیا نام دیا جائے؟ لہٰذا اس روایت پر ان کے فضول اعتراضات کا جواب دے کر ہم اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے۔

② رہا آیتِ کریمہ کے ترجمہ پر اعتراض تو عرض ہے کہ یہ ترجمہ اس حدیث کی وجہ سے نہیں، بلکہ دوسری صحیح احادیث اور لغتِ عرب کی بنا پر کیا گیا ہے، آئیے عربی دان لوگوں کی زبانی اس کی وضاحت کرتے ہیں:

امام قتادہ بن دعامہ تابعی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

كان صلى الله عليه وسلم يقلب وجهه في السماء، يحب أن يصرفه الله عزّ وجلّ إلى الكعبة، حتى صرفه الله إليها.

"نبی کریم ﷺ اپنے چہرہ مبارک کو آسمان کی طرف پھیرتے تھے، خواہش رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کا قبلہ کعبہ کی طرف پھیر دے، حتی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس کعبہ کی طرف پھیر دیا۔" ❶

یاد رہے کہ امام قتادہ رحمہ اللہ عظیم تابعی ہیں، جن کے بارے میں امام اہل سنت احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

عالم بتفسير القرآن "آپ قرآن کی تفسیر کے عالم تھے۔" ❷

امام طبری رحمہ اللہ کے بارے میں مؤرخ اسلام امام ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

كان ثقة، صادقا، حافظا، رأسا في التفسير، إماما في الفقه والإجماع

---

❶ [illegible]

❷ [illegible]

والاختلاف، علامة في التاريخ وأيام الناس، عارفا بالقراءات وباللغة وغير ذلك..

"آپ (امام ابن جریر) حافظ، ثقہ، صادق اور ماہر تھے، نیز تفسیر، فقہ، اجماع اور اختلاف کے امام تھے، تاریخ اور لوگوں کے ایام (جنگوں) کے علامہ، قراءات اور لغت وغیرہ کے ماہر تھے۔" ❶

لغت کے یہ ماہر امام اور مفسر قرآن لکھتے ہیں:

يعني بالتقلب: التحول والتصرف، ويعني بقوله: في السماء: نحو السماء وقبلها...

"تقلب سے مراد (چہرے کو) پھیرنا اور تبدیل کرنا ہے اور فرمان باری تعالیٰ ﴿في السماء﴾ سے مراد آسمان کی جہت اور طرف ہے۔" ❷

علامہ زمخشری (م ۵۳۸ھ) لکھتے ہیں:

تقلب وجهك: تردد وجهك وتصرف نظرك في جهة السماء، وكان يتوقع من ربه أن يحوله الى الكعبة...

"تقلب وجهك کا معنی آپ کا اپنے چہرۂ مبارک اور اپنی نظر مبارک کا آسمان کی طرف پھیرنا ہے، آپ ﷺ اپنے رب تعالیٰ سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ ان کا قبلہ کعبہ کی طرف پھیر دے گا۔" ❸

---

❶ سير أعلام النبلاء للذهبي: ۱۴/۲۶۷

❷ تفسير الطبري: ۳/۱۷۲

❸ تفسير الكشاف للزمخشري: ۱/۲۲۸

یہ علامہ زمخشری ہیں جن کے بارے میں ناقدِ رجال حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وكان رأسا في البلاغة والعربية والمعاني والبيان، وله نظم جيد.

"آپ بلاغت، عربیت، علم معانی و بیان میں ماہر تھے، آپ کے بڑے عمدہ اشعار بھی ہیں۔" ❶

علامہ بیضاوی لکھتے ہیں:

تقلب وجهك في السماء: تردد وجهك في جهة السماء تطلعا للوحي...

"اس سے مراد آپ ﷺ کا وحی کے انتظار میں اپنے چہرے کو آسمان کی طرف بار بار پھیرنا ہے۔" ❷

اگر ہم اس آیت کی تفسیر میں تمام مفسرین کے اقوال پیش کرنا شروع کر دیں تو ایک مستقل کتاب بن جائے۔ ہم صرف ان چند حوالہ جات پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

تابعین کرام اور مفسرین قرآن کیا لغت عرب سے ناواقف تھے؟ امام مقاتل جو کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک مفسر قرآن ہیں، وہ یہی ترجمہ کر رہے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ بقول حافظ ذہبی رحمہ اللہ عربی دان ہیں، وہ یہی معنی کر رہے ہیں۔ علامہ زمخشری جو حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے ہاں لغت عرب کے ماہر، فصیح و بلیغ اور بہترین عربی شاعر بھی ہیں، اسی معنی کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ علامہ بیضاوی جو کہ عربی لغت و معانی کے ماہر سمجھے جاتے ہیں، یہی تفسیر کر رہے ہیں۔ نیز آج تک آنے والے تمام مسلمان مفسرین اسی معنی کو صحیح قرار دیتے آئے ہیں۔ کسی نے اسے عقلی یا نقلی اعتبار سے غلط قرار نہیں دیا۔ کیا یہ سب جاہل تھے؟

❶ سير أعلام النبلاء للذهبي: 20/151 ❷ تفسير البيضاوي: 1/120

اب آپ خود ہی اندازہ کر لیں کہ میرٹھی صاحب کا یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ:

"منثور و منظوم کلام عرب سے تقلب وجه کے اس معنی کا سراغ نہیں لگ سکتا۔"

خود میرٹھی صاحب کا "فرمان" ہے کہ:

"لغت عرب میں تقلب الٹنے پلٹنے اور کروٹ بدلنے کے معنی میں ہے۔" ❶

پھر عربی لغت میں وجه کا معنی چہرہ ہوتا ہے، جس سے کسی منکر حدیث کو انکار نہیں۔
لیکن نہ جانے اس "الٹنے پلٹنے" کے ساتھ جب وجه (چہرے) کا لفظ حدیث میں آ گیا
تو اس کا معنی "چہرے کو الٹنا پلٹنا" کیوں صحیح نہیں رہا؟

❷ تمام سلف صالحین اور ساری امت مسلمہ کے متفقہ فہم قرآن کو غلط قرار دیتے
ہوئے جو معنی میرٹھی صاحب نے کیا ہے کہ یہ

"کنایہ ہے بے چینی اور قلق و اضطراب سے۔۔۔"

تو اس سے کسی کو کوئی بھی اختلاف نہیں، ظاہر ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ قبلہ تبدیل ہونے
کی خواہش میں اپنے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھا رہے تھے تو اس وقت آپ بے چین اور
قلق و اضطراب میں ہی تھے۔

❸ ہمارا میرٹھی صاحب کے معتقدین سے سوال ہے کہ میرٹھی صاحب نے اپنے کیے
گئے معنی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کوئی منثور و منظوم کلام کیوں پیش نہیں کی؟

میرٹھی صاحب تو اللہ کی عدالت میں پہنچ چکے، اب ان کا کوئی فیض یافتہ ہی ان کی اس بات کا
ثبوت قدیم عربوں کی منثور و منظوم کلام سے پیش کرے کہ وہ تقلب وجه کے "چہرے کو
الٹنے پلٹنے" والے معنی کو غلط کہتے ہوں اور اسے صرف قلق و اضطراب سے کنایہ قرار دیتے ہوں!

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/ ۱۲

فی بمعنی إلی کا عرب میں شائع ہے

(۳) میرٹھی صاحب لکھتے ہیں کہ

"فی السماء کا یہ ترجمہ کہ آسمان میں، اس کا ترجمہ آسمان کی طرف کرنا قطعاً غلط ہے۔" (1)

لیکن یقین جانیے کہ میرٹھی صاحب کی یہ بات ان کی اپنی ناواقفیت جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ کیونکہ لغت عرب میں فی کو إلی کے معنی میں استعمال کیا جانا معروف ہے جیسا کہ عربی لغت کی مشہور و معروف کتاب تاج العروس میں لکھا ہے کہ فی کو إلی کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ (2)

عربی ادب و لغت کے امام اور ناقد ابن قتیبہ دینوری رحمہ اللہ (م ۲۷۶ھ) یہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بعض حروف دوسرے حروف کے معانی میں استعمال ہوتے ہیں

و(فی) مکان (إلی)۔۔۔

"اور فی کو إلی کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔" (3)

ابن قتیبہ تمام امت مسلمہ کے ہاں مسلم لغوی اور ادیب تھے، ان کے بارے میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

النحوی اللغوی صاحب المصنفات البدیعۃ المفیدۃ المحتویۃ علی علوم جمۃ نافعۃ۔۔۔

(1) "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۳۱/۱

(2) تاج العروس: ۲٦٤/۳۹

(3) ادب الکاتب: ۳۹۹/۱

غلطیاں" دراصل ان کی اپنی فاش و صریح غلطیاں ہیں اور ان کے لغتِ عرب سے ناواقف ہونے کی واضح دلیل ہیں۔

ع الزام ہم کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

فصلِ ثالث: تاریخی اعتراضات کا جائزہ

کیا نبی اکرم ﷺ نے کوئی نماز بھی بیت المقدس کی جانب نہیں پڑھی؟

صحیح بخاری میں موجود امام سفیان ثوری کی حدیث کا ترجمہ کرتے ہوئے برقی صاحب لکھتے ہیں:

"ہم سے ابو اسحاق سبیعی نے بیان کیا کہ میں نے براء بن عازب سے سنا کہ ہم (یعنی انصارِ مدینہ) نے نبی ﷺ کے ساتھ یعنی آپ کی موجودگی میں ۱۶ یا ۱۷ ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی، پھر اللہ نے آپ کو اصل قبلہ کی طرف پھیر دیا، یعنی حتماً حکم دے دیا کہ کعبہ رخ ہو کر نماز پڑھی جائے۔ سفیان ثوری نے ابو اسحاق سبیعی سے حدیثیں ان کے ہوش و حواس و حفظ و ضبط کے قصور آنے سے قبل سنی ہیں، لہٰذا یہ حدیث صحیح و قابلِ اعتماد ہے اور اس میں وہ فضولیات اور انتہائی بیہودہ غلط سلط باتیں نہیں ہیں، جو ابو اسحاق کے ان تلامذہ کی روایات میں ہیں، جنہوں نے ابو اسحاق سے یہ حدیث ان کے مخبوط الحواس ہونے کے زمانہ میں سنی تھیں۔ اور سفیان ثوری کی اس روایت میں براء بن عازب ؓ کا یہ جو قول مذکور ہے کہ ہم نے نبی ﷺ کے ساتھ ۱۶ یا ۱۷ ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ خود حضور اکرم ﷺ نے بھی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے مدینہ میں نماز پڑھی تھی، بلکہ یہ قول مدینہ میں رہنے والے انصاری مسلمانوں کا تھا، بیعتِ عقبہ اولیٰ کے موقع پر اہلِ مدینہ میں سے جو سات حضرات مشرف بہ

اسلام ہوئے تھے، ان کی گزارش کے مطابق آپ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ معلم و مبلغ کی حیثیت سے بھیج دیا تھا، انہوں نے یثرب پہنچ کر بڑی تندہی و جانفشانی کے ساتھ تبلیغ حق فرمائی، ان کی اور نو مسلم انصار کی کوششیں بڑی مبارک و ثمر آور ہوئیں اور ایک سال کے اندر مدینہ کے ایک ایک گھر میں اسلام ایک محبوب و پسندیدہ دین کی حیثیت سے داخل ہو گیا، مدینہ کے ان مسلمان ہو جانے والے اشخاص کو حضرت مصعب نے نماز اور اس کے اوقات کی تعلیم دی تھی، لیکن وہ اس حکم سے واقف نہ تھے کہ نماز کعبہ رخ ہی پڑھنی چاہیے، ان حضرات نے اسلام اور یہودیت دونوں کو یکساں ہی خیال کیا تھا، چونکہ یہود بھی بت پرستی نہ کرتے تھے اور ان میں سے جو لوگ نماز پڑھتے تھے، بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھتے تھے، انصاری مسلمانوں نے بھی یہودیوں کی دیکھا دیکھی بیت المقدس کو ہی قبلہ قرار دے لیا تھا۔" ❶

تبصرہ ① ہم گزشتہ صفحات میں بھی اس کی وضاحت تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں کہ جس سے ہر ذی شعور شخص سمجھ سکتا ہے کہ امام سفیان ثوری کی طرح امام شعبہ اور امام اسرائیل بن یونس نے بھی ابو اسحاق السبیعی سے قبل الاختلاط روایات کی ہیں، جو کہ بالاتفاق صحیح ہوتی ہیں اور اسرائیل بن یونس نے وہ الفاظ بیان کیے ہیں، جنہیں برقی صاحب "فضولیات اور انتہائی بیہودگی غلط سلط باتیں" قرار دے رہے ہیں، لہٰذا برقی صاحب کے معتقدین کو برقی صاحب کی بات ماننے کی بجائے ان کی علمی حالت پر افسوس کرنا چاہیے!

② اس حدیث کے ترجمہ میں برقی صاحب نے دیانت علمی کو خیر باد کہہ دیا ہے، کیونکہ صلينا مع النبي صلى الله عليه وسلم ... کا ترجمہ یہ ہے کہ "ہم نے آپ کی موجودگی میں نمازیں پڑھیں ..."

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/ ۴۳-۴۴

میرٹھی صاحب کے منصوبہ میں بتائیں ثُمَّ صُرِفَ نَحْوَ الْقِبْلَةِ ... کا اجماعِ امت کے خلاف ”حتماً حکم دے دیا“ والے ترجمہ کا سراغ عربی کی کس منثور و منظوم کلام یا لغت سے ملتا ہے؟

اس کا واضح اور صاف معنی وہی ہے جو ساری امت چودہ سو سالوں سے کرتی چلی آرہی ہے:

”پھر آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے (بیت المقدس سے) قبلہ کعبہ کی طرف پھیر دیا (یعنی آپ کا قبلہ بدل دیا)۔“

اس کی حدیث چونکہ میرٹھی صاحب ولی کی مانند کرتے تھے لہٰذا انہوں نے اس طرح کی بے تکی باتوں کے ذریعے جان چھڑانے کی کوشش کی ہے...

صحیح مسلم میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر ہے پر میرٹھی صاحب کوئی اعتراض نہیں کر پائے ہیں اس میں وہ جو الفاظ ہیں میرٹھی صاحب نے پڑھ کر دکھا دیئے ہیں:

أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلي نحو بيت المقدس، فنزلت...

”رسول اللہ ﷺ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے تھے، پھر یہ (تحویلِ قبلہ والی) آیت نازل ہوئی...“ ❶

③ میرٹھی صاحب کے بقول رسول اللہ ﷺ کے مدینہ بھیجے ہوئے صحابی سیدنا مصعب بن عمیر اور دوسرے مدنی صحابہ اس حکم سے واقف نہ تھے کہ نماز کعبہ رخ ہی پڑھنی چاہیے، ان حضرات نے اسلام اور یہود کے دین کو یکساں ہی خیال کیا تھا۔ میرٹھی صاحب کی اس بات کو صحیح سمجھ لینا کتنی بڑی جسارت کی بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ والوں کی تعلیم و تربیت کے لیے

---

❶ صحیح مسلم: ۵۲۷

یہ صحابہ کو صحیح دو وقت نماز کے قبلہ کا بھی علم نہیں تھا۔

نیز یہ کتنی بھاری تہمت ہے کہ صحابہ کرام نے دینِ اسلام اور دینِ یہود کو یکساں خیال کر لیا تھا۔ کیا برق صاحب کے نزدیک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بنا سوچے سمجھے مسلمان ہو گئے تھے؟

پھر یہ کتنی ناانصافی کی بات ہے کہ اسلام اور دینِ یہود ملتا جلتا تھا۔ اس کا اندازہ صحیح مسلم وغیرہ کی اس حدیث سے ہو سکتا ہے:

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ یہودی اپنی بیویوں کو ایامِ ماہواری میں اپنے گھروں سے باہر نکال دیتے تھے اور ان کے ساتھ کھانے پینے کو جائز نہیں سمجھتے تھے، رسول کریم ﷺ نے فرمان جاری کیا کہ سوائے جماع کے ان کے ساتھ ہر طرح کا تعلق ان ایام میں روا ہے تو یہود نے کہا:

ما يريد هذا الرجل أن يدع من أمرنا شيئا إلا خالفنا فيه ...

"یہ شخص (نبی کریم ﷺ) تو صرف ہر معاملے میں ہماری مخالفت کرنا چاہتا ہے۔" ❶

یہود تو پکار پکار کر یہ کہیں کہ رسول کریم ﷺ ہر معاملے میں ان کی مخالفت کرتے ہیں اور برق صاحب آپ ﷺ کے جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ حکم لگائیں کہ انہیں اسلام اور دینِ یہود یکساں لگتے تھے، اس لیے انہوں نے قبلہ ہی یہود کا بنا لیا تھا۔ یہ بے تکی کی انتہا ہے!

مسجدِ قبا اور مسجدِ نبوی کے اوّل روز سے ہی کعبہ رُخ ہونے کا دعویٰ!

"آپ نے اوائلِ ہجرت میں مقام قبا میں قیام کے زمانہ میں مسجد بنوائی تو وہ کعبہ رُخ ہی تھی، جیسے دنیا بھر کی تمام مسجدیں کعبہ رُخ ہوتی ہیں۔ پھر آپ مدینہ تشریف لے گئے تو چند روز بعد آپ نے وہ مسجد بنوائی جسے مسجدِ نبوی کہا جاتا ہے، وہ بھی اوّل روز سے کعبہ رُخ ہی

---

❶ صحیح مسلم: ۳۰۲

رہی ہے۔۔۔۔

اب ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس زمانے میں بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے ہوتے تو یہ دونوں مسجدیں بیت المقدس کے رخ پر تعمیر کی جاتیں، یعنی ان کی دیوار قبلہ سمت شمال ہوتی، پھر تحویل قبلہ کا حکم آجانے پر وہ منہدم کی جاتی اور سمت جنوب تعمیر کی جاتی اور ایسا ہوا ہوتا تو ضرور منقول ہوتا، کیونکہ مسجد نبوی کے تمام تعمیری تغیرات آغاز بنا سے مرآج تک بطریق متواتر منقول ہوتے چلے گئے ہیں۔" ❶

① میرٹھی صاحب اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکے کہ مسجد قبا اور مسجد نبوی میں پہلے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی جاتی تھی تو شمال والی دیوار کی طرف رخ کیا جاتا تھا اور پھر جب قبلہ خانہ کعبہ کی طرف تبدیل ہو گیا تو جنوب والی دیوار کی طرف رخ کیا جانے لگا۔ ان مسجدوں میں کون سے محراب یا منار بنے گئے تھے کہ جس سے کوئی دیوار قبلہ متعین ہوتی اور تغیرات تبدیل کرنا پڑتا؟

② پھر میرٹھی صاحب نے مسجد نبوی کے تمام تعمیری تغیرات کا بطریق متواتر منقول ہونا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر دیوار قبلہ منہدم کرکے دوبارہ تعمیر کی گئی ہوتی تو یہ بات ضرور منقول ہوتی۔

ان کے معتقدین سے ہمارا سوال ہے کہ کیا تحویل قبلہ کے حق ہونے کے بارے میں امت مسلمہ کا چودہ سو سالہ تواتر ان کو نظر نہیں آیا جسے سب مفسرین و محدثین نقل کرتے آئے ہیں؟

یہ عجیب منطق ہے کہ جو چیز تواتر سے منقول ہے، اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں اور منہدم کرکے دیواریں دوبارہ بنانا، جس کا کسی کو دعویٰ ہی نہیں، اس پر تواتر کی دلیل کا مطالبہ کیا

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۴۳_۱۴۵

جا رہا ہے!

قارئین کرام ہی بتائیں کہ یہ کس عدالت کا انصاف ہے؟

الحمد للہ! ہم نے قرآن، حدیث، عربی لغت و ادب اور عقل و فہم ہر طرح سے نبی کریم ﷺ کا پہلے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا اور تحویل قبلہ کے بعد خانہ کعبہ کی طرف رخ کرنا ثابت کر دیا ہے۔ لغت عرب، حدیث، اصول حدیث اور تفسیر سے اتنی ناواقفیت کے باوجود میرٹھی صاحب کی جرأت ہے کہ:

"آیات قبلہ کی صحیح تفسیر جاننے کے لیے ہر پڑھے لکھے شخص کو تیسیر مفتاح القرآن کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ اس میں تحویل قبلہ کے متعلق ہر مسئلہ کو حل کیا گیا ہے۔" ❶

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حق کو سمجھنے اور اس پر ثابت رہنے کی توفیق عطا فرمائے!

آمین!

---

❶ تیسیر القرآن ج ۱ ص ۱۱۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تیسرا باب

دورانِ حج یا بعد از حج گھروں کے پچھواڑے سے داخل ہونے کی ممانعت والی آیت کی تفسیر پر مبنی حدیثِ براء بن عازب

کرے اپنے گھروں کو دروازے سے آیا کرو)۔"❶

یہ تفسیر بالکل واضح ہے، مفسرین کرام بالتواتر اس آیت کریمہ کی تفسیر میں یہ حدیث پیش کرتے آئے ہیں، کسی مفسر نے اس تفسیر کو رد نہیں کیا۔ چودہ سو سال بعد میرٹھی صاحب کو سوجھا ہے کہ ساری امت مسلمہ اس "غلط تفسیر" پر قائم رہی ہے اور اب وہ اس کی "تصحیح" کر رہے ہیں۔

آیئے اس حدیث پر ان کے عقلی و نقلی اعتراضات کا جائزہ لیں تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ آیت کریمہ کی وہ تفسیر معتبر ہے یا نہیں، جس کو امت مسلمہ خیر القرون سے لے کر آج تک صحیح سمجھتی آئی ہے؟

فصل اول: نقلی اعتراضات کا جائزہ

ابو اسحاق السبیعی کی "مخبوط الحواسی"!

میرٹھی صاحب لکھتے ہیں:

"حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے ابو اسحاق سبیعی کوفی نے، اس سے شعبہ بن حجاج و اسرائیل بن یونس نے یہ حدیث روایت کی ہے۔۔۔

ابو اسحاق نے شعبہ سے کچھ بیان کر دیا تھا اور اسرائیل کو کچھ اور بتا دیا تھا، دونوں نے ابو اسحاق سے یہ حدیث اس کی مخبوط الحواسی کے زمانہ میں سنی تھی۔ رہے وہ اہل علم جنہوں نے ابو اسحاق سے اس کی جوانی یا کہولت کے زمانہ میں، یعنی مخبوط الحواسی سے پہلے استفادۂ احادیث کیا تھا تو ان میں سے کسی نے بھی ابو اسحاق سے یہ حدیث روایت نہیں کی۔ اس کے

---

❶ صحيح بخاری: ١٨٠٣، صحيح مسلم: ٣٠٢٦

معنی یہ ہیں کہ یہ حدیث حضرت براء بن عازب کی بیان کی ہوئی نہیں ہے، ابواسحاق نے غلطی سے اسے براء بن عازب کی طرف منسوب کر دیا تھا۔ اس حدیث میں شعبہ و اسرائیل کی رو نہیں کے ناقابلِ فہم تعارض پر امام بخاری رحمۃ اللہ کی نظر نہیں پڑی۔ اسی لیے دونوں کی روایتیں درج صحیح فرما دیں، حالانکہ دونوں کی روایتیں نادرست و ناقابلِ التفات ہیں۔" ❶

جائزہ: ہم باب نمبر ② میں تحویلِ قبلہ والی صحیح حدیث کا دفاع کرتے ہوئے بالتفصیل یہ بات ذکر چکے ہیں کہ امام شعبہ رحمۃ اللہ سب محدثین کے نزدیک بالاتفاق امام ابواسحاق سبیعی سے ان کے "مخلوط الحواس کے زمانہ" سے پہلے روایت کرتے ہیں، قارئین تحقیق کے لیے اس مقام کا مطالعہ ضرور کریں! آج تک یہ دعویٰ کسی محدث نے نہیں کیا، جو اصولِ حدیث کے بارے میں ناواقف میرٹھی صاحب نے کر دیا ہے کہ شعبہ نے ابواسحاق سبیعی سے اختلاط کے بعد احادیث سنی ہیں!

اسی مقام پر ہم یہ بھی بیان کر آئے ہیں کہ اسرائیل نے بھی جمہور محدثین کے نزدیک ابواسحاق سبیعی کے اختلاط سے پہلے ہی ان سے روایات بیان کی ہیں، ایک درجن سے زائد محدثین کے مقابلے میں اصولِ حدیث سے یکسر نا بلد لوگوں کا قول بھلا کیا حیثیت رکھتا ہے؟

معلوم ہوا کہ سند کے اعتبار سے یہ حدیث بالکل بے غبار اور صحیح ہے، لہٰذا ابواسحاق سبیعی رحمۃ اللہ کے اختلاط کا بہانہ بنا کر اسے رد کرنا اور اس پر طرح طرح کے "عقلی" اعتراضات کرنا نہایت بے تکی بات ہے۔ آئیے اب میرٹھی صاحب کی طرف سے کیے گئے سب بے حقیقت "عقلی" اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں۔

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/ ۱۲۸۔

فصلِ ثانی: عقلی اعتراضات کا جائزہ

ابواسحٰق السبیعی کے بیان میں "ناقابلِ حل تعارض"!

"یہ حدیث بڑی عجیب و غریب ہے۔ صرف ابواسحاق نے اور ابواسحاق سے شعبہ و اسرائیل دو شخصوں نے روایت کی ہے۔ راوی صحابی ایک ہے اور اس سے روایت کرنے والا شخص ایک ہے یعنی ابواسحاق۔ اس سے روایت کرنے والے دو شخص ہیں، شعبہ و اسرائیل، لہٰذا ضروری ہے دونوں شخصوں کا بیان یکساں اور ہم آہنگ ہو۔ ان کے بیان میں اختلاف اور تناقض و تعارض نہ ہو۔ لیکن یہ دونوں روایتیں آپس میں مختلف بھی ہیں اور ان میں ٹکراؤ بھی ہے، شعبہ نے جو بیان کیا ہے، اسرائیل کا بیان اس سے الگ ہے اور دونوں کی روایتوں کے مضمون میں ایسا ٹکراؤ ہے، جسے دور کرنا ناممکن ہے۔

دیکھئے شعبہ کی روایت میں خاص انصار کا ذکر ہے کہ وہ جب حج کر کے وطن واپس آتے تو اپنے گھروں میں دروازوں سے داخل نہ ہوتے۔ ظاہر ہے کہ یہ احرام کی حالت نہ ہوتی تھی، کیونکہ احرام تو حج یا عمرہ ادا کرنے اور مکہ میں داخل ہونے کے لیے باندھا جاتا ہے۔ حج و عمرہ سے فارغ ہو کر احرام کھول دیا جاتا ہے، مکہ مکرمہ سے وطن واپس آنے کے لیے احرام نہیں باندھا جاتا۔ نہ آج تک کسی نے باندھا اور اسرائیل کی روایت میں عموم کے ساتھ اہل جاہلیت کا ذکر ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا یہ دستور تھا کہ احرام باندھ لیتے تو پھر گھر میں دروازے سے داخل نہ ہوتے پشت سے آتے، یعنی یہ حج و عمرہ سے قبل اور حالتِ احرام کی بات ہوئی۔

محدث محترم (ابواسحاق) کے بارے میں شعبہ و اسرائیل کی روایتوں کا یہ ٹکراؤ یہ ناقابلِ حل تعارض اس بات کی دلیل ہے کہ ابواسحاق نے شعبہ سے کچھ بیان کر دیا تھا اور اسرائیل کو کچھ

اور جہاد یا حج۔" ❶

جواب (1) میرٹھی صاحب کے اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ امام شعبہ کی روایت میں خاص انصار کا ذکر ہے، جبکہ اسرائیل بن یونس کی روایت میں عام اہلِ جاہلیت کا ذکر ہے۔ اس فرق کو انہوں نے "ناقابلِ حل تعارض" قرار دے کر صحیح بخاری کی اتفاقی طور پر صحیح حدیث، جسے چودہ سو سال تک مسلمان صحیح ہی مانتے آئے ہیں، پر بہت جسارت کے ساتھ ایک "عقلی" اعتراض کرنے کی بالکل ناکام کوشش کی ہے، حالانکہ یہ کوئی تعارض ہے ہی نہیں۔

وہ اس طرح کہ سب اہلِ جاہلیت کا یہ طرزِ عمل تھا اور انصارِ مدینہ کا بھی یہی طریقِ کار تھا۔ جب انصار اور مشرکین مکہ دونوں قسم کے لوگوں کا یہ رواج تھا تو دونوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوگئی اور یہ بات اصولِ تفسیر میں مسلّم ہے کہ ایک آیت کے کئی سببِ نزول ہو سکتے ہیں، جیسا کہ علومِ قرآن کی مشہور و معروف اور مسلّم کتاب "مناہل العرفان" کے مصنف علامہ عبدالعظیم زرقانی بحث ایک آیت کے بارے میں احادیث میں دو یا زیادہ اسبابِ نزول بیان ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں:

وأما الصورة الثالثة - وهي ما استوت الروايتان في الصحة، ولا مرجح لإحداهما، لكن يمكن الجمع بينهما بأنّ كلًّا من السببين حصل ونزلت الآية عقب حصولهما معًا لتقارب زمنيهما، فحكم هذه الصورة أن نحمل الأمر على تعدد السبب، لأنه الظاهر، ولا مانع يمنعه.

"تیسری صورت یہ ہے کہ (سببِ نزول کے بارے میں موجود) دونوں روایات صحت میں برابر ہوں اور کسی ایک کو ترجیح دینے والا کوئی قرینہ بھی نہ ہو، بلکہ دونوں کے درمیان اس طرح

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۲۸/۱

سے تطبیق ممکن ہو کہ دونوں اسباب (قریب قریب) وقوع پذیر ہوئے اور آیت دونوں کے بعد ایک ہی دفعہ نازل ہوئی، کیونکہ زمانہ قریب قریب تھا۔ اس صورت کا حکم یہ ہوگا کہ ہم اس آیت کے معنی کو تعدد اسباب نزول پر محمول کریں گے، کیونکہ یہی بات ظاہر ہے اور اس سے کوئی مانع بھی نہیں ہے۔" ❶

آیت لعان کے بارے میں صحاح میں دو اسباب نزول موجود ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ یہ آیت مبارکہ سیدنا عویمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ❷ ، جبکہ دوسری روایت میں ہے کہ یہ آیت مبارکہ سیدنا ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ❸ ۔ اس اختلاف کے بارے میں امام سیوطی رحمہ اللہ (م ۹۱۱ھ) علوم تفسیر کے موضوع پر اپنی معروف کتاب "الاتقان" میں لکھتے ہیں:

جمع بينهما بأن أول من وقع له ذلك هلال وصادف مجيء عويمر أيضا . فنزلت في شأنهما معا . وإلى هذا جنح النووي ، وسبقه الخطيب ، فقال : لعلهما اتفق لهما ذلك في وقت واحد .

"دونوں اسباب نزول کے درمیان تطبیق یوں دی جائے گی کہ سیدنا ہلال رضی اللہ عنہ کو یہ معاملہ پہلے درپیش ہوا، پھر ساتھ ہی سیدنا عویمر رضی اللہ عنہ بھی آ گئے، چنانچہ دونوں کے بارے میں یہ آیت کریمہ ایک ہی بار نازل ہوئی۔ امام نووی رحمہ اللہ کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ ان سے پہلے خطیب بغدادی نے فرمایا تھا کہ (یعنی) ممکن ہے کہ یہ آیت کریمہ ان دونوں صحابہ کے بارے میں ایک ہی وقت میں نازل ہوئی ہو۔"

---

❶ مناهل العرفان للزرقاني : [illegible]

❷ صحيح بخاري : [illegible] ، صحيح مسلم : [illegible] ❸ صحيح بخاري : [illegible]

حجر لکھتے ہیں:

قال ابن حجر : لا مانع من تعدد الأسباب .

"حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ (ایک آیت کریمہ کے) کئی اسباب نزول سے کوئی چیز مانع نہیں ہے۔" ❶

معلوم ہوا کہ ایک آیت کریمہ کے ایک سے زائد اسباب نزول ہونا کوئی بعید بات نہیں ہے نہ ہی ایسا ہونا حدیث میں کسی قسم کے کسی اعتراض کا کوئی سبب ہے، بلکہ محض اصول تفسیر وعلوم قرآن سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

اب قارئین انصاف کا خون کیے بغیر بتائیں کہ ابو اسحاق کے ان دونوں بیانات میں کیا تضاد ہے؟ بھلا جو شخص علوم قرآن اور فن تفسیر کی بنیادی معلومات سے بھی تہی دست ہو اسے قرآن کریم کی تفسیر کرنے کا کیا حق ہے؟

④ رہی احرام باندھنے کی بات، جس پر میرٹھی صاحب نے یوں اعتراض کیا ہے کہ:

"شعبہ کی روایت میں خاص انصار کا ذکر ہے۔۔۔احرام تو حج یا عمرہ ادا کرنے اور مکہ میں داخل ہونے کے لیے باندھا جاتا ہے، حج وعمرہ سے فارغ ہو کر احرام کھول دیا جاتا ہے، مکہ مکرمہ سے وطن واپس آنے کے لیے احرام نہیں باندھا جاتا، نہ آج تک کسی نے باندھا ہے۔"

قارئین صحیح بخاری میں امام شعبہ رحمہ اللہ کی روایت بار بار پڑھیں، ان کو انصار کے واقعہ میں احرام کا ذکر کہیں نہیں ملے گا کہ وہ احرام باندھے ہوئے گھروں میں داخل ہوتے تھے۔ احرام کا ذکر تو اسرائیل کی روایت میں ہے اور وہاں پر عموم اہل جاہلیت کا ذکر ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ امام

❶ الاتقان في علوم القرآن : 1/126-124

ابواسحاق السبیعی رحمہ اللہ کا اختلاط نہیں، بلکہ یہ اعتراض میرٹھی صاحب کی اپنی نا سمجھی کی زبردست برہان ہے۔

اب شاید میرٹھی صاحب کے معتقدین کے ذہن میں یہ اعتراض ابھرے کہ:

''عام اہل جاہلیت کے ساتھ تو احرام کا ذکر ہے، لا محالہ عموم میں انصار بھی شامل ہیں۔ معلوم ہوا کہ ابواسحاق السبیعی رحمہ اللہ نے انصار کے عمرہ میں ہوتے وقت بھی احرام کا ذکر کیا ہے، جو کہ سراسر غلط ہے۔''

لیکن یہ سراسر ان کی خام خیالی ہے، جو صرف انکارِ حدیث کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، ورنہ قرآن کریم میں بھی بارہا مقامات پر عموم کے الفاظ سے خاص چیز مراد ہوتی ہے۔ ہم بطور نمونہ ایک مثال پیش کیے دیتے ہیں، فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾ [1]

''رمضان کا مہینہ وہ ہے، جس میں قرآن نازل کیا گیا، وہ لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔''

دوسرے مقام پر ارشادِ ربانی ہے:

﴿ ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ﴾ [2]

''اس کتاب میں کوئی شک نہیں، یہ متقین کے لیے ہدایت ہے۔''

دیکھیں کہ اول الذکر فرمانِ باری تعالیٰ میں قرآن کو عمومی طور پر سب لوگوں کے لیے ہدایت قرار دیا گیا ہے، جبکہ دوسرے فرمانِ الٰہی میں قرآن کریم کو سب لوگوں میں سے صرف تقویٰ والے لوگوں کے لیے ہدایت بتایا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ قرآن کریم میں بھی بسا اوقات عموم کو کسی خارجی دلیل اور قرینہ سے خاص کر لیا جاتا ہے، کیونکہ یہ صرف عربی نہیں، بلکہ ہر زبان کا مسلم

---

[1] البقرة: ١٨٥ [2] البقرة: ٢

قانون اور ضابطہ ہے۔ لہٰذا اس حدیث میں اہل جاہلیت کے عمومی الفاظ سے خاص اہل مکہ مراد ہیں، دلیل اور قرینہ اس اختصاص کا یہ ہے کہ اہل جاہلیت کے احرام کی حالت میں گھروں کی پچھلی جانب سے داخل ہونے کا ذکر ہے اور ایسا صرف مکہ والے ہی کر سکتے تھے، کیونکہ غیر مکی حجاج ان کے اپنے شہر میں نہ ہوتے تھے، جبکہ اہل مکہ حج سے فارغ ہو کر اور احرام اتار کر ہی گھروں کو جاتے تھے۔ اسی لیے اہل جاہلیت سے مراد مکہ والے اہل جاہلیت ہی ہیں۔

اتنی سی بات تھی، جو میرٹھی صاحب کی سمجھ میں نہ آسکی اور انہوں نے ساری امت مسلمہ کے اتفاقی و اجماعی فیصلے کو ٹھکرانے کی ٹھان لی!

فصلِ ثالث: تاریخی اعتراضات کا جائزہ

یہ واقعہ کس سن ہجری میں پیش آیا؟ ایک تاریخی "سقم"!

میرٹھی صاحب ایک تاریخی "سقم" بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"علاوہ بریں شعبہ والی روایت میں مذکور ہے کہ ایک انصاری مسلمان حج کر کے آیا تو وہ پرانی رسم کے برخلاف گھر میں دروازے سے داخل ہو گیا۔ لوگوں نے اس کے اس فعل پر اعتراض کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا۔

سوال یہ ہے کہ یہ واقعہ کس سن میں پیش آیا تھا؟ ہجرت کے بعد اہل اسلام پہلی بار ۹ ہجری میں مدینے سے حج کے لیے گئے تھے اور ان کے امیر حج حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے، پس اگر یہ واقعہ اسی سن کا سمجھا جائے تو لازم آتا ہے کہ ۹ ہجری کے آخر یا ۱۰ ہجری کے اوائل میں یہ آیت نازل ہوئی ہو۔ حالانکہ تمام مفسرین و اہل علم اس پر متفق ہیں کہ یہ آیات ۶ ہجری میں صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی تھیں۔ ان آیات کی صحیح تفسیر مفتاح القرآن تفسیر سورۃ البقرۃ میں دیکھنی چاہیے۔ یہاں میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ تفسیر میں پیش کی

طرف سے آنا گویا یہ ہے کسی کام کو بے ڈھنگے پن سے سر انجام دینا ہے اور گھر میں دروازے سے آنا گویا یہ ہے کہ ہر کام صحیح ڈھنگ سے سر انجام دینا ہے۔" ❶

تبصرہ ① میرٹھی صاحب کا یہ اعتراض انتہائی بے جا ہے کہ:

"ہجرت کے بعد اہل اسلام پہلی بار ۹ ہجری میں مدینہ سے حج کے لیے گئے تھے۔۔۔ حالانکہ تمام مفسرین و اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ یہ آیات ۶ ہجری میں صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی تھیں۔"

کیونکہ اجتماعی طور پر اگرچہ مسلمان ۹ ہجری میں ہی حج کو گئے تھے، لیکن انفرادی طور پر تو اس سے پہلے بھی آتے جاتے رہتے تھے، اس لیے کہ قریش کی طرف سے پابندی صرف ۶ ہجری کی تھی، ۷ ہجری سے تو مسلمانوں کو حج و عمرہ دونوں کے لیے آنے کی مکمل اجازت تھی، پھر بھلا کوئی مسلمان ۹ ہجری سے پہلے حج کرنے نہ گیا تھا، خود رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ سے اگلے سال ذی القعدہ میں عمرہ فرمایا ہے۔ ❷

پھر میرٹھی صاحب کا یہ کہنا بھی بالکل بے حقیقت ہے کہ سب مفسرین و اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ یہ آیات ۶ ہجری میں صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئیں۔۔۔

ان کے معتقدین سے التماس ہے کہ وہ اس آیت کریمہ کا زمانہ نزول ۶ ہجری قرار دینے والے "سب" مفسرین اور اہل علم میں سے صرف سات حضرات ہی کے نام پیش کر دیں!

② رہی ان کی "صحیح" تفسیر تو عرض ہے کہ میرٹھی صاحب کے پاس وہ "وحی" کہاں سے آئی تھی، جس نے انہیں اس کی "صحت" اور صحیح بخاری میں موجود تفسیر کے "ضعف" کی خبر دی

---

❶ صحیح بخاری کا مطالعہ: ۱/۳۰۴

❷ صحیح بخاری: ۱۷۷۸؛ صحیح مسلم: ۱۲۵۳

تھی؟ صحیح بات یہی ہے اور مسلمہ یہی ہے کہ مفسرین عظام اس آیت کریمہ کی یہی تفسیر کرتے آئے ہیں۔ کسی نے اسے غلط قرار نہیں دیا جیسا کہ:

شیخ الاسلام مفسر و محدث ابو محمد البغوی رحمہ اللہ (م ۵۱۶ھ) لکھتے ہیں:

قال أهل التفسير كان الناس في الجاهلية وفي أول الإسلام إذا أحرم الرجل منهم بحج أو العمرة لم يدخل حائطا ولا بيتا ولا دارا من بابه. فأنزل الله تعالى هذه الآية.

”اہل تفسیر نے کہا ہے کہ دور جاہلیت اور شروع اسلام میں لوگوں کا معمول یہ تھا کہ جب ان میں سے کوئی آدمی حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیتا تو باغ اور گھر میں دروازے سے داخل نہ ہوتا۔۔۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔۔۔“ ❶

مفسر ابن عادل (م ۸۸۰ھ) لکھتے ہیں:

قال المفسرون سبب نزول الآية الكريمة: كان الناس في أول الإسلام، إذا أحرم الرجل منهم ..... ولا يخرج ولا يدخل من الباب ...

”مفسرین کا کہنا ہے کہ اس آیت کریمہ کا سبب نزول یہ ہے کہ لوگ شروع اسلام میں یوں کرتے تھے کہ جب ان میں سے کوئی آدمی احرام باندھتا تو۔۔۔ دروازے سے نہ نکلتا نہ داخل ہوتا۔۔۔“ ❷

علامہ قرطبی رحمہ اللہ (م ۶۷۱ھ) اس آیت کریمہ کے بارے میں کئی اقوال ذکر فرماتے ہیں:

القول الأول أصح هذه الأقوال، لما رواه البراء، قال: كان الأنصار إذا

---

❶ معالم التنزيل للبغوي: ۱/ ۲۲۰

❷ تفسير اللباب: ۳/ ۱۰

حجّوا ، فرجعوا لم يدخلوا البيوت من أبوابها ...

''ان سب اقوال میں سے پہلا قول ہی صحیح ترین ہے، کیونکہ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ انصار جب حج کرتے اور لوٹتے تو گھروں کو دروازوں سے داخل نہ ہوتے تھے...''

نیز لکھتے ہیں:

وهذا نصّ في البيوت حقيقة ، خرّجه البخاري ومسلم ...

''یہ بخاری و مسلم کی حدیث اس بات پر دلیل قاطع ہے کہ یہاں حقیقی گھر مراد ہیں (یہ کسی اور امر سے کنایہ نہیں ہے)۔'' 1

اللہ تعالیٰ سے ڈر کر فیصلہ کریں کہ پانچویں صدی ہجری کے عظیم مفسر حافظ بغوی رحمہ اللہ سب مفسرین سے یہی تفسیر بیان کر رہے ہیں، جو صحیح بخاری و مسلم میں موجود ہے، پھر نویں صدی ہجری کے مفسر بھی مفسرین کرام سے یہی تفسیر نقل کر رہے ہیں، معلوم ہوا کہ نویں صدی تک کسی نے اس تفسیر کا انکار نہیں کیا۔

اس کے ساتھ ساتھ ساتویں صدی ہجری کے نامور مفسر اسی تفسیر کو راجح قرار دے کر باقی تفسیروں کو مرجوح قرار دے رہے ہیں۔ پھر باقی سلف صالحین اور پوری امت مسلمہ کا اتفاق اس پر مستزاد ہے، لیکن افسوس ہے کہ بعض تجدد پسند لوگ پوری امت مسلمہ کو فہم سے عاری قرار دے کر ان چند اسلام دشمنوں کو متعارف کروانا چاہتے ہیں۔ کیا اتنے واضح حقائق کو دیکھ کر بھی کوئی ان لوگوں کی اندھی تقلید پر تیار ہے گا؟

اللہ تعالیٰ ہمیں حق قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

---

1 الجامع لأحكام القرآن للقرطبي : 2/346

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

چوتھا باب

آیتِ تکمیلِ دین

﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ...﴾

کے محلِ نزول و روزِ نزول سے متعلق حدیث

سورۃ المائدہ میں دینِ اسلام کی تکمیل کی بشارت موجود ہے فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي ﴾ ❶

"آج کے دن میں نے تمہارے واسطے دین کو مکمل اور اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے۔"

صحابہ و تابعین سے لے کر تمام مسلمان اس آیت سے دین کی تکمیل کی بشارت سمجھتے آئے ہیں۔

مفسرین کرام نے بھی اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں بتایا ہے کہ یہ آیت کریمہ حجۃ الوداع کے موقع پر جمعۃ المبارک کے دن مقامِ عرفہ میں نازل ہوئی، جیسا کہ صحیح بخاری ❷ اور صحیح مسلم ❸ وغیرہ میں موجود ہے۔

چودہ سو صدی تک کسی مفسر نے اس حدیث کا انکار نہیں کیا۔

بلکہ امام طبری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وأولى الأقوال في وقت نزول الآية القول الذي روي عن عمر بن الخطاب أنها نزلت يوم عرفة، يوم جمعة، لصحة سنده، ووهي أسانيد غيره.

---

❶ المائدة: ٣
❷ [illegible]
❸ ٣٠١٧

"اس آیتِ کریمہ کے وقتِ نزول کے بارے میں بہترین قول وہ ہے، جو سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ آیت یوم عرفہ کو جمعہ کے دن نازل ہوئی۔ (اس قول کے راجح ہونے کی) وجہ یہ ہے کہ اس کی سند صحیح ہے اور دوسرے اقوال کی سندیں کمزور ہیں۔" ❶

لیکن سب مسلمانوں کے اس اتفاقی فیصلے کے برعکس بعض لوگوں کو دینِ اسلام کی تکمیل کی یہ بشارت ایک آنکھ نہیں بھاتی، کیونکہ اسے تسلیم کر لینے کے بعد وہ دینی معاملات میں اپنی رائے کو داخل کرنے کے مجاز نہیں رہتے، لہٰذا انہوں نے اس یقیناً صحیح حدیث کا صاف انکار کر دیا ہے اور مومنوں کی راہ چھوڑتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ یہ آیتِ کریمہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے آخری ایام میں نازل نہیں ہوئی، بلکہ یہ بہت پہلے نازل ہو چکی تھی اور اس سے تکمیلِ دین کی بشارت مراد لینا صحیح نہیں۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم کی احادیث کے صحیح ہونے پر مسلمانوں کا اجماع و اتفاق ہے۔ سب مسلمانوں کے اتفاقی فیصلے کی مخالفت لامحالہ بہت بڑی غلطی ہے۔ آیئے اس صحیح حدیث پر ان کی طرف سے کیے گئے بے بنیاد اور بے تکے اعتراضات کا جائزہ لیں:

فصلِ اوّل: فنی اعتراضات کا جائزہ

صحابیٔ رسول طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ پر "دروغ بافی" کا الزام!

اس حدیث کے راوی طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں برقی صاحب لکھتے ہیں:

"طارق بن شہاب کوفی تابعی ہے۔ حضرت عمر کے عہد میں جب کوفہ شہر بسا تو طارق کے والد شہاب نے کوفہ کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے اواخر میں

---

❶ تفسیر الطبری: ۹/۵۲۶

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو بیت المال کی دیکھ بھال اور اہل کوفہ کو تعلیم دین دینے کی خاطر کوفہ بھیج دیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کوفہ میں ہی رہے۔ طارق بن شہاب کا شمار بھی ان اصحاب کے تلامذہ میں ہوتا ہے اور ان کے علاوہ اور بھی متعدد صحابہ کرام سے اس نے حدیثیں روایت کی ہیں۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس نے نہ کوئی حدیث سنی ہے نہ ان سے اس کی ملاقات ثابت ہے۔ بقول خلیفہ بن خیاط ۸۲ھ اور بقول عمرو بن علی ۸۳ھ میں اور بقول ابن نمیر ۸۳ھ میں طارق کا انتقال ہوا۔ (تہذیب التہذیب)

طارق سے جو حدیثیں مروی ہیں، ان کا مطالعہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ شخص بے اصل اور بے سروپا اور غیر معقول باتیں صحابہ کرام کی طرف منسوب کر کے روایت کرواتا تھا اور اپنے متعلق اس نے قیس بن مسلم سے یہ لاف زنی بھی کی تھی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانۂ خلافت میں چالیس سے زائد جہادوں میں شریک رہا ہوں۔۔۔ اب ظاہر ہے کہ جس شخص نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جہاد و قتال میں حصہ لیا ہو، وہ حضور اکرم ﷺ کی وفات کے وقت کم سے کم تیرہ سال کا ضرور ہوگا، کیونکہ چودہ سال سے کم عمر والے لڑکے کو شریعت جہاد کی اجازت نہیں ملی تھی اور یقیناً بارہ تیرہ سال کا لڑکا باشعور ہوتا ہے۔ اتنی ہی کم عمر حضرت عبداللہ بن عباس کی تھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ طارق بن شہاب نے حضور اکرم ﷺ تو کیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بھی کوئی حدیث روایت نہیں کی، نہ ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس کا کوئی حدیث سننا ثابت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ لوگوں میں اپنی قدر و قیمت بڑھانے کے لیے ہی اس نے یہ دروغ گوئی کی تھی۔۔۔" [1]

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/۳۲ـ۳۳

کسی راوی کے سچے یا جھوٹے ہونے کا معیار اس کے بارے میں موجود محدثین کے اقوال ہوتے ہیں نہ کہ ایسے شخص کی ذاتی رائے، جو اس علم سے یکسر ناواقف ہو!

محدثین کرام نے بالاتفاق یہ صراحت کی ہے انہوں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا تھا، لیکن آپ ﷺ سے احادیث نہیں سن سکے۔ کسی محدث نے بھی اس بات کا انکار ثابت نہیں۔

امام ابوزرعہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

طارق بن شهاب رأى النبي صلى الله عليه وسلم.

"طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا ہے۔" (1)

امام ابوحاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

له رؤية. "آپ کو نبی اکرم ﷺ کی زیارت ہوئی تھی۔" (2)

امام ابوداود رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

طارق بن شهاب قد رأى النبي صلى الله عليه وسلم ولم يسمع منه شيئا.

"طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ کی زیارت کی تھی، لیکن آپ ﷺ سے کوئی حدیث نہیں سنی۔" (3)

امام حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وطارق بن شهاب ممن يعدّ في الصحابة.

"طارق بن شہاب ان لوگوں میں سے ہیں جن کا شمار صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔" (4)

---

(1) [illegible] (2) [illegible]

(3) [illegible]

(4) [illegible]

علامہ ذہبی رحمہ اللہ بھی لکھتے ہیں:

رأى النبي صلى الله عليه وسلم.

"انہوں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا ہے۔" ❶

یوں طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ رسول اکرم ﷺ کے ایک صحابی ہیں، جن کی گستاخی کر کے میرٹھی صاحب نے اپنی عاقبت گنوائی ہے۔ آج تک کسی ایک محدث نے بھی ان پر کوئی جرح نہیں کی، بلکہ کئی ایک محدثین نے ان کی ثقاہت کی تصریح کی ہے۔

جب وہ ہیں معتبر تو ان کی اس بات کا بھی اعتبار ہونا چاہیے جو امام ابن سعد رحمہ اللہ نے بیان کی ہے:

أخبرنا يحيى بن عبّاد وسليمان أبو داوٗد الطيالسي، قالا: أخبرنا شعبة عن قيس بن مسلم، قال: سمعت طارق بن شهاب يقول: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم وغزوت في خلافة أبي بكر وعمر بضعا وأربعين بين غزوة وسرية.

"میں نے اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے اور سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت میں تو پچاس کے قریب غزوات و سرایا میں شریک ہوا ہوں۔" ❷

امام ابن سعد جو اس سلسلۂ سند کی پہلی کڑی ہیں، ان کی ثقاہت میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہاں ان کے دو استاذ ہیں، ایک یحییٰ بن عباد، جو کہ صدوق راوی ہیں، دوسرے امام ابو داود طیالسی رحمہ اللہ ہیں، جو کہ حدیث کی مشہور کتاب مسند طیالسی کے مصنف ہیں، ان کی ثقاہت بھی مسلم ہے۔

---

❶ سير أعلام النبلاء للذهبي: 3/486

❷ الطبقات الكبرى لابن سعد: 6/66، والمراسيل لابن أبي حاتم، ص: 98، وسنده صحيح

نہ معلوم میرٹھی صاحب کے پاس کونسا آلہ ہے، جس سے انہوں نے اس کی "دروغ گوئی" ماپ لی ہے؟ ورنہ بالاتفاق "ثقہ" راوی، خصوصاً ایک صحابی رسول کو "دروغ گو" کہنا اور ان کے فرمودات کو "ازف زنی" قرار دینا بجائے خود دنیا کی بہت بڑی دروغ گوئی اور سب سے بڑھ کر عقل کی خرابی ہے۔

رہا یہ "عقلی ڈھکوسلا" کہ وہ اس روایت کے مطابق رسول کریم ﷺ کی وفات کے وقت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرح باشعور تھے، لیکن انہوں نے نبی اکرم ﷺ یا سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کوئی روایت بیان نہیں کی تو یہ اعتراض کوئی ذی شعور، صاحب فہم وفراست اور سلیم العقل آدمی نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ کسی کے شرف صحابیت کے ثبوت کے لیے ضروری نہیں کہ وہ آپ ﷺ یا سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کوئی روایت بھی بیان کرتا ہو۔

حجۃ الوداع کا منظر ہی ذہن میں لائیں اور سوچیں کہ کتنی تعداد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس موقع پر آپ کی زیارت کی! لیکن کیا ان سب نے آپ ﷺ یا سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے احادیث روایت کیں؟

صحیح بخاری ❶ و صحیح مسلم ❷ میں سیدنا ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے اور صحیح مسلم ❸ میں سیدنا ضماد ازدی رضی اللہ عنہ کے اپنی جوانی میں مسلمان ہونے اور صحابی بننے کا ذکر ہے، ان کے صحابی ہونے میں تو آج تک کسی مسلمان نے اختلاف نہیں کیا، لیکن کیا کوئی "میرٹھی" کسی ایک حدیث کی طرف نشان دہی کر سکتا ہے، جو انہوں نے رسول کریم ﷺ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بیان کی ہو؟

④ میرٹھی صاحب کا طارق بن شہاب پر اعتراض بالکل بودا ہے، کیونکہ یہی حدیث

---

❶ ٤٦٢ ❷ ١٧٣١ ❸ ح: ٨٢٨٠

عمار بن ابی عمار نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی بیان کی ہے۔ اس کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں

قرأ ابن عباس ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ [المائدة: ٣] وعنده يهودي فقال: لو أنزلت هذه علينا لاتخذنا يومها عيدا. فقال ابن عباس: فإنها نزلت في يوم عيد، في يوم جمعة ويوم عرفة.

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت کریمہ کی قراءت کی: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ [المائدة: ٣] (آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو دین پسند کیا ہے) آپ رضی اللہ عنہ کے پاس ایک یہودی تھا، اس نے کہا: اگر یہ ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس کے یوم نزول کو عید بناتے۔ اس پر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ آیت بڑی عید والے دن ہی نازل ہوئی تھی، یوم عرفہ کو جمعہ کے دن۔" [1]

میرٹھی صاحب کے نزدیک بھی اس کی سند صحیح ہے۔ دلیل کے طور پر اتنی بات ہی کافی ہے کہ میرٹھی صاحب نے اسے اپنی کتاب میں ذکر تو کیا ہے لیکن ان سے اس پر کوئی اعتراض نہیں بن پایا، لہٰذا چپ سادھ گئے ہیں۔

معلوم ہوا کہ صحیح بخاری کی اس حدیث پر اور رسول اکرم ﷺ کے صحابی سیدنا طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ پر اعتراض ندامت بن کر قیامت تک میرٹھی صاحب کے ماتھے پر چپک گیا ہے۔ اس سے صحیح بخاری کے مقام و مرتبہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔

---

[1] جامع ترمذی: ٣٠٤٤، مسند الطیالسی: ٢٧٣١، ج: ٤، ص: ٣٦٧، وسندہ صحیح

"ارسال" کا دعویٰ!

(یہ حدیث سند کے لحاظ سے متصل نہیں، بلکہ مرسل ہے) یہ سرخی جما کر شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب لکھتے ہیں:

"قیس بن مسلم سے یہ حدیث ① سفیان ثوری ② مسعر بن کدام ③ ادریس بن یزید اور ④ ابو العمیس نے روایت کی ہے۔۔۔۔

ثوری، مسعر، ادریس تینوں کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ طارق بن شہاب نے چند یہودیوں یا ایک یہودی اور حضرت عمر کا یہ مکالمہ نقل کیا تھا لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ اسے یہ قصہ کس سے معلوم ہوا تھا؟ نہ یہ بتایا کہ میں اس وقت حضرت عمر کی مجلس میں حاضر تھا۔ پس طارق کا بیان کردہ یہ قصہ ان تینوں کی روایت کے مطابق "مرسل" ہے، یعنی طارق نے اسے کسی سے سنا تھا مگر کس سے؟ کس کا اس نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ اور ابو العمیس کی روایت یہ ہے:

اخبرنا قیس بن مسلم عن طارق بن شهاب عن عمر ان رجلا من الیهود قال له ..

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ طارق نے یہ قصہ خود حضرت عمر سے سنا تھا۔ حضرت عمر نے اسے بتایا تھا کہ ایک یہودی نے ان سے کہا تھا۔۔۔ بخاری رحمہ اللہ نے اسی پر سفیان ثوری، مسعر و ادریس کی روایت کو محمول کر لیا تھا، لیکن امام بخاری کا یہ گمان اصول کے خلاف ہے۔ تین ثقہ راویوں کی روایت یہ بتا رہی ہے کہ یہ حدیث "مرسل" ہے اور طارق نے اس شخص کا نام ذکر نہیں کیا تھا جس سے اسے یہ قصہ معلوم ہوا تھا اور ایک راوی نے اپنی اسناد میں عن عمر کہا ہے تو اس ایک شخص کی روایت کو تین ثقات کی روایت پر محمول کرنا

چاہیے نہ کہ تین شخصوں کی روایت کو ایک کی روایت پر۔۔۔" ❶

جواب ① قارئین کرام غور فرمائیں کہ میر محمدی صاحب اصول حدیث سے بالکل ناواقف ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ہر ایک راوی کی روایت کو قبول کرنے کے لیے یہ شرط نہیں کہ وہ اپنے استاذ سے بیان کرنے میں حدثنی یا سمعت جیسے صریح الفاظ کہے، بلکہ یہ شرط صرف "مدلس" راویوں کے لیے ہے، کیونکہ صرف ایسے راوی ہی کبھی اپنے استاذ سے بالواسطہ (Indirect) کی سنی ہوئی بات کو بلاواسطہ (Direct) بیان کرتے تھے۔ اگر باقی راوی بھی اسی طرح کیا کرتے تھے تو "مدلس" والے اصول اور اس میں تقسیم راویوں کی تخصیص کا کیا مطلب ؟؟؟

"غیر مدلس" راوی کی ایسی روایت کو آج تک کسی محدث نے "مرسل" نہیں کہا، لہٰذا میر محمدی صاحب کا اسے "مرسل" قرار دینا بہت بڑی بے وقوفی ہے۔ لیکن وہ "چوری بھی ہے اور سینہ زوری بھی" کے صحیح مصداق بن کر نہ صرف اصول امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ کے، بلکہ پوری امت مسلمہ کے ذمے تھوپنا چاہتے ہیں اور اس روایت کو "اصول کے خلاف" قرار دے رہے ہیں۔

کیا ساری امت مسلمہ جو کہ بخاری و صحیح مسلم کی صحت پر اجماع کر چکی ہے، وہ سب بے اصولی پر متفق ہو گئی تھی اور اس اصول کی سمجھ صرف میر محمدی صاحب کو آئی تھی؟

② رہا میر محمدی صاحب کا یہ کہنا کہ تین راوی اس روایت کو طارق بن شہاب سے عن کے علاوہ دوسرے لفظوں، أنّ اور قال کے الفاظ سے ذکر کر رہے ہیں، جبکہ عنْ سے بیان کرنے والا ایک راوی ہے، لہٰذا تین ثقہ راویوں کی روایت یہ بتا رہی ہے کہ یہ حدیث "مرسل" ہے۔۔۔

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ: ۱/۵۲-۶۲

تو یہ بھی جہالت در جہالت ہے، کیونکہ "غیر مدلس" کی طرف سے أَنَّ اور قَالَ کے الفاظ سے بیان کی گئی حدیث عَنْ کے لفظ سے بیان کی گئی حدیث کی طرح اتفاقی طور پر "موصول" اور "صحیح" شمار کی جاتی ہے۔ کسی محدث نے آج تک ایسی روایت کو "مرسل" نہیں کہا۔ یہ اصول "میرٹھی کمیٹی" کا اپنا وضع کردہ ہے۔

صرف صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ہی ایسی احادیث کی تعداد ہزاروں میں ہے، جن کو صحابی أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ سے بیان کرتے ہیں۔ کیا میرٹھی صاحب کے نزدیک وہ ساری کی ساری صحابی نے اللہ کے رسول ﷺ سے نہیں سنیں، بلکہ کسی اور سے سنی ہیں؟؟؟

لفظِ عَنْ روایت کے معنی میں نہیں!

"عَنْ کا لفظ کبھی روایت کے معنی میں آتا ہے اور کبھی "متعلق" کے معنی میں۔۔۔ ابو العمیس کی روایت میں عن عمر اسی معنی میں ہے (یعنی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ واقعہ ہے)۔ امام بخاری سے چوک ہوئی کہ اسے روایت کے معنی میں سمجھ لیا۔ پھر طارق بن شہاب کی روایت کردہ یہ حدیث "مرسل" ہے۔ معلوم نہیں کہ اس نے یہ قصہ کس سے سنا تھا؟ اور کسی حدیث کے صحیح ہونے کی ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ اس کی اسناد متصل ہو، مرسل یا منقطع نہ ہو۔ لہٰذا یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ امام بخاری نے غلط فہمی کی وجہ سے اسے متصل سمجھ لیا تھا۔" ❶

جواب: (۱) میرٹھی صاحب نے یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ان کو کس طرح سے معلوم ہوا تھا کہ ابو العمیس کی روایت میں عَنْ "متعلق" کے معنی میں

---

❶ صحیح بخاری کا مطالعہ ص [illegible]

کہ دراصل طارق نے کیا ذکر کیا تھا، ایک یہودی کا یا چند یہودیوں کا ؟ قسیں نے بھی کچھ کہہ دیا، کبھی کچھ۔" ❶

تبصرہ جب اس حدیث کی سند بالکل صحیح ہے اور میرٹھی صاحب کے اس پر کیے گئے تمام 'اصولی' اعتراضات کو ہم نے ان کی بے اصولی ثابت کر دیا ہے تو اب اس پر عقلی اعتراضات کچھ حیثیت نہیں رکھتے، کیونکہ قرآن کریم، جس کی صحت میں کسی مسلمان کو ذرہ برابر بھی شبہ نہیں، عقلی اعتراضات تو اس میں بھی منکرین نے کر دیے ہیں اور کتنے ہی مقامات پر انہوں نے بزعم خود قرآن کریم میں تناقض اور اختلاف ثابت کرنے کی سعی لا حاصل کی ہے، لیکن اس کے باوجود قرآن مجید کی صحت میں کوئی شبہ پیدا نہیں ہو سکا۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

روزِ قیامت کے بارے میں قرآن کریم نے ایک مقام پر فرمایا ہے:

﴿ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ ﴾ ❷

یعنی اس کی مقدار ایک ہزار سال ہوگی، جبکہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ﴾ ❸

یعنی اس دن کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی۔

جس طرح شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب نے حدیثِ نبوی پر اعتراض کیا ہے، اگر بعینہٖ یہ اعتراض کوئی منکرِ قرآن، قرآن کریم پر کر دے اور کہہ دے کہ: (نقلِ کفر، کفر نہ باشد!)

"سورۂ سجدہ بتاتی ہے کہ روزِ قیامت کی مقدار ہزار سال ہوگی، جبکہ سورۂ معارج میں پچاس ہزار سال کا ذکر ہے۔ یہ اختلاف متن پر راوی کی تہمت سے بچ اور نہیں کہا جا سکتا کہ

---

❶ صحیح بخاری کا مطالعہ: 1/55

❷ السجدہ 32: 5 ❸ المعارج 70: 4

دراصل رسول اللہ ﷺ کے پاس یہ وحی آئی تھی، ایک ہزار سال یا پچاس ہزار سال؟ صحابہ کرام نے کبھی کچھ پوچھا یا کبھی کچھ۔۔۔" ①

تو اس طرح کا اعتراض کا منکرین حدیث کے پاس کیا جواب ہوگا؟ اگر وہ یہاں تاویل و تطبیق کی کوئی صورت نکالیں گے تو حدیث میں ایسا کیوں نہیں کرتے کہ وہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتی ہے؟ نبی اکرم ﷺ تو دینی معاملات میں اپنی خواہش سے بولتے ہی نہ تھے۔

قارئین کرام اللہ کے لیے غور کریں اور بتائیں کہ کیا قرآن پاک پر اس بے وقوفانہ اعتراض سے اس کتاب ذی شان کی عظمت میں ذرا برابر بھی کوئی شبہ پیدا ہوتا ہے؟ یقیناً ہر مسلمان کا جواب نفی میں ہوگا! پھر خود ہی غور کرلیں کہ حدیث پر اس طرح کے اعتراضات کیا حیثیت رکھتے ہیں؟

سیدھی سی بات ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے یہ بات تو ایک ہی یہودی نے کی تھی، لیکن اس ایک یہودی کی یہ بات سب یہودی کی نمائندگی تھی یعنی اس نے تمام یہود کی طرف سے یہ بات پیش کی تھی اور ادنیٰ سا شعور رکھنے والا آدمی بھی اس بات کو سمجھتا ہے کہ کسی قوم کا نمائندہ اگر کوئی بات کرتا ہے تو وہ ساری قوم کی بات شمار ہوتی ہے اور اسے پوری قوم کی بات قرار دیا جاتا ہے۔

اتنی سی بات بھی جس آدمی کی سمجھ میں نہیں آسکی، وہ لگا ہے پوری امت کے اتفاقی فیصلے صحیح بخاری پہ اعتراض کرنے!!!

کیا یہ حدیث قرآن کریم میں بے ربطی کا موجب ہے؟

"رہا اس حدیث کا مضمون، جسے طارق بن شہاب، قبیصہ بن ذؤیب اور محمد بن کعب القرظی نے حضرت عمر اور یہودی کے مکالمے کے طور پر اور عمار بن ابی عمار نے حضرت ابن عباس اور یہودی کے مکالمے کے طور پر نقل کیا ہے تو یہ سراسر باطل اور اس المناک حقیقت کی دلیل

---

① الشعب: ۲/۵۲

ہے کہ ان راویوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ﴾ کو اس کے سیاق و سباق کے ساتھ مطالعہ کرنے اور اس آیت کو سمجھنے کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں دیا تھا، جس میں یہ ارشاد مذکور ہے۔

یہ ارشاد کوئی مستقل آیت نہیں ہے، بلکہ ایک آیت کے درمیان کا ٹکڑا ہے۔۔۔ سورۂ مائدہ کے نزول کا آغاز سن ہجری میں عمرۃ القضاء سے پہلے ہوا تھا۔ اس کے آغاز میں اہل ایمان کو خطاب کر کے ان معاہدوں کو وفا کرنے کا حکم دیا ہے جو حضور اکرم ﷺ نے مختلف قبائل عرب سے کیے تھے، خصوصاً ناجنگی کا وہ دس سالہ معاہدہ، جو سن ۶ ہجری میں بمقام حدیبیہ مشرکین مکہ سے ان ہی کی پیش کردہ شرائط پر منعقد فرمایا تھا۔ اس حکم کی وجہ یہ تھی کہ فتح خیبر کے بعد بحمد اللہ مسلمانوں کو زبردست قوت و شوکت حاصل ہو چکی تھی اور ممکن تھا کہ اس قوت و شوکت کے پیش نظر مسلمانوں کو یہ خیال ہونے لگے کہ وہ معاہدے اس وقت کے تھے، جب ہم اتنے قوی و زور آور نہ تھے۔ اب کیا ضرورت ہے کہ ہم ان سیاسی مصلحتوں پر مبنی معاہدوں کا لحاظ رکھیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد نے اس متوقع وسوسہ کو سر اٹھانے سے پہلے ہی کچل دیا۔۔۔" [1]

تبصرہ

ہم نے، بلکہ پوری امت مسلمہ نے جس روایت کی بنا پر اس آیت کریمہ کا محل نزول مقام عرفہ قرار دیا ہے، سب مسلمانوں کے برعکس اس کی صحت پر تو میرٹھی صاحب کو اعتراض ہے، لیکن افسوس ہے کہ میرٹھی صاحب نے اپنے اس دعویٰ پر کوئی دلیل پیش نہیں کی کہ یہ آیت کریمہ سن ہجری میں عمرۃ القضاء سے پہلے نازل ہوئی۔

میرٹھی صاحب کے ہم نواؤں کو چاہیے کہ ذرا اس پر "بے غبار" نہ سہی کوئی "غبار دار" مستند ہی

---

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۵۸ - ۵۹

پیش کر دیں!!!

آخر میرٹھی صاحب نے کونسا کشف لگایا ہے کہ اجماع امت کے خلاف بغیر دلیل کے ان کو ۶ ہجری میں اس کا نزول نظر آ گیا ہے؟ حالانکہ یہ لوگ کسی ایک مسلمان مفسر سے بھی یہ بات ثابت نہیں کر سکتے کہ اس نے عمرۃ القضاء سے پہلے سورۂ مائدہ کے نزول کا دعویٰ کیا ہو۔

اس کے برعکس اس طرح کی ایک روایت ذکر کرنے کے بعد علامہ قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وروی أنها نزلت منصرف رسول الله من الحديبية ، وذكر النقاش عن أبي سلمة ... قال ابن العربي : هذا حديث موضوع ، لا يحل لمسلم اعتقاده ...

"ایک روایت یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ سورت رسول اللہ ﷺ کے حدیبیہ سے واپس آنے کے وقت نازل ہوئی۔ نقاش نے ابو سلمہ سے ذکر کیا ہے۔۔۔ علامہ ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث "موضوع" (من گھڑت) ہے۔ کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ اس (کی صحت) کا اعتقاد رکھے۔" [1]

مفسر ابن عطیہ اندلسی لکھتے ہیں:

وهذا عندي لا يشبه كلام النبي صلى الله عليه وسلم ، ومن هذه السورة ما نزل في حجة الوداع ، ومنها ما نزل عام الفتح ...

"میرے نزدیک یہ (من گھڑت روایت) نبی کریم ﷺ کی کلام مبارک سے ملتی جلتی بھی نہیں۔ (بلکہ اس کے برعکس) اس سورت کا بعض حصہ حجۃ الوداع میں نازل ہوا اور بعض حصہ فتح مکہ کے موقع پر نازل ہوا تھا۔۔۔" [2]

---

[1] الجامع لأحكام القرآن للقرطبي ، ٦/٣٠ [2] (المحرر الوجيز لابن عطية : ١٦٧/٦)

لیجیے یہ ہے انکارِ حدیث کا نتیجہ ہے غیر کرامت۔ کہ قرآنی فیصلہ صحت کو چھوڑا اور ہاتھ میں وہ روایت آئی، جسے ائمہ مسلمین من گھڑت اور خود ساختہ قرار دے رہے ہیں اور جس کے الفاظ ہی ایسے ہیں کہ وہ رسول کریم ﷺ کی فصیح و بلیغ زبان سے ادا ہونا ہی ممکن نہیں ہیں۔

پھر برقی صاحب کا یہ قول بھی بالکل غلط ہے کہ اس سورت کے آغاز میں ان معاہدوں کو وفا کرنے کا حکم ہے، جو مسلمانوں نے مختلف قبائل عرب سے کیے تھے، خصوصاً معاہدۂ حدیبیہ، حالانکہ کسی مفسر نے اس سورت کے شانِ نزول کے بیان میں معاہدۂ حدیبیہ کا ذکر تک نہیں کیا۔ یہ بات چودہ سو سال بعد صرف برقی صاحب کو سوجھی ہے۔

اس کے برعکس اس سورت کے شروع میں جن "عقود" (عہدوں) کو وفا کرنے کا ذکر ہے، ان کے بارے میں امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وأولى الأقوال عندنا بالصواب ... وأن معناه أوفوا - يا أيها الذين آمنوا - بعقود الله التي أوجبها عليكم، وعقدها فيما أحل لكم وحرم عليكم، وألزمكم فرضه، وبين لكم حدوده، وإنما قلنا ذلك أولى بالصواب من غيره من الأقوال، لأن الله عز وجل أتبع ذلك البيان عما أحل لعباده وحرم عليهم، وما أوجب عليهم من فرائضه، فكان معلوما بذلك أن قوله: ﴿أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ أمر منه عباده بالعمل بما ألزمهم من فرائضه وعقوده عقيب ذلك، ونهي منه لهم عن نقض ما عقده عليهم منه.

"سب اقوال میں سے ہمارے نزدیک راجح یہ ہے۔۔۔ اور اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اے ایمان والو! عقود یعنی وہ جو اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کیے ہیں، حلت و حرمت میں جو قیود تم پر لگائی ہیں، جو فرض تم پر عائد کیے ہیں اور جو حدود تمہارے لیے بیان کی ہیں۔ ہم نے اسے دوسرے اقوال کی نسبت قرین صواب اس لیے قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد جو

بعد واسا پر حلال و حرام کی کئی چیزیں بیان کی ہیں جو اپنے عائد کیے ہوئے فرائض ذکر کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ (اے ایمان والو! تم اپنے عہدوں کو نبھاؤ) اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بندوں کو حکم ہے کہ وہ اس کے ان فرائض و عقود کو پورا کریں جو اس حکم کے فوراً بعد بیان ہوئے ہیں اور یہ اللہ کی طرف سے اپنے مقرر کیے ہوئے فرائض کو پامال کرنے کی ممانعت ہے۔۔۔'' ❶

میرٹھی صاحب جو ''سیاق و سباق'' کی بہت رٹ لگاتے ہیں، ان کو امام طبری رحمہ اللہ کا بیان کردہ یہ فی الواقع سیاق و سباق سمجھ نہیں آیا کہ عقود کو پورا کرنے کا جو حکم اس سورت کے شروع میں دیا گیا ہے، اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے حقوق و فرائض کی پابندی ہے، کیونکہ ساتھ ہی تو حلت و حرمت کا ذکر آ رہا ہے۔

اہلِ حدیث پر سیاق و سباق کو نہ سمجھ سکنے کا الزام رکھنے والے میرٹھی صاحب کی اپنی عقل یہاں پر بالکل عنقا ہو گئی ہے اور مفسرین کا بیان کردہ سیاق و سباق بھی ان کے ناقص عقل میں نہیں سما سکا اور انہوں نے ایسی بے بنیاد بات کہہ دی ہے، جو آج تک کسی مسلمان مفسر نے نہیں کہی، بلکہ ایسا کہنا ان کے نزدیک جائز ہی نہیں، جیسا کہ ہم مفسر ابن عطیہ کے بقول ذکر کر چکے ہیں!!!

آپ دیکھ چکے ہیں کہ مفسرین کرام کے مطابق اس سورت کا کچھ حصہ حجۃ الوداع کے موقع پر اور کچھ حصہ فتح مکہ کے موقع پر نازل ہوا، لیکن لغتِ عرب، قرآن کریم اور علم حدیث و تفسیر سے بالکل عاری اور تمام سلف صالحین کی مخالفت کرنے والے شخص کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ سورت عمرۃ القضاء سے پہلے ۷ ہجری میں نازل ہوئی۔ اب فیصلہ آپ پر ہے کہ آپ کس کی بات مانیں گے؟

---

❶ تفسیر الطبری: ۹/۴۵۵

کیا آیتِ تکمیلِ دین عمرۃ القضاء کے زمانہ میں نازل ہوئی؟

"یہ تیسری آیت ہے، اسی کے ضمن میں اپنی یہ نعمت یاد دلائی کہ مشرکین کو دینِ اسلام سے مرتد کرنے کی جو آس لگی ہوئی تھی، وہ اب تم توڑ چکی ہے اور اصول و فروع کے لحاظ سے تمہارا دین اپنے کمال کو پہنچ چکا ہے۔ اس طرح تم پر اللہ کا یہ انعام پورا ہو چکا ہے۔ اب تمہیں اس پورے دین کے تحت زندگی گزارنا اور ہمیشہ اپنے رب کا فرمانبردار رہنا ہے۔ یہی روش تمہارے لیے پسندیدہ ہے۔ اس جملۂ معترضہ کے بعد مضمون بالا کا تتمہ ارشاد ہوتا ہے کہ یہ جانور، جن کا گوشت کھانا تمہیں حرام ہے، بحالتِ اضطرار میں بقدرِ ضرورت ان کا گوشت تناول کر لینے کی رخصت ہے۔۔۔

یہ تمام آیات یکسر ہی سلسلہ کی ہیں اور ان کا نزول اس وقت ہوا ہے، جب رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ عمرۃ القضاء کے لیے تشریف لے جانے والے تھے۔ جب حقیقت یہ ہے تو اس بے ہودہ ہوائی کی کیا تک ہے کہ ﴿ اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ... ﴾ کا نزول سن 10 ہجری میں نویں ذی الحجہ کو عرفات میں ہوا تھا۔ طارق بن شہاب یہودی کی کہانی، ابن زبیر، محمد بن کعب قرظی کی ذکر کردہ کہانی بھی قطعاً غلط ہے اور عمار بن ابی عمار کی بیان کردہ کہانی بھی باطل ہے۔ نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات کہی تھی، نہ حضرت ابن عباس نے۔ بلکہ یہ تو راویوں نے نہ معلوم کس سے سنی ہوئی یہ غلط کہانی تو روایت کر ڈالی اور یہ نہ سوچا کہ اس سے لازم آتا ہے کہ تقریباً تین سال تک مسلمان اس آیت کو ناقص پڑھتے رہے ہوں۔۔۔

کیونکہ ان راویوں کے بقول ﴿ اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ... ﴾ کا نزول ہوا ہی نہ تھا اور اسی ناقص صورت میں لکھنے والوں نے یہ آیت لکھی ہو، پھر نویں ذی الحجہ کو رسول اللہ ﷺ

نے انہیں بتایا ہو کہ ان آیت کے درمیان میں یہ نشاندہی کر لو اور ایسا ہوا ہوتا تو ضرور منقول ہوتا۔ حالانکہ صحیح تو کیا، کسی ضعیف روایت میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ نیز یہ کہ ان دونوں نے یہ بھی بتا دیا کہ اسی آیت میں ﴿ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ ﴾ سے پہلے متصل ﴿الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ﴾ آیت ہے اور دونوں آیات مختلف ہیں۔ جب ارشاد اول یعنی ﴿ الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ﴾ سن ۸ ہجری میں نازل ہوا ہے تو ارشادِ ثانی یعنی ﴿ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ ... ﴾ کو سن ۱۰ ہجری میں نازل شدہ قرار دینے کی کیا تک ہے؟ ❶

تبصرہ (۱) قارئین کرام ذرا برقی صاحب کی دیدہ دلیری ملاحظہ فرمائیے کہ سلف صالحین کے خلاف نئی بے تکی تفسیر کو "جملہ معترضہ" کا سہارا دے کر صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جب امت کی طرف سے کوئی اتفاقی تفسیر ملی، ان کو اس میں عیب نظر آیا ہے کہ اس سے تمام آیات میں ربط ہی نہیں رہتا!

تیری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو میرے نامۂ سیاہ میں تھی

حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ عقود کو پورا کرنے کا حکم دینے کے بعد حلت و حرمت کا ذکر جملہ معترضہ نہیں، بلکہ پچھلی بات کا ہی تسلسل ہے، یعنی ان عقود کی تفصیل جو محکم تھا، اب انہی کو بیان کیا جا رہا ہے۔

مشہور مفسر علامہ فخرالدین رازی (م ۶۰۶ھ) لکھتے ہیں:

إعلم أنه تعالى لما قرر بالآية الأولى على جميع المكلفين أنه يلزمهم

---

❶ [illegible]، ص: ۲۹۵/۲۹۶

الانقیاد لجمیع تکالیف اللّٰہ تعالٰی، وذلک کالأصل الکلّی والقاعدۃ الجملیۃ، شرع بعد ذلک فی ذکر التکالیف المفصّلۃ، فبدأ بذکر ما یحلّ وما یحرم من المطعومات، فقال: ﴿أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ﴾ (المائدۃ: ۱/۵).

”یعنی جب اللہ تعالیٰ نے آیت کے پہلے ٹکڑے کے ساتھ تمام مکلفین پر ایک کلی اصول اور بہترین قاعدہ دے دیا ہے کہ تمام احکام تکلیفیہ کی پیروی لازم ہے تو اب ان احکام تکلیفیہ کی تفصیل بیان کرنا شروع کی ہے۔ ابتدا کھانے کی چیزوں میں سے حلال وحرام کے ذکر سے کی ہے چنانچہ فرمایا: ﴿أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ﴾ (المائدۃ: ۱/۵) (تمہارے لیے چوپائے حلال کر دیے گئے ہیں)۔“ ❶

علامہ آلوسی (م ۱۲۷۰ھ) بھی لکھتے ہیں:

﴿أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ﴾ (المائدۃ: ۱/۵) شروع فی تفصیل الأحکام التی أمر بوفائها، وبدأ سبحانه بذلک، لأنه یتعلّق بضروریات المعاش ...

”﴿أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ﴾ (المائدۃ: ۱/۵) (تمہارے لیے چوپائے حلال کر دیے گئے ہیں) یہاں احکام کی تفصیل کی ابتدا ہے، جن کے ایفاء کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ابتدا اس لیے کی ہے کہ یہ معاشی ضروریات کے متعلق ہے۔“ ❷

معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے امت مسلمہ کی متفقہ تفسیر کو پیٹھ سے لگایا ہے ان کا ”جملہ معترضہ“ کہہ کر جان چھڑانے کی ضرورت نہیں پڑی، بلکہ ان کے نزدیک یہ الفاظ آیت کے پہلے ٹکڑے سے بالکل مربوط ہیں۔

---

❶ تفسیر الکبیر للرازی: ۹۷/۱۱

❷ روح المعانی للآلوسی: [illegible]

اب کوئی میرٹھی صاحب کے معتقدین سے پوچھے کہ کیا اس آیت میں ان کو ایک ہی آیت کے دو ٹکڑوں کی بے ربطی نظر نہیں آئی؟ کیا وہ اب بھی امت مسلمہ کی اتفاقی تفسیر کے خلاف میرٹھی صاحب کی اس بے تکی تفسیر کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں؟

(۲) ہم گزشتہ صفحات میں تفصیلاً بیان کر چکے ہیں کہ اس آیت کے نزول کا وقت عمرۃ القضاء سے پہلے ہونے کا دعویٰ کرنا آزری کی خودسری اور علم تفسیر سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ کسی ایک مسلمان مفسر نے چودہ سو سال کے عرصے میں آج تک یہ دعویٰ نہیں کیا، نہ تو میرٹھی صاحب اور ان کے معتقدین کے پاس اس بات پر کوئی دلیل ہے۔ لہٰذا آیت کے نامنسوخ ہونے کو بنیاد بنا کر صحیح بخاری پر یہ اعتراض اور راویان حدیث، خصوصاً صحابیٔ رسول سیدنا طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ کے خلاف یہ جسارت بالکل فضول ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کو نہ سمجھا تھا۔ یہ تو خود میرٹھی صاحب کی کج علمی، کم عقلی اور فہم قرآن سے دوری ہے کہ آیات قرآنیہ کا صحیح وقت نزول اور صحیح تفسیر ان کی سمجھ میں نہیں آسکی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پانچواں باب

سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کی منقبت میں

حدیث عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

آپ ﷺ کو خوش کر دیا۔" ❶

لیکن بعض لوگوں کو صحابہ کرامؓ کی منقبت سے چڑ ہوتی ہے۔ اور وہ ایسی احادیث پر زبان طعن کو دراز کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

آیئے امت کے اس اتفاقی فیصلے پر شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب کی طرف سے کیے گئے اعتراضات کا جائزہ لیتے ہوئے فیصلہ کریں کہ حق پر کون ہے، پوری امت مسلمہ یا اکیلے میرٹھی صاحب؟

فصلِ اوّل: فنی اعتراضات کا جائزہ

صحابیٔ رسول سیدنا طارق بن شہاب پر دروغ بافی کا الزام!

"یہ طارق بن شہاب کی ہی دروغ بافی ہے اور سخت حیرت و افسوس ہے کہ امام بخاری تک بھی کسی راوی نے اس پر غور نہیں کیا اور امام بخاری نے بھی اس جھوٹی روایت کو درج صحیح کر دیا۔" ❷

ہم سابقہ حدیث کے دفاع میں بالتفصیل یہ ذکر کر چکے ہیں کہ سیدنا طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ صحابیٔ رسول ہیں، لہٰذا آپ نے صحابیٔ رسول کو بار بار "دروغ باف" کہہ کر ان کی گستاخی کی ہے اور اس ارتکاب سے میرٹھی صاحب نے اپنی عاقبت گنوانے کے سوا کچھ فائدہ حاصل نہیں کیا۔

میرٹھی صاحب امام بخاری رحمہ اللہ اور دوسرے راویانِ حدیث پر افسوس کر رہے ہیں تو

❶ صحیح بخاری، ج ۲، ص ۳
❷ صحیح بخاری کا مطالعہ، ج ۲، ص ۲۰

درحقیقت ’’چور بھی کہے چور چور‘‘ کے مصداق بنتے ہیں۔ اب میرٹھی صاحب کے معتقدین کو ان کی عقل پر انتہائی افسوس کرنا چاہیے کہ انھوں نے اپنی کم علمی کی وجہ سے صحابہ کرام اور ثقہ و معتبر محدثین کرام پر ناحق زبان درازی کرکے اپنے ہی ایمان کا نقصان کر لیا ہے۔

فصلِ ثانی: عقلی اعتراضات کا جائزہ

پانچ برس بعد نازل ہونے والے قصہ کا علم صحابہ کرام کو کیسے ہوا؟

’’یہ حدیث روایت کرکے طارق بن شہاب نے حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کی منقبت بیان کی تھی، لیکن حضرت مقداد کی جلالتِ قدر اس جھوٹی منقبت کی محتاج نہ تھی۔ میں اسے جھوٹی منقبت اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بنی اسرائیل کا یہ واقعہ۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ میں ذکر فرمایا ہے۔ اسی سے حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام اور بعد کے مسلمانوں کو یہ واقعہ معلوم ہوا ہے اور بلاشبہ سورۃ المائدہ جنگِ بدر کے تقریباً ۵ برس بعد نازل ہوئی ہے۔ پھر ۲ ہجری میں مقداد بن اسود کو قرآن کا بیان فرمودہ قصہ قرآن کے الفاظ میں کیسے معلوم ہو سکتا تھا اور وہ اپنی اور مسلمانوں کی وفاداری و جاں نثاری کا ذکر کرتے ہوئے اس قصہ کا حوالہ کیسے دے سکتے تھے۔ [illegible] حضرت مقداد بن اسود [illegible]‘‘ ❶

جواب: میرٹھی صاحب کی [illegible]

[illegible]

---

❶ [illegible]

ثابت کر دے، پھر صحیح بخاری پر اعتراض کرے!

اگر اسے مان بھی لیا جائے تو بھی کوئی اعتراض والی بات نہیں، کیونکہ جب باتفاقِ مفسرین مکی سورتوں میں مدنی آیت اور مدنی سورتوں میں مکی آیات ہو سکتی ہیں تو پھر ایک مدنی سورت میں جنگِ بدر سے پہلے اور ۵ برس بعد والی آیات کیوں نہیں ہو سکتیں؟ قرآن کریم کا نزول قریباً تیئیس برس میں مکمل ہوا ہے اور بہت سی سورتیں ایسی بھی ہیں، جن کا نزول کئی کئی برس تک ہوتا رہا ہے۔

اگر بغیر دلیل کے یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ سورت جنگِ بدر کے ۵ برس بعد نازل ہوئی ہے تو بہت سے تاریخی واقعات ایسے بھی تھے، جن کا ذکر قرآن کریم نے کیا تھا، لیکن وہ پہلے بھی زبان زدِ عام تھے، مثلاً اصحاب الفیل کا واقعہ سب عربوں کے علم میں تھا اور قرآن کریم نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح کیا یہ ناممکن بات ہے کہ یہ واقعہ بھی تاریخی حوالے سے لوگوں کو پہلے ہی معلوم ہو اور سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے اس کا ذکر کیا ہو اور اصحابِ موسیٰ کا مقولہ جن الفاظ سے عربوں میں معروف تھا، اللہ تعالیٰ نے انھی الفاظ کے ساتھ اسے نقل کر دیا ہو؟

کیا میرٹھی صاحب کے معتقدین کو اس بات سے انکار ہے کہ اصحاب الفیل کا واقعہ قرآن کریم کے نزول سے پہلے بھی لوگوں کو معلوم تھا؟

اب تو قارئین کرام، خصوصاً شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب کے معتقدین کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس حدیث کو "جھوٹی روایت" کہنا خود میرٹھی صاحب کا بدترین ۔۔۔ ہے۔

ہمارے اس منصفانہ تجزیے سے یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ امتِ مسلمہ کے اتفاق کو ٹھکرانے والا شخص لاکھ عقلی دعووں کے باوجود عقلی میدان میں تہی ہوتا ہے، کیونکہ عقل مندی اجماعِ امت کو تسلیم کر لینے میں ہی تو ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چھٹا باب

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ

حدیثِ صلح حدیبیہ

آپ گزشتہ اوراق، بالخصوص مقدمہ سیرت کے مطالعے سے بخوبی یہ جان چکے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں گستاخی شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب کی مرغوب عادت ہے، جسے وہ بہانے بہانے سے پورا کرتے رہتے ہیں۔ بات یہیں نہیں رکتی، بلکہ اگر کوئی روایت کسی صحابی کی شان بیان کر رہی ہو تو ان کی طبیعت خراب ہونے لگتی ہے اور وہ اس میں کوئی اعتراض کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔

صحیح بخاری کی زیر بحث حدیث (۲۶۹۹، ۴۲۵۱) میں تین باتیں بیان ہوئی ہیں:

① صلح حدیبیہ کا قصہ

② رسول اللہ ﷺ کی مکہ سے واپسی کے وقت سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی بچی کا چچا چچا پکارتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے لگنا اور پھر اس کی کفالت میں اختلاف کا پیش آنا۔

③ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا آپ ﷺ سے سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی بچی سے نکاح کے بارے میں رائے معلوم کرنا اور آپ ﷺ کا رضاعی بھائی کی بیٹی ہونے کی وجہ سے نکاح سے انکار کر دینا۔

بات یہیں تک ہوتی تو شاید میرٹھی صاحب کو ہضم ہو جاتی، لیکن ہوا یوں کہ اس حدیث میں تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت و منقبت بیان ہوئی ہے۔

① سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أنت مني وأنا منك))

اثر پڑتا تھا اور وہ اس کے عقیدت مند بن جاتے تھے، لیکن شیعی فکر و نظر کا حامل اور اس میں غلو و کج روی میں مبتلا تھا۔ یعقوب بن سفیان نے اس کے متعلق کہا ہے: شيعي ، وإن قال قائل : رافضي ، لم أنكر عليه ، وهو منكر الحديث . (وہ شیعی ہے اور اگر کوئی اسے رافضی بتائے تو میں اس کی تردید نہ کروں گا اور وہ غلط بیان شخص ہے)۔ ابو اسحاق جوزجانی کا قول ہے عبید اللہ بن موسیٰ أغلى وأسوأ مذهبا وأروى للعجائب . (عبید اللہ مسلک کے لحاظ سے بہت برا اور غلو کار اور عجیب، یعنی غیر معقول روایات کو کثرت سے بیان کرنے والا ہے)۔ حافظ ابو مسلم بغدادی نے کہا ہے: عبيد الله بن موسى من المتروكين ، تركه أحمد لتشيعه . (عبید اللہ ان راویوں میں سے ہے جن کی بیان کردہ حدیثوں کو اہل حق نے بیان کرنا چھوڑ دیا ہے، امام احمد نے اس کے غالی شیعہ یعنی رافضی ہونے کی وجہ سے اسے چھوڑ دیا ہے، یعنی اس کی روایات کرنا قابل قبول قرار دے دیا تھا)۔ ساجی کی تحقیق یہ ہے: عبيد الله صدوق ، كان يفرط في التشيع .

امام بخاری اوراوائل طلب میں اس کے پاس گئے اور اس سے حدیثیں سنیں اور یاد کی تھیں۔ اس کے زہد و تعبد اور کثرت روایات سے بخاری بھی فریب کھا گئے۔ یہ حدیث عبید اللہ بن موسیٰ نے بخاری کو سکھلیں اور عیاری کے ساتھ سنائی تھی کہ بخاری اسے براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث صحیح گمان کر بیٹھے اور اپنی کتاب میں اسے ثبت کرنے کی غلطی کر گزرے۔" ❶

جواب: قارئین! شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب کا عبید اللہ بن موسیٰ العبسی پر یہ جرح نقل کرنا ان کی اصول حدیث اور علم رجال سے ناواقفیت کی روشن دلیل ہے، کیونکہ

---

❶ صحیح بخاری کا مطالعہ: ۲/ ۹۹

عبیداللہ بن موسیٰ ثقہ ہیں

عبیداللہ بن موسیٰ کو بہت سے محدثین نے ثقہ و معتبر قرار دیا ہے، جن کا ذکر مع مختصر سا سبب "روایت" سے کام لیتے ہوئے ذکر کئے ہیں آپ بھی ملاحظہ فرمائیں

(1) امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ (۱۵۸-۲۳۳ھ) کی اقوال میں ہے کہ یہ ثقہ راوی تھے۔ ❶

(2) امام ابو حاتم رحمہ اللہ (۱۹۵-۲۷۷ھ) ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

صدوق، كوفي، حسن الحديث، وأبو نعيم أتقن منه، وعبيد الله أثبتهم في إسرائيل، وهو ثقة...

"یہ سچے آدمی تھے، کوفہ کے رہائشی تھے، ان کی حدیث (فن نظم) حسن ہوتی ہے۔ ابو نعیم ان سے پختہ تھے، لیکن اسرائیل سے بیان کرنے میں تو عبیداللہ سب سے بڑھ کر معتبر ہوتے ہیں، وہ ثقہ راوی ہیں۔" ❷

(3) امام احمد بن عبداللہ العجلی رحمہ اللہ (۱۸۱-۲۶۱ھ) فرماتے ہیں:

كوفي، ثقة، عالم بالقرآن، صدوق.

"یہ کوفے کے رہنے والے ثقہ تھے قرآن کریم کے عالم اور سچے تھے۔" ❸

(4) امام ابن سعد رحمہ اللہ (۱۶۸-۲۳۰ھ) لکھتے ہیں:

وكان ثقة، صدوقا، إن شاء الله...

"وہ ثقہ اور سچے تھے ان شاء اللہ" ❹

---

❶ الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم ۵/۳۳۴ وسندہ صحیح

❷ الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم ۵/۳۳۴ وسندہ صحیح

❸ تاریخ الثقات للعجلی ص ۳۲۰

❹ الطبقات الکبریٰ لابن سعد ۶/۴۰۰

⑤ امام عمر بن احمد، ابن شاہین رحمہ اللہ (۲۹۷۔۳۸۵ھ) فرماتے ہیں:

صدوق، ثقة، وكان يضطرب في حديثه عن سفيان اضطرابا قبيحا.

"وہ صدوق اور ثقہ تھے، البتہ سفیان (ثوری) کی احادیث میں سخت اضطراب میں پڑتے تھے۔" ❶

⑥ امام ابن حبان رحمہ اللہ (م ۳۵۴ھ) بھی ان کو ثقہ قرار دیتے ہیں۔ ❷

⑦،⑧ امام بخاری رحمہ اللہ (۱۹۴۔۲۵۶ھ) اور امام مسلم رحمہ اللہ (۲۰۴۔۲۶۱ھ) کا ان سے روایات بیان کرنا ان دونوں کے نزدیک عبید اللہ بن موسیٰ کے ثقہ ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ انہوں نے صحت کی شرط کو ملحوظ رکھا ہے۔

⑨ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ (۲۲۳۔۳۱۱ھ) نے بھی اپنی کتاب میں صحت کی شرط لگائی ہے اور عبید اللہ بن موسیٰ سے کثرت کے ساتھ روایات بیان کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ ان کے نزدیک بھی ثقہ ہیں۔

⑩ امام ابن الجارود رحمہ اللہ (م ۳۰۷ھ) نے اپنی بھی کتاب المنتقیٰ میں ان سے کئی ایک مقامات پر روایت لے کر ان کی توثیق کی ہے، کیونکہ انہوں نے بھی اپنی کتاب میں صحت کی شرط رکھی ہے۔

تلك عشرة كاملة!

ان کے علاوہ [illegible] صحاح ستہ کے تمام محدثین [illegible] صحیح بخاری [illegible] صحت پر متفق ہیں۔ عبید اللہ بن موسیٰ العبسی کی ثقاہت پر [illegible] دلیل ہے۔

پھر توثیق [illegible] ان سب اقوال [illegible] تقریب [illegible] عسقلانی رحمہ اللہ نے عبید اللہ

❶ [illegible]

❷ [illegible]

عداوة سببها الاختلاف في الاعتقاد، فإن الحاذق إذا تأمل ثلب أبي إسحاق الجوزجاني لأهل الكوفة رأى العجب، وذلك لشدة انحرافه في النصب وشهرة أهلها بالتشيع، فتراه لا يتوقف في من ذكره منهم بلسان ذلقة وعبارة طلقة، حتى إنه بلين مثل الأعمش وأبي نعيم وعبيد الله بن موسى وأساطين الحديث وأركان الرواية. فهذا إذا عارضه مثله أو أكبر منه، فوثق رجلا ضعفه قبل التوثيق...

"جن لوگوں کے جرح والے قول کو قبول کرنے میں توقف کرنا ضروری ہے، ان میں سے وہ شخص بھی ہے، جس کی مجروح راوی سے بسبب اختلافِ عقیدہ عداوت ہو، چنانچہ جب کوئی ماہر (رجال) آدمی ابو اسحاق جوزجانی کی اہل کوفہ کے خلاف جرح پر غور کرے گا، وہ عجیب طرز دیکھے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقیدۂ نصب (سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے عداوت) میں سخت انحراف کا شکار ہیں، جبکہ کوفہ والے تشیع (سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ محبت) میں مشہور ہیں، لہٰذا آپ دیکھیں گے کہ اہل کوفہ میں سے جس کو بھی ابو اسحاق جوزجانی نے ذکر کیا ہے، اس پر تیز زبان اور سخت عبارت کے ساتھ جرح کرنے میں توقف نہیں کیا، یہاں تک کہ وہ امام اعمش، ابو نعیم اور عبیداللہ بن موسیٰ (عبسی) جیسے حدیث کے پائے اور روایت کے ستونوں پر بھی جرح کرنا شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب جوزجانی کے مقابلے میں جب ان کا ہم پلہ امام یا ان سے بڑا امام اس آدمی کو ثقہ کہہ دے، جس کو جوزجانی نے ضعیف کہا ہو تو توثیق کو قبول کیا جائیگا۔" [1]

اسی طرح امام یعقوب بن سفیان الفسوی کا عبیداللہ بن موسیٰ کو رافضی کہنا [2]

---

[1] لسان المیزان لابن حجر: ١٦/١ [2] المعرفۃ والتاریخ: ٢٠٩/٣

"یہ تشیع میں بڑھے ہوئے تھے۔" ❶

اول تو اس کی کوئی سند ہمیں نہیں مل سکی، جس سے معلوم ہو کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کو امام ساجی کا یہ قول کس ذریعے سے پہنچا تھا؟

ثانیاً ان الفاظ سے پہلے امام ساجی کا عبید اللہ بن موسیٰ کو "صدوق" کہنا خود میرٹھی صاحب نقل کر چکے ہیں، لہٰذا اگر امام ساجی سے یہ قول ثابت ہو بھی جائے تو ان کے نزدیک تشیع میں بڑھے ہونے سے مراد رافضی ہونا اور حدیث میں غیر معتبر ہو جانا قطعاً نہیں ہو سکتا۔

متقدمین محدثین کے نزدیک بھی شیعیت میں غلو سے مراد رافضیت نہیں ہوتی، لہٰذا میرٹھی صاحب کا یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ غالی شیعہ رافضی ہوتا ہے، بلکہ جب متقدمین کسی راوی کے بارے میں غالی شیعہ کے الفاظ استعمال کریں تو اس سے مراد سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شان میں غلو کرتے ہوئے ان کا مقام و مرتبہ سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بڑھانا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مخالفین کو غلطی پر قرار دینا ہوتا ہے، جیسا کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس کی صراحت کی ہوئی ہے۔ ❷

کاش کہ میرٹھی صاحب اصولِ حدیث کا کچھ علم حاصل کر لیتے!

امام احمد رحمہ اللہ کا اس کے غالی شیعی "یعنی رافضی" ہونے کی وجہ سے اسے چھوڑ دینا بھی باسند ثابت نہیں ہے۔

[illegible] نے اس بات کا اہتمام کیا ہے؟ میرٹھی صاحب نے متقدمین [illegible] تلاش کرنے [illegible] کا جواب سوالِ حدیث سے [illegible] دے دیں کہ [illegible] تشیع [illegible] ہے، [illegible] ہم بھی [illegible] کہ ان کی غیر ثابت [illegible] کے خلاف امام احمد رحمہ اللہ نے یہ قول بالکل [illegible] ثابت کر [illegible]:

❶ [illegible]

❷ [illegible] الاعتدال [illegible]

ربما أخرجت عنه، وربما ضربت عليه، حدثت عن قوم غير ثقات، فإن كان من حديث الأعمش فهو ذاك.

"میں نے کبھی ان کی حدیث بیان کی ہے اور کبھی چھوڑ دی ہے۔ انھوں نے غیر ثقہ لوگوں سے احادیث بیان کی ہیں، مگر اعمش سے ان کی حدیث تو وہ اسی طرح (معتبر) ہو گی۔" [1]

معلوم ہوا کہ امام احمد رحمہ اللہ بھی عبیداللہ بن موسیٰ کو "ضعیف" نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ان کے شیعہ کی وجہ سے ان کی روایت چھوڑتے تھے یا ان کی ان روایات سے بچتے تھے، جو انھوں نے ثقہ راویوں سے بیان کی ہوتی تھیں۔

رہا میر تقی صاحب کا اپنی مطلب براری کرتے ہوئے "یعنی رافضی" کے الفاظ بڑھانا تو اس کا رد ہماری بیان کردہ اس روایت سے بخوبی ہو جاتا ہے، جس میں عبیداللہ بن موسیٰ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول روایت کر رہے ہیں۔

نیز ہم گزشتہ سطروں میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ اصولِ حدیث کے مطابق بھی متقدمین کی طرف سے غالی شیعہ کا معنی رافضی نہیں ہو سکتا۔

یہ ہے میر تقی صاحب کی اپنی علمی و مطالعاتی قابلیت اور وہ اعتراض کرتے ہیں امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ کی اس کتاب پر جسے پوری امت نے اتفاق کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔

صحیح بخاری پر اعتراض کرنے کی پاداش میں اتنی سبکی اور شرمندگی اٹھانے کے بعد میر تقی صاحب کے ہم نواؤں کو چاہیے کہ اب بھی تائب ہو جائیں اور آئندہ ایسی جسارت سے قیامت تک کے لیے بچیں اور سچی توبہ کریں۔ مگر وہ اس سے باز نہ آئیں گے تو محدثین کے حقیقی وارث اہل الحدیث ان کی تلبیسات اور جہالتوں کا تعاقب کرتے رہیں گے۔ ان شاء اللہ!

[1] سوالات المروذی: ۲۰۹

عبیداللہ بن موسیٰ پر "تدلیس" کا الزام، اور ثقہ راویوں پر ناحق زبان درازی!

"پس بخاری کی روایت کے مطابق عبیداللہ بن موسیٰ کی بیان کردہ یہ حدیث تین حصوں پر مشتمل ہے۔ (۱) صلح حدیبیہ کا قصہ (۲) جب حضور ﷺ مکہ سے روانہ ہوئے تو حمزہ کی بچی کا "یا عم، یا عم" پکارتے ہوئے آپ کے پیچھے لگ جانا۔ (۳) حضرت علی کا آپ سے درخواست کرنا کہ حمزہ کی بچی کو اپنی زوجیت میں لے لیں اور آپ کا یہ فرمانا کہ رضاعی رشتے سے میری بھتیجی ہونے کی وجہ سے وہ میرے لیے جائز نہیں ہے۔

عبیداللہ بن موسیٰ نے یہ تینوں حدیثیں بخاری کو ایک ہی سیاق و سند کے ساتھ سنائی تھیں، جس سے بخاری نے سمجھ لیا کہ تینوں قصوں پر مشتمل یہ ایک ہی حدیث ہے، جو براء بن عازب صحابی سے مروی ہے۔ اور امام بخاری کے علاوہ محمد بن سعد اور حافظ احمد بن حازم بن ابی غرزہ غفاری نے بھی عبیداللہ بن موسیٰ سے یہ حدیث روایت کی ہے، مگر ان دونوں کی روایت میں صلح حدیبیہ کا قصہ نہیں ہے۔۔۔

اور عبیداللہ بن موسیٰ کے علاوہ اسرائیل بن یونس سے یہ حدیث اسود بن عامر، یحییٰ بن آدم، حجاج بن محمد اور اسمٰعیل بن جعفر نے بھی روایت کی ہے۔ ان میں سے کسی کی روایت میں صلح حدیبیہ کا قصہ نہیں، صرف حمزہ کی بچی کا قصہ مذکور ہے۔۔۔

پس اسرائیل کے اس حدیث میں پانچ تلامذہ ہیں: ① اسود بن عامر ② یحییٰ بن آدم ③ حجاج بن محمد ④ اسمٰعیل بن جعفر اور ⑤ عبیداللہ بن موسیٰ۔

اوّل الذکر چار اشخاص کی روایت میں بس دختر حمزہ کا ذکر ہے، صلح حدیبیہ کا نہیں اور ان کی اسناد بتاتی ہے کہ ابو اسحاق کو دختر حمزہ کا یہ قصہ ہبیرہ بن یریم اور ہانی بن ہانی سے معلوم ہوا تھا اور یہ دونوں شخص غیر ثقہ، ضعیف و مجروح اور رافضی ہیں۔ دونوں نے متعدد اناپ شناپ

باتیں حضرت علی کی طرف منسوب کر کے لوگوں میں پھیلانے کا جرم کیا تھا۔ عبیداللہ بن موسیٰ نے اپنے رفض و بداعتقادی کو تہہ اور تقیہ کے ذریعہ چھپانے کی بلیغ کوشش کی تھی اور وہ اس بات سے واقف تھا کہ اہل علم ہبیرہ بن یریم اور ہانی بن ہانی کو غیر ثقہ سمجھتے ہیں مگر ان کی روایت میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی سے **انت منی وانا منک** (تو مجھ سے اور میں تجھ سے ہوں) فرمایا تھا۔ عبیداللہ نے اسے صحیح ثابت کرنے کی غرض سے دو طرح کی تلبیس کی تھی۔

ایک یہ کہ ہبیرہ اور ہانی کے ساتھ حضرت براء بن عازب کا بھی ذکر کر دیا۔ چنانچہ اس نے محمد بن سعد کو بھی بتایا تھا کہ ابو اسحاق نے یہ دختر حمزہ کا قصہ حضرت براء بن عازب سے بھی روایت کیا ہے اور ہبیرہ بن یریم اور ہانی سے بھی۔ ان دونوں (ہبیرہ و ہانی) نے حضرت علی سے۔ مقصد یہ تھا کہ ہبیرہ و ہانی کے ضعیف و غیر ثقہ ہونے کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ سمجھ کر کہ جو بات ان دو ضعیف شخصوں نے بیان کی ہے وہی حضرت براء بن عازب صحابی نے بھی بیان کی ہے۔ دوم یہ کہ اسناد سے ہبیرہ و ہانی کا نام ہی سرے سے حذف کر دیا۔ ابو اسحاق نے حضرت براء بن عازب سے صلح حدیبیہ کے متعلق جو حدیث روایت کی ہے اور ابو اسحاق نے ہبیرہ و ہانی سے دختر حمزہ کے متعلق جو حدیث روایت کی ہے دونوں کو ملا کر ایک حدیث براء بن عازب کی بیان کردہ حدیث بنا لیا۔ امام بخاری کو عبیداللہ نے یہی دھوکا دیا تھا۔

امام بخاری کے علم میں اسرائیل بن یونس کے دیگر تلامذہ کی روایات آئی ہوتیں تو شاید وہ یہ دھوکہ نہ کھاتے اور زکریا بن ابی زائدہ کی روایت نے تو عبیداللہ بن موسیٰ کی تلبیس کا پردہ چاک کر دیا ہے۔

یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ کہتے ہیں۔ **حدثنا ابی وغیرہ عن ابی اسحاق عن البراء بن عازب** ..... اس روایت سے روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ ابو اسحاق

نے دختر حمزہ کا قصہ ہبیرہ بن یریم وہانی بن ہانی سے سنا تھا نہ کہ براء بن عازب سے اور عبیداللہ بن موسیٰ عبسی نے فریب دینے کی خاطر جھوٹ بول کر اسے براء بن عازب کی طرف منسوب کر دیا تھا اور عبیداللہ بن موسیٰ کی بیان کردہ یہ حدیث صحیح بخاری میں جگہ پانے کے لائق نہ تھی۔" ❶

ازالہ ① میرٹھی صاحب کے اس دعویٰ کو آپ دوبارہ پڑھ لیں کہ اسرائیل کے اس حدیث میں پانچ اساتذہ ہیں اور اسرائیل بن یونس سے صلح حدیبیہ والا واقعہ صرف عبیداللہ بن موسیٰ نے بیان کیا ہے، کسی اور راوی نے نہیں۔

لیکن یہ دونوں باتیں خلاف حقیقت ہیں۔ پہلی بات یوں کہ اس حدیث میں اسرائیل کے صرف پانچ شاگرد نہیں ہیں، بلکہ میرٹھی صاحب اگر انکار حدیث کی عینک اتار کر کتب احادیث کا مطالعہ کرتے تو انہیں اسرائیل کے دو اور شاگرد یحییٰ بن مثنیٰ اور محمد بن یوسف فریابی، مسند احمد (۲۹۸/٤) اور سنن دارمی (۲۰۰۷) میں نظر آجاتے۔

دوسری بات کہ اسرائیل بن یونس سے صلح حدیبیہ والا قصہ صرف عبیداللہ بن موسیٰ نے بیان کیا ہے، یوں غلط ہے کہ مذکورہ دونوں شاگردوں، یحییٰ بن مثنیٰ اور محمد بن یوسف فریابی نے اسرائیل ابن یونس سے صلح حدیبیہ والا قصہ ہی بیان کیا ہے۔ اب تو کوئی شبہ نہیں رہا کہ میرٹھی صاحب کا عبیداللہ بن موسیٰ پر اعتراض بے جا ہے۔

اور یہاں ایک مزے کی بات آپ کو بتاتے چلیں کہ میرٹھی صاحب کو اس اعتراض کے بعد معلوم ہو گیا تھا کہ اسرائیل کے اس حدیث میں دو اور شاگرد بھی موجود ہیں اور وہ بھی صلح حدیبیہ والا قصہ بیان کرتے ہیں، جیسا کہ انہوں نے اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ❷

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۷۰-۱۷۱ ❷ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۷۲

لیکن افسوس کہ انہوں نے اپنی اس صریح غلطی کو جانتے بوجھتے برقرار رکھا ہے۔ اس سے رجوع کر کے اسے اپنی کتاب سے خارج کرنے کی ہمت نہیں کر سکے۔

④ میرٹھی صاحب کا ہبیرہ بن یریم اور ہانی بن ہانی کو غیر ثقہ، ضعیف اور مجروح قرار دینا بھی غلط ہے۔

ہبیرہ بن یریم ثقہ ہیں

ہبیرہ بن یریم کے بارے میں:

۱۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لا بأس بحديثه، هو أحسن استقامة من غيره.

"اس کی حدیث میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ اپنے علاوہ دوسرے راویوں سے بہتر استقامت والا ہے۔" ❶

۲۔ امام ابن عدی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وارجو انه لا بأس به.

"اور مجھے امید ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔" ❷

۳۔ امام عجلی رحمہ اللہ اسے ثقہ قرار دیتے ہیں۔ ❸

۴۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کی حدیث کو "حسن صحیح" کہا ہے جو کہ اصول محدثین کے مطابق اس کی توثیق کو متلزم ہے۔ ❹

---

❶ الجرح والتعديل لابن ابي حاتم: ۱۰۹/۹، وسنده صحيح

❷ الكامل في ضعفاء الرجال لابن عدي: ۱۳۲/۷

❸ معرفة الثقات للعجلي: ۱۸۸۰

❹ جامع ترمذي: ۲۷۹۵، ۲۸۰۸)

۵۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے بھی اسے اپنی کتاب الثقات میں ذکر کرکے ثقہ قرار دیا ہے۔ ❶

۶،۷۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے اس کی حدیث کو بخاری و مسلم کی شرط پر "صحیح" قرار دیا۔ ❷ نیز اس کی سند کو "صحیح" بھی کہا ہے۔ ❸ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

۸۔ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وھو ثقۃ. "وہ ثقہ ہیں۔" ❹

۹۔ سب اقوال کو مدنظر رکھ کر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا اس کے بارے میں فیصلہ یہ ہے کہ:

لا بأس به ، وقد عيب بالتشيع .

"اس میں کوئی حرج نہیں، اس پر شیعہ ہونے کا عیب بیان کیا گیا ہے۔" ❺

ہبیرہ بن یریم پر جرح کی حقیقت

یہ وضاحت تو ہم قارئین کرام کی نظر کر ہی چکے ہیں کہ محض شیعہ (سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی تفضیل کا قائل) ہونا محدثین کی نظر میں حدیث میں کسی ضعف کا سبب نہیں بنتا۔ عبدالرحمن بن یوسف بن خراش کا اس راوی کو "ضعیف" قرار دینا کوئی حیثیت نہیں رکھتا، کیونکہ ابن خراش خود رافضی خبیث تھا۔ ❻

---

❶ الثقات لابن حبان: ۵۹۸۹

❷ المستدرک للحاکم: ۴۷۲۳، ۸۰۰۳

❸ المستدرک للحاکم: ۴۶۱۴

❹ مجمع الزوائد: ۳/۸۰۱، ۵/۳۰۲، ۹/۲۰۲

❺ تقریب التہذیب لابن حجر: ۷۲۳۸

❻ لسان المیزان لابن حجر: ۲/۴۴۹

میرٹھی صاحب کے متقدمین کسی محدث سے ہبیرہ بن یریم کو "رافضی" کہنا ثابت نہیں کر سکتے!

اب قارئین کرام ہی بتائیں کہ اقوال محدثین سے بالکل بے خبر ہو کر ہبیرہ بن یریم کو بلا دلیل غیر ثقہ، ضعیف و مجروح اور رافضی کہنے والے میرٹھی صاحب کی بات مانی جائے گی یا اقوال محدثین کے مطابق فیصلہ کر کے ہبیرہ بن یریم کو قابل اعتبار کہنے والے، ماہر فن علامہ ذہبی رحمہ اللہ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی؟ فیصلہ خود کریں!

ہانی بن ہانی ثقہ راوی ہیں

ہانی بن ہانی کے بارے میں:

1. امام عجلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

کوفی، تابعی، ثقة.

"کوفہ کے رہنے والے تابعی ہیں۔ ثقہ (قابل اعتبار) آدمی تھے۔" ❶

2. امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کی حدیث کو "حسن صحیح" کہا ہے، جو کہ اصول محدثین کے مطابق اس کی توثیق کو مستلزم ہے۔ ❷

3. امام الضیاء المقدسی رحمہ اللہ نے بھی اس کی حدیث کو صحیح قرار دے کر اس کی توثیق کی ہے۔ ❸

4. امام ابن حبان رحمہ اللہ بھی اس کو ثقہ قرار دیتے ہیں۔ ❹

---

❶ معرفة الثقات: ۱۸۸۳ ❷ جامع الترمذي: ۳۷۹۸،۳۷۷۹

❸ الأحاديث المختارة للضياء المقدسي: ۷۹۱،۷۸۸

❹ الثقات لابن حبان: ۵۹۷۹

۶. امام حاکم رحمہ اللہ نے اس کی حدیث کو "صحیح الاسناد" قرار دیا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔ ❶

۷. علامہ ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وھو ثقۃ. "وہ ثقہ ہے" ❷

۸. علامہ ذہبی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی یہ راوی "حسن الحدیث" ہے۔ ❸

ہانی بن ہانی پر جرح کی حقیقت

امام ابن مدینی رحمہ اللہ کا اسے "مجہول" اور امام ابن سعد رحمہ اللہ کا اسے "منکر الحدیث" کہنا جمہور کی توثیق کے مقابلے میں قابل التفات نہیں ہے۔

آج تک کسی ناقد رجال محدث نے ہانی بن ہانی کو "رافضی" نہیں کہا۔ اگر میرٹھی صاحب کی کسی معتقد میں ہمت ہے تو آزمائے۔

اب قارئین کرام ہی بتائیں کہ راویان حدیث کے بارے میں بات ائمہ حدیث اور محدثین کی مانی جائے گی یا میرٹھی صاحب کی؟

ہم پوری وضاحت سے ثابت کر چکے ہیں کہ عبید اللہ بن موسیٰ کو رافضی و بدعقیدہ کہنا میرٹھی صاحب کی اپنی کم فہمی کی مثال ہے۔

نیز یہ بات بھی میرٹھی صاحب کے اعتراف کے ساتھ مکمل طور پر واضح ہو چکی ہے کہ صرف عبید اللہ بن موسیٰ نے ہی اس طرح روایت بیان نہیں کی، بلکہ دو اور راوی بھی صحیح حدیبیہ والا قصہ

---

❶ مستدرک حاکم مع تلخیص الذہبی: ۳/۱۴۳، ۴۷۲۸

❷ مجمع الزوائد: ۸/۱۰۲

❸ الکاشف للذہبی: ۵۹۲۸

اسرائیل سے بیان کرتے ہیں، لہذا انہیں عبداللہ بن موسیٰ کی تلبیس، دھوکا دہی اور عیاری کہنا بجائے خود میرٹھی صاحب کی اپنی کم علمی و کم ظرفی ہے!

زکریا بن ابی زائدہ کی اس روایت نے تو الٹا میرٹھی صاحب کی تلبیس کا پردہ چاک کیا ہے، کیونکہ انہوں نے ابواسحاق کی سند سے صلح حدیبیہ اور دختر حمزہ دونوں کا قصہ بیان کیا ہے اور وہ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے ہی بیان کر رہے ہیں۔ یہ تو اس بات کی زبردست دلیل ہے کہ اس پر عبیداللہ بن موسیٰ کی وجہ سے اعتراض کرنا انتہائی بے جا ہے اور عبیداللہ بن موسیٰ عبسی کی یہ حدیث صحیح بخاری میں جگہ پانے کے بالکل قابل تھی۔

ہاں! البتہ میرٹھی صاحب کی علمی قابلیت امت مسلمہ کے اتفاقی فیصلے صحیح بخاری پر اعتراض کرنے کے قابل نہیں تھی۔

ابواسحاق کے اختلاط کا اعتراض باطل تھا

سچ ہے کہ باطل ایک صورت میں قائم نہیں رہ سکتا، بلکہ ہمیشہ شکل بدلتا ہی رہتا ہے۔ میرٹھی صاحب نے ابواسحاق کی حدیث تحویل قبلہ پر ابواسحاق کے اختلاط کا اعتراض کیا تھا، لیکن اب اس کا نام تک نہیں لیا، بلکہ عبیداللہ بن موسیٰ، ہبیرہ بن یریم اور ہانی بن ہانی پر بلا دلیل طبع آزمائی کرکے اس حدیث کو "ضعیف" قرار دینے کی کوشش میں ہیں۔ حدیث تحویل قبلہ میں بھی ابواسحاق کے ایک شاگرد اسرائیل بن یونس تھے، جن کے بارے میں میرٹھی صاحب کا اصرار تھا کہ انہوں نے ابواسحاق سے اختلاط کے بعد احادیث سنی تھیں، لیکن ہم نے بفضل اللہ ایک درجن محدثین سے ان کا اختلاط سے قبل سننا ثابت کیا تھا۔ اب وہی اسرائیل یہاں بھی ابواسحاق سے بیان کرتے ہیں، مگر میرٹھی صاحب نے ان کا نام تک نہیں لیا۔ معلوم ہوا کہ میرٹھی صاحب کا وہ اعتراض بے بنیاد تھا۔ اگر ابواسحاق کے اختلاط والا اعتراض کوئی علمی حیثیت رکھتا ہوتا تو وہ یہاں

مزید لکھتے ہیں:

وعبد الله بن محمد بن سعيد بن أبي مريم هذا إما أن يكون مغفلا لا يدري ما يخرج من رأسه أو يتعمد، فإني رأيت له غير حديث مما لم أذكره أيضا ههنا غير محفوظ.

"یہ عبداللہ بن محمد بن سعید بن ابی مریم راوی یا تو غیر محتاط مغفل تھا کہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے سر سے کیا نکل رہا ہے یا پھر یہ جان بوجھ کر جھوٹ بولتا تھا، کیونکہ میں نے جو احادیث یہاں ذکر نہیں کیں، ان میں بھی اس کی کئی غیر محفوظ احادیث دیکھی ہیں۔" ❶

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وهو ضعيف جدًا "یہ سخت ضعیف راوی ہے۔" ❷

اس میں دوسری علت یہ ہے کہ ابو اسحاق السبیعی آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے، ان سے بیان کرنے والے راوی زکریا بن ابی زائدہ ہیں، جو کہ ان سے اختلاط کے بعد بیان کرتے ہیں۔

اور دوسری سند ❸ میں ان سے اختلاط سے پہلے بیان کرنے والے راوی اسرائیل ابن یونس روایت کرتے ہیں لیکن [illegible] ابو اسحاق "[illegible]" سے بیان کرتے ہیں اور [illegible] "[illegible]" کہتے ہیں۔

لہٰذا یہ واقعہ [illegible] سندوں سے [illegible] ہے۔ [illegible] والحمد لله!

❶ [illegible]

❷ [illegible]

❸ [illegible]

فصلِ ثانی: عقلی اعتراضات کا جائزہ

❁ عبید اللہ بن موسیٰ کی روایت اور صلح حدیبیہ والے سال مکہ میں قیام!

"اس حدیث کے متن کا جائزہ" کی سرخی جما کر میرٹھی صاحب لکھتے ہیں:

"عبید اللہ کی بیان کردہ حدیث تین قصوں پر مشتمل ہے۔

پہلا قصہ صلح حدیبیہ کا ہے، جو جھوٹ اور سچ اور صحیح و غلط کا ملغوبہ ہے۔ اس روایت میں جو کمیاں اور غلط بیانیاں ہیں، اس کے ترجمہ میں جگہ جگہ بین القوسین میں نے ان کی تصحیح کر دی ہے۔ ان غلط بیانیوں کی تفصیل یہ ہے:

(۱) عبید اللہ بن موسیٰ کی اس حدیث میں ہے: حتی قاضاهم علی أن یقیم بها ثلاثة أیام. اس سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ حدیبیہ میں کئی منت کے بعد نبی ﷺ نے اہل مکہ سے اسی سال کے لیے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کی بات طے کر لی تھی، بشرطیکہ تین دن سے زائد قیام نہ کریں۔ اور پرتلوں میں تلواروں کے علاوہ اور ہتھیار لے کر داخل نہ ہوں اور اہل مکہ میں سے کوئی ساتھ جانا چاہے تو اسے نہ روکیں۔ آپ نے یہ شرطیں منظور فرمائیں اور مع اصحاب مکہ تشریف لے گئے۔ تین دن مکہ میں رہے۔ اہل مکہ نے حضرت علی سے کہا کہ اپنے صاحب سے کہہ دو کہ مدت پوری ہو گئی، لہٰذا یہاں سے چلے جائیں۔ آپ نے ان کی بات مان لی اور مکہ سے نکل گئے۔

یقیناً یہ بات غلط ہے۔ مکہ والوں سے تو حضور ﷺ نے دس سال تک کے لیے نا جنگی کا معاہدہ کیا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے متعدد شرطیں رکھی تھیں۔ ان میں سے ایک اہم شرط یہ تھی کہ اس سال اہل اسلام یہیں سے واپس چلے جائیں۔ آئندہ سال آ سکتے ہیں۔ آپ نے انہیں ہر طرح سمجھایا کہ ہم لڑائی کی غرض سے نہیں آئے، ہم تو خانہ کعبہ کی زیارت کرنا اور

لائے ہوئے جانوروں کی قربانی کرنا چاہتے ہیں، عمرہ ادا کرتے ہی واپس ہو جائیں گے، لیکن مکہ والوں نے ایک نہ سنی اور کہا کہ اگر یہ بات آپ نہیں مانتے تو ہم صلح نہیں کر سکتے اور مکہ جانے کے لیے آپ کو ہماری لاشوں پر سے گزرنا ہوگا۔ آخر آپ نے ان کی یہ شرط مان لی اور سعدیہ میں ہی قربانیاں کر کے سر منڈوا کر احرام کھول کر واپس ہو گئے۔" ❶

تبصرہ ① برقی صاحب نے صحیح بخاری کے جن الفاظ سے "مفہوم" نکال کر اعتراض کیا ہے، ان سے ہرگز ہرگز یہ "مفہوم" نہیں نکلتا۔ برقی صاحب کے پیش کیے ہوئے صحیح بخاری کے الفاظ اور عربی قواعد کے مطابق ان کا صحیح ترجمہ پیش خدمت ہے:

اعتمر النبي صلى الله عليه وسلم في ذي القعدة، فأبى أهل مكة أن يدعوه يدخل مكة حتى قاضاهم على أن يقيم بها ثلاثة أيام..

"نبی اکرم ﷺ نے ذی قعدہ میں عمرہ (کا ارادہ) کیا۔ اہل مکہ نے آپ کو تین دن قیام کا معاہدہ کرنے تک مکہ میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔"

اب قارئین کرام ہی بتائیں کہ اس عبارت میں کون سے الفاظ ہیں، جن سے "مفہوم" ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اسی سال مکہ میں داخل ہونے کی بات طے کر دی تھی؟ بات صرف اتنی ہے کہ مکہ والوں نے یہ کہا تھا کہ اس وقت تک مکہ میں داخلے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، جب تک ان سے صرف تین دن قیام کا معاہدہ نہ کیا جائے۔ جب آپ ﷺ نے تین دن سے زائد قیام نہ کرنے کا معاہدہ کر لیا تو مکہ والوں نے آپ ﷺ کو مکہ میں داخلے کی اجازت دے دی تھی۔ یہ مکہ میں داخلے کے لیے ایک شرط تھی، جیسا کہ انہوں نے یہ شرط بھی لگائی تھی کہ مسلمان مکہ میں اس سال داخل نہیں ہوں گے۔

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" [illegible]

صحیح بخاری کے ان الفاظ میں ان شرطوں میں سے کسی کی بھی نفی نہیں ہے۔ یہ محض انکارِ حدیث کا بہانہ اعتراض ہے، ورنہ آج تک کسی مسلمان نے اس حدیث سے یہ بات نہیں سمجھی۔

اس کے برعکس حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

قوله: حتى قاضاهم على ان يقيم بها ثلاثة ايام، اي من العام المقبل، وصرح به في حديث ابن عمر بعده...

"سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا جو قول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ سے تین دن قیام کرنے کا معاہدہ کر لیا، اس سے مراد ہے کہ اگلے سال میں۔ اس کی صراحت اس کے متصل بعد والی حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما میں کر دی گئی ہے۔" ❶

اب قارئین کرام ہی بتائیں کہ صحیح بخاری کا درست مفہوم سمجھنے کے لیے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ جیسے نابغۂ روزگار شارحین حدیث کی بات مانی جائے گی یا عربی دانی میں بالکل فیل ہونے جانے والے میرٹھی صاحب کی؟ میرٹھی صاحب کی عربی دانی کا پورا اندازہ قارئین کرام اگلے اعتراض کے جواب میں بخوبی کر لیں گے۔ ان شاء اللہ!

② باقی رہا میرٹھی صاحب کا یہ کہنا کہ "یہ قصہ جھوٹ اور سچ اور صحیح و غلط کا مغلوبہ ہے" تو یہ دراصل میرٹھی صاحب کی کج فہمی ہے۔ اس کی مکمل تشفی آئندہ اعتراضات کے ضمن میں ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ!

کیا قرآن کریم کے الفاظ عربیت کے لحاظ سے غلط ہیں؟

"(۶) عبید اللہ کی روایت میں ہے کہ اہل مکہ نے کہا تھا: لو نعلم انك رسول الله. لو نعلم عربیت کے لحاظ سے غلط ہے، صحیح لفظ لو علمنا ہے۔" ❷

❶ فتح الباری: ... ❷ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ...

انکارِ بخاری دراصل انکارِ قرآن ہے!

ہم جو اکثر کہتے رہتے ہیں کہ انکارِ حدیث دراصل انکارِ قرآن ہے، وہ محض جذباتی جملہ نہیں ہے، بلکہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ اتمامِ حجت کے لیے اس حقیقت کا اثبات اللہ تعالیٰ منکرینِ حدیث کے قلم سے کرواتے رہتے ہیں۔ میرٹھی صاحب کا مذکورہ اعتراض بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

میرٹھی صاحب نے جو اعتراض صحیح بخاری پر کیا ہے، وہی قرآنِ کریم پر بھی آگیا ہے۔

میرٹھی صاحب کا کہنا ہے کہ لو نعلم عربیت کے لحاظ سے غلط ہے، صحیح لفظ لو علمنا ہے۔ گویا وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ لــــو جو کہ عربی میں حرفِ شرط ہے، وہ مضارع پر نہیں، بلکہ ماضی پر داخل ہوتا ہے۔ لیکن ان کی وسعتِ علمی اور عربی دانی کی داد دیجیے کہ جسے انھوں نے غلطی کہا ہے، وہ قرآنِ کریم اور حدیثِ نبوی میں بکثرت موجود ہے۔

اگرچہ لــــو کا ماضی پر داخل ہونا زیادہ ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مضارع پر اس کا داخل ہونا ممتنع ہے۔ ایسا کہنا جہالت و نادانی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ قرآنِ کریم میں ہی بہت سے مقامات پر لــــو مضارع پر داخل ہوا ہے۔ تسلی کے لیے مثال کے طور پر درج ذیل مقامات کا مشاہدہ کر لیا جائے۔

سورة البقرة (١٦٥/٢)، سورة الأنعام (٩٣،٣٠،٢٧/٦)، سورة الأنفال (٥٠/٨)، سورة يونس (١١/١٠)، سورة النحل (٦١/١٦)، سورة السجدة (١٢/٣٢)، سورة سبا (٥١،٣١/٣٤)، سورة فاطر (٤٥/٣٥)، سورة يٰس (٦٧،٦٦/٣٦)، سورة الزخرف (٦٠/٤٣)، سورة محمد (٣٠،٤/٤٧).

پھر اس پر طرہ یہ کہ جن الفاظ کو میرٹھی صاحب نے غلط کہا ہے، بالکل وہی الفاظ بعینہٖ قرآن

کریم میں موجود ہیں۔ ہم وہ الفاظ بھی ہدیہ قارئین کرتے ہیں تاکہ منکرین حدیث کوئی پس وپیش نہ کرسکیں اور ان کے پاس غلطی تسلیم کرنے کے سوائے کوئی چارہ نہ رہے۔ سورۂ آل عمران میں فرمان باری تعالیٰ ہے

﴿ قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ ۔ ﴾ ❶

دیکھ لی آپ نے میرٹھی صاحب کی عربی دانی کہ جو چیز قرآن کریم میں بھی بکثرت مستعمل ہے وہ اسے بھی عربیت کے لحاظ سے غلط قرار دے رہے ہیں۔ یہ اعتراض کرکے میرٹھی صاحب نے کتاب ہدایت قرآن کریم اور عربی زبان سے اپنی جہالت پر قیامت تک کے لیے مہر ثبت کردی ہے۔

اللہ کے لیے غور کریں وہ لوگ جو میرٹھی صاحب کو "مفسر قرآن" کے لقب سے یاد کرتے ہیں! اور غور کریں وہ لوگ جو ان کے جاہلانہ اعتراضات کی بھینٹ چڑھ کر پوری امت کے اتفاقی فیصلوں کو بھی ٹھوکر مار رہے ہیں! کیا کسی اس قدر جاہل شخص کو اس صحیح بخاری پر اعتراضات کرنے کا حق ہے، جو خود اس کے نزدیک بھی تحقیق و صحت کا شاہکار ہے؟ ❷

معلوم ہوا کہ حدیث پر بخصوص صحیح بخاری پر اعتراض ہٹ دھرمی، جہالت، شقاوت، دراصل انکار قرآن ہے۔ جو اعتراض صحیح بخاری اور کسی بھی صحیح حدیث پر کیا جائے گا، بعینہٖ وہی اعتراض قرآن کریم پر بھی آجائے گا، لہٰذا امت کے اس اتفاقی فیصلے کو تسلیم کرلینے میں ہی عافیت ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اپنے دست مبارک سے لکھنے کی حقیقت!

"(۲) اس میں ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے صلح نامہ میں لکھا تھا، حالانکہ آپ امی

---

❶ آل عمران: ۱۶۷/۳

❷ دیکھیں "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۵۹

طرح ذکر کیے گئے تھے: هذا ما قاضى محمد بن عبد الله لا يدخل...

صحیح بات یہ ہے کہ آپ نے پوچھا تھا کہ رسول اللہ کہاں لکھا ہے؟ آپ کو بتایا گیا تو آپ نے اس لفظ کو قلم زد کردیا، کیونکہ حضرت علی نے اسے قلم زد کرنے سے انکار کردیا تھا اور پھر محمد بن عبداللہ لکھوایا۔" ❶

ازالہ: اس حدیث میں کسی لفظ کا وہ معنی و مفہوم نہیں، جو میرٹھی صاحب نے بیان کیا ہے کہ "خود رسول اللہ ﷺ نے صلح نامہ میں لکھا تھا۔"

فکتب کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ آپ ﷺ نے خود لکھا، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ آپ ﷺ نے لکھوایا۔ اس کا حقیقی معنی اگرچہ لکھنا ہی ہے لیکن یہاں مجازی معنی لکھوانا مقصود ہے۔

اگر میرٹھی صاحب کا کوئی معتقد اس پر اعتراض کرے کہ یہاں حقیقی معنی ہی مراد ہے، مجازی معنی مراد لینا درست نہیں تو یہ اس کی کم علمی اور جہالت ہے، ورنہ اس سے پچھلی حدیث، جسے میرٹھی صاحب نے بھی صحیح تسلیم کیا ہے، اس میں بھی یہی مجازی معنی موجود ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

فقال المشركون : لا تكتب محمد رسول الله ، لو كنت رسولا لم نقاتلك.

"مشرکین نے (رسول اللہ ﷺ سے کہا) آپ محمد رسول اللہ نہ لکھیں، کیونکہ اگر آپ (ہمارے نزدیک) رسول ہوتے تو ہم آپ سے لڑائی نہ کرتے۔" ❷

اب کیا منکرین حدیث اپنے تئیں اس حدیث پر یہ اعتراض کریں گے کہ مشرکین نبی اکرم ﷺ کو کیسے لکھنے سے روک سکتے تھے، حالانکہ آپ ﷺ تو پڑھنا لکھنا جانتے ہی نہ تھے؟

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ": 1/202-203

❷ صحیح بخاری: 2698

اسی حدیث کے شروع میں اگر میرٹھی صاحب غور کر لیتے تو شاید اس اعتراض سے باز رہ جاتے۔ الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

فلما كتبوا الكتاب كتبوا ...

”جب ان (مسلمانوں) نے عہد نامہ لکھا تو انہوں نے لکھا کہ ۔۔۔“ [1]

اگر کوئی شخص اس پر یہ اعتراض کرے کہ لکھا تو ایک آدمی نے تھا سب نے تو نہیں لکھا تھا لہٰذا یہ غلطی ہے تو اس کی جہالت پر کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ یہاں مراد یہ ہے کہ سب نے رضامندی سے لکھوایا تھا لہٰذا سب کی طرف منسوب کر دیا گیا تھا۔

اسی طرح صحیح مسلم (۱۷۷۴) کی حدیث میں ہے:

((أن نبي الله صلى الله عليه وسلم كتب إلى كسرى وإلى قيصر وإلى النجاشي وإلى كل جبار يدعوهم إلى الله تعالى))

”آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے ہوئے کسریٰ، قیصر، نجاشی اور ہر جابر بادشاہ کی طرف خط لکھے۔“

کیا منکرین حدیث اس حدیث پر بھی اعتراض کر کے مختلف بادشاہوں کو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دعوت اسلام کے لیے لکھے گئے خطوط کا بھی انکار کر دیں گے کہ آپ ﷺ تو لکھنا نہیں جانتے تھے، پھر کیسے لکھا تھا؟ حالانکہ معلوم ہے کہ یہاں لکھنے سے مراد لکھوانا ہے۔

اسی طرح قرآن کریم میں تیس سے زائد مقامات پر فرمان الٰہی ہے:

﴿تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ [2]

”اس (جنت) کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں۔“

---

[1] صحیح بخاری: ۲۶۹۹ [2] ۸/۹۸ـ۲۵۱۶

ب اگر کوئی منکر قرآن کہہ دے کہ نہریں تو خود نہیں چلتیں، بلکہ ان کے اندر پانی چلتا ہے تو اس کا یہ اعتراض اس کی اپنی عقل کا قصور ہے۔

اسی طرح فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا وَالْعِيرَ الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا ﴾ [1]

"(یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے والد سے کہا) آپ اس بستی سے پوچھ لیں جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے پوچھ لیں جس میں ہم آئے ہیں۔۔۔"

کیا کسی منکر قرآن کا یہ اعتراض درست ہوگا کہ:

"اس میں ہے کہ آپ اس بستی سے پوچھیں اور اس قافلے سے پوچھیں، حالانکہ پوچھا اس بستی کے باشندوں اور قافلے کے افراد سے جا سکتا ہے، خود بستی اور قافلے سے نہیں، صحیح یہ ہے کہ بستی کے باشندوں سے پوچھیں اور قافلے کے افراد سے استفسار کریں۔۔۔؟؟؟"

حالانکہ سیدھی سی بات ہے کہ یہاں حقیقی معنیٰ نہیں، بلکہ مجازی معنیٰ مراد ہے اور ہر زبان میں یہی کیفیت موجود ہے۔ بھلا جس شخص کو اتنی معمولی سی بات سمجھ نہ آئے، جو کہ ہر زبان میں روزمرہ مستعمل ہے، اسے صحیح بخاری پر اعتراض کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

(۳) یہ الفاظ صرف عبید اللہ بن موسیٰ عبسی نے نہیں کہے، بلکہ صحیح مسلم [2] میں اسحاق بن ابراہیم الحنظلی، جو کہ بالاتفاق ثقہ و معتبر امام ہیں، نے بھی عیسیٰ بن یونس سے بیان کیے ہیں۔ لہٰذا لغت عرب سے اپنی جہالت کی وجہ سے ان الفاظ کو آڑ بنا کر عبید اللہ بن موسیٰ پر اعتراض کرنا بڑی ہٹ دھرمی ہے۔ یہ منکرین حدیث کس کس راوی کو رافضی اور بداعتقاد کہیں گے؟

---

[1] یوسف: ۱۲/۸۲

[2] حدیث نمبر: ۱۷۸۴

عبیداللہ کی ''غلط بیانی''!

''(د) یہ صلح نامہ چار دفعات پر مشتمل تھا، جیسا کہ میں نے یہیں اقتباس لکھ دیا ہے۔ عبیداللہ نے ان میں سے بس پہلی تیسری اور چوتھی دفعہ کا ذکر کیا ہے، وہ بھی غلط، کیونکہ چوتھی دفعہ یہ تھی کہ مکہ والوں میں سے کوئی شخص مدینہ چلا جائے تو آپ اپنے پاس نہ رہنے دیں گے اور مسلمانوں میں سے کوئی شخص اسلام چھوڑ کر مکہ آ جائے تو اسے مکہ سے طلب نہ کریں گے۔ عبیداللہ نے اسے ٹھیک بیان نہیں کیا۔'' ❶

ازالہ ① کلام میں اجمال و تفصیل کا ہونا ایک مسلّم امر ہے، یعنی بعض دفعہ ایک شخص ایک واقعہ کو اجمالاً اختصار سے بیان کرتا ہے اور دوسری دفعہ اس کو تفصیل سے کھول کر بیان کر دیتا ہے۔ اگر سب شروط کا ذکر عبیداللہ بن موسیٰ نے نہیں کیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ شروط انہوں نے حذف کی ہیں، بلکہ انہوں نے اپنے استاذ سے سنی ہی اسی طرح تھیں۔

جو دفعات اس معاہدے میں ثابت ہیں، وہ دوسری صحیح احادیث میں موجود ہیں لہٰذا یہ تفصیل دوسری حدیثوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس حوالے سے ہم ایک مثال پیش کر کے بات سمجھاتے ہیں:

سورۂ اعراف (۱۱۔۱۲) وغیرہ میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا۔ ابلیس کے سوائے سب نے سجدہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے سجدہ نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا: مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے، لہٰذا میں اسے سجدہ نہیں کروں گا۔ جبکہ سورۂ بقرہ (۳۴) وغیرہ میں شیطان کے آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ

---

❶ ''صحیح بخاری کا مطالعہ'': ۱/ ۷۴

کرنے کا ذکر تو ہے، لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان سے اس بارے میں پوچھ گچھ بھی کی تھی۔

کیا کسی منکرِ قرآن کا سورۂ بقرہ کی مذکورہ آیت پر یہ اعتراض کرنا صحیح ہوگا کہ وہ (معاذ اللہ) ناقص ہے؟ اگر وہاں نہیں تو حدیثِ رسول ﷺ بھی تو وحی ہے، اس پر کیوں اس طرح کے بے تکے اعتراضات کیے جا رہے ہیں؟

(۴) دراصل بات غلط بیان کرنے کی تو گزشتہ اعتراضات کے جوابات میں ہم نے بڑی تفصیل سے واضح کر دیا ہے کہ وہ دراصل میرٹھی صاحب کی کم علمی پر مبنی اپنی غلطیاں ہیں، جنھیں وہ "چوری کے بجائے چور" کا مصداق بن کر عبید اللہ بن موسیٰ کے اوپر تھوپنا چاہتے ہیں۔ تفصیل کے لیے گزشتہ صفحات ملاحظہ فرمائیں۔

عبید اللہ کی حدیث اور چھ ہجری میں دخولِ مکہ!

"(۵) عبید اللہ کی روایت میں ہے: فلما دخلها ومضى الأجل۔

سیاقِ روایت سے اس کا مطلب یہ نکل رہا ہے کہ حدیبیہ کے سال ہی سن ۶ ہجری میں آپ صلح نامے کے مطابق مکہ میں داخل ہوئے، حالانکہ یہ غلط ہے۔ اس سال تو آپ صلح نامہ کے مطابق حدیبیہ سے ہی مدینہ واپس ہو گئے تھے۔ سن ۷ ہجری میں عمرۃ القضاء کے لیے آنجناب مکہ تشریف لے گئے تھے۔" ❶

جواب: میرٹھی صاحب نے "تحقیق و تنقید" کے نام سے خام مال اپنی کتاب میں لوڈ کیا ہے۔ بالکل یہی اعتراض پہلے بھی میرٹھی صاحب نے کیا تھا، جسے ہم گزشتہ صفحات میں ذکر کر چکے ہیں، لیکن اگلے ہی صفحہ انھوں نے پھر وہی اعتراض دہرایا ہے۔

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۷۰

قارئین خود فیصلہ کریں کہ کیا تحقیق و تنقید اسی روش کا نام ہے؟ نا معلوم میرٹھی صاحب کا حافظہ ہی کام چھوڑ گیا تھا یا پھر انھوں نے محض کتاب کا حجم بڑھانے کے لیے ایسی کارروائی کی ہے؟

تحقیق و تنقید یا بازی گری؟

قارئین کرام یہ دیکھتے آرہے ہیں کہ میرٹھی صاحب نے صحیح بخاری کی اس متفقہ طور پر صحیح حدیث پر مذکورہ سارے اعتراضات صرف عبید اللہ بن موسیٰ رحمہ اللہ کو آڑ بنا کر کیے ہیں۔ ان کو رافضی، بدعقیدہ، غالی شیعہ، عیار، دھوکہ باز، غلط کار، کج رو اور نامعلوم کیا کیا کہا ہے۔ لیکن گرگٹ کی طرح ان کا رنگ بدلنا دیکھیں کہ ان پر ایڑی چوٹی کا زور صرف کر کے اب خود ہی اقرار کر لیا ہے کہ:

"لیکن ان غلطیوں کا ذمہ دار عبید اللہ بن موسیٰ نہیں، کیونکہ حسین بن محمد (مسند احمد: ۱/۹۸) اور محمد بن یوسف فریابی نے بھی اسرائیل سے اسی طرح کی روایت کی ہے۔ (مسند دارمی، کتاب السیر) یہ سب غلطیاں اسرائیل بن یونس کی ہیں۔" [1]

معلوم ہوا کہ قصور بے چارے عبید اللہ بن موسیٰ کا نہیں بلکہ اسرائیل بن یونس کا، بلکہ ان منکرین حدیث کی اپنی عقل کا ہے، جو حدیث اور اجماعِ امت کو تسلیم کرنے کی بجائے اس طرح کی بے وقوفیاں باتیں کرتی ہے۔ اب میرٹھی صاحب کے معتقدین کو چاہیے کہ وہ تمام القابات جو اس حدیث پر اعتراض کرنے کے لیے انھوں نے عبید اللہ بن موسیٰ کو دیے تھے، خود ہی اپنے پیشوا کے ساتھ موصوف کر لیں، کیونکہ خود انھوں نے اعتراف کر لیا ہے کہ یہ غلطیاں اس کی نہیں، لہٰذا ان کی ساری کوشش بالکل رائیگاں اور فضول رہی۔

انصاف پسند لوگ خود ہی سوچیں کہ یہ تحقیق و تنقید ہے یا بازی گری؟

---

[1] صحیح بخاری کا مطالعہ: ۱/۱۳۱

والدہ کے ہوتے ہوئے دختر حمزہ کی کفالت خالہ کے ہاں کیوں؟

"دوسرا قصہ دختر حمزہ کا ہے کہ مکہ سے روانگی کے وقت وہ یا عم، یا عم پکارتی ہوئی آپ کے پیچھے ہولی اور علی نے اسے حضرت فاطمہ کے حوالے کر دیا۔ پھر مدینہ پہنچنے پر اس کی کفالت کے تین دعوے دار ہوئے۔ علی، ان کے بڑے بھائی جعفر اور زید بن حارثہ۔ آپ نے اس کا فیصلہ حضرت جعفر کے حق میں فرمایا، چونکہ ان کی بیوی اسماء بنت عمیس اس لڑکی کی خالہ تھیں اور آپ نے تینوں حضرات کے متعلق ایک ایک بات کہی، جسے سن کر ان پر وجد طاری ہو گیا اور فرط مسرت سے رقص کرنے لگے۔ علی سے آپ نے انت مني وانا منک، زید سے انت اخونا ومولانا، جعفر سے أشبهت بي خلقا وخلقا فرمایا تھا۔

یہ قصہ ابو اسحاق نے ہبیرہ بن یریم اور ہانی بن ہانی سے سنا تھا، جو قطعاً گھڑا ہوا اور شروع سے آخر تک محض جھوٹ ہے۔ اسماء بنت عمیس اور سلمٰی بنت عمیس دونوں بہنیں قدیمۃ الاسلام صحابیہ ہیں۔ اسماء کی شادی حضرت جعفر بن ابی طالب سے ہوئی تھی اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا اپنے شوہر حضرت جعفر کے ساتھ حبشہ ہجرت کر گئیں، پھر سن ۷ ہجری میں ان ہی کے ساتھ حبشہ سے مدینہ آ گئیں اور حضرت سلمٰی رضی اللہ عنہا اپنے شوہر حضرت حمزہ کے ساتھ مدینہ ہجرت فرما گئیں۔ حضرت حمزہ کی بچی، جس کا اس روایت میں ذکر ہے، یقیناً سلمٰی بنت عمیس کے بطن سے تھی۔ اس لڑکی کے والدین یعنی حضرت حمزہ و سلمٰی نے جب مکہ سے ہجرت کی ہے تو کیا وہ اپنی کمسن بچی کو مکہ میں چھوڑ گئے تھے؟ حضرت حمزہ غزوہ احد میں شہید ہو گئے، ان کے بعد حضرت شداد بن الہاد لیثی رضی اللہ عنہ سے سلمٰی کا نکاح ہو گیا۔ عبداللہ بن شداد بن الہاد مشہور تابعی، سلمٰی کے بطن سے ہی پیدا ہوئے تھے اور شداد بن الہاد مہاجر صحابی ہیں۔ بقول ابن سعد

غزوۂ خندق اور بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے تھے۔

الغرض حضرت حمزہ کی یہ بیٹی جس کا اکثر محدثین نے عمارہ نام بتایا ہے، حضرت حمزہ کے بعد باپ کے سایہ سے محروم ہوگئی تھی۔ لیکن اس کی ماں سلمٰی بنت عمیس تو موجود تھی۔ ماں کے ہوتے ہوئے خالہ کی کفالت کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کے متعلق ہبیرہ ابن یریم اور ہانی بن ہانی سے جو قصہ مروی ہے، جس کی ان دونوں نے بقول ابو اسحاق حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ اس کے برخلاف خود حضرت علی سے نافع بن عجیر نے روایت کی ہے۔۔۔

متنا یہ حدیث مضطرب ہے اور اس کا راوی نافع بن عجیر مجہول الحال ہے۔ اس پر بھی وہی اشکال وارد ہوتا ہے کہ دختر حمزہ کا مکہ میں رہ جانا غیر معقول ہے اور بالفرض وہ رہ ہی گئی تھی اور عمرۃ القضاء کے بعد زید بن حارثہ اسے جا کر لائے تھے تو مدینہ میں اس کی والدہ سلمٰی بنت عمیس تو موجود تھیں۔ ان کے ہوتے ہوئے خالہ کی کفالت بے معنی بات تھی۔

بہرکیف حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بچی کا یہ قصہ بڑی گپ شپ ہے اور عبیداللہ بن موسیٰ نے تو اسے حضرت براء بن عازب کی طرف منسوب کر کے گھڑوا کر لیا پھر نیم چڑھا بنادیا اور دروغ گوئی پورا آشکار کر دیا تھا۔"❶

جواب: ① اس حدیث میں رقص کرنے کا ذکر صحیح بخاری میں آنحضا موجود نہیں، بلکہ اس کی وضاحت ہم تفصیلاً کر چکے ہیں۔

② یہ بھی صاحب نے صحیح بخاری کی صحت پر امت مسلمہ کے اتفاق کو مات مارنے کے لیے جو بہانہ بنا رکھا ہے وہ بالکل بودا ہے۔ ان کے اعتراض کا حاصل دو باتیں ہیں، اول یہ کہ

---

❶ صحیح بخاری کا مطالعہ: ۲/۔۔۔

ہجرت کے وقت سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی سلمٰی بنت عمیس نے اپنی بیٹی کو مکہ میں کیسے چھوڑ دیا تھا؟ دوسرا یہ کہ ماں کے ہوتے ہوئے خالہ کی کفالت کا سوال کیسے پیدا ہوتا ہے؟

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وهذا يشعر بأن أمها إما لم تكن أسلمت ... وإما أن تكون ماتت ...

''اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس (دختر حمزہ) کی ماں یا تو (اس وقت تک) مسلمان نہیں ہوئی تھی یا پھر وہ فوت ہو چکی تھی۔'' ❶

اس سے برقی صاحب کے دونوں اعتراض رفع ہو گئے ہیں۔ پہلے حمزہ رضی اللہ عنہ نے ہجرت کے وقت اپنی بیٹی کو مکہ میں اس لیے چھوڑا تھا کہ اس کی ماں ابھی مسلمان نہیں ہوئی تھی اور بچی ابھی چھوٹی تھی البتہ جب ماں مدینہ میں آ گئی اور بچی کو اس کے ساتھ رہنا پڑا۔

پھر ماں کے ہوتے ہوئے خالہ کی کفالت کا بھی سوال اسی لیے پیدا ہوا کہ ماں اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئی تھی، اب لڑکی باشعور ہو رہی تھی لہٰذا آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ نے اس بات کو مناسب نہیں سمجھا کہ وہ بچی مشرک ماں کے ساتھ رہے۔ یا پھر ماں مسلمان ہو کر فوت ہو چکی تھی لہٰذا خالہ کی کفالت سونپنا پڑی۔

اب برقی صاحب کے معتقدین کو چاہیے کہ وہ اس صحیح حدیث پر برقی صاحب کے ان دو اعتراضات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے قرینۃ الاسلام ہونا تو دور کی بات ہے، ہجرت مدینہ کے وقت تک بھی سلمٰی بنت عمیس کا مسلمان ہونا ثابت کریں اور پھر فتح مکہ کے وقت ان کا مسلمان ہو چکنا اور زندہ رہنا کسی مستند ذریعے سے دکھا دیں۔ ورنہ جان لیں کہ یہ سب انکارِ حدیث کے بہانے ہیں، حقیقت نہیں۔

❶ فتح الباری لابن حجر: ۷/ ۵۰۰

② ہمیرہ بن یریم اور ہانی بن ہانی، دونوں ثقہ راوی ہیں۔ ان پر تفصیلی بحث ہم گزشتہ صفحات میں کر چکے ہیں، پھر وہ دونوں صحیح بخاری کی سند میں موجود بھی نہیں ہیں لہٰذا اپنی مرضی سے ان کو یہاں ٹھونس کر اور ان پر جرح کر کے اس قصہ کو گھڑا ہوا اور جھوٹ قرار دیا جانا بجائے خود کائنات کا بدترین جھوٹ ہے اور منکرینِ حدیث کی بے اصولی وہٹ دھرمی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

③ نافع بن عجیر کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے اس قصہ کو روایت کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ ابو اسحاق کا سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے اسے بیان کرنا غلط ہے، بلکہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہ قصہ مروی ہے اور سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بھی۔

نافع بن عجیر صحابی ہیں!

رہا نافع بن عجیر کو مجہول الحال کہنا تو یہ ایک بڑی جہالت ہے، کیونکہ بہت سے محدثین مثلاً ابو القاسم بغوی، ابو نعیم، ابن حبان وغیرہ رحمہم اللہ نے ان کو صحابہ میں شمار کیا ہے۔ ❶

صحابہ کرام سب کے سب عادل و ضابط ہیں، صحتِ سند کے لیے ان کے حالات معلوم کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔

بالفرض ان کو صحابی تسلیم نہ کیا جائے تو بھی وہ ثقہ ہیں، کیونکہ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے اور امام حاکم رحمہ اللہ ❷ ان کی حدیث کے بارے میں "صحیح علی شرط مسلم" فرما گئے ہیں، جو کہ ان کی توثیق ہے۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی "وُثِّق" کہہ کر ان کی توثیق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ❸

---

❶ تہذیب التہذیب لابن حجر: ۱۰/ ۴۰۸ ❷ المستدرک: ۳/ ۲۱۶

❸ الکاشف للذہبی: ۳/ ۱۷۸

اضطراب کیا ہے؟

⑥ نافع بن عجیر کی حدیث کی سند کو "مضطرب" کہنا بھی بہت بڑی غلطی ہے، کیونکہ میرٹھی صاحب کے نزدیک نافع بن عجیر "مجہول الحال" ہیں، لہٰذا ان کے نزدیک ان کی روایت ہی "ضعیف" ہے۔ جبکہ اضطراب ایسی سندوں میں ہو سکتا ہے جو صحت میں برابر ہوں، ایک صحیح اور ایک ضعیف سند کی صورت میں مضطرب نہیں بن سکتیں۔

حافظ ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ اصول حدیث کے بارے میں اپنی مشہور زمانہ کتاب میں لکھتے ہیں:

المضطرب من الحديث: هو الذي تختلف الرّواية فيه، فيرويه بعضهم على وجه وبعضهم على وجه آخر مخالف له، وإنّما نسمّيه مضطربا إذا تساوت الرّوايتان، أمّا إذا ترجّحت إحداهما بحيث لا تقاومها الأخرى بأن راويها أحفظ أو أكثر صحبة للمروي عنه أو غير ذلك من وجوه الترجيحات المعتمدة فالحكم للرّاجحة، ولا يطلق عليه حينئذ وصف المضطرب ولا له حكمه.

"مضطرب حدیث وہ ہوتی ہے جس کی روایت مختلف ہو جائے، بعض راوی کسی طرح بیان کریں اور بعض اس کے خلاف کسی اور طرح بیان کریں۔ ہم (محدثین) حدیث کو مضطرب صرف اسی وقت کہتے ہیں، جب دونوں (مختلف روایات قوت میں) برابر ہوں۔ لیکن جب ایک روایت دوسری روایت پر ترجیح پا جائے اور دوسری اس کا مقابلہ نہ کر سکے، اس طرح کہ ایک کا راوی زیادہ حافظے والا اور اپنے استاذ سے زیادہ صحبت رکھنے والا ہو یا قابل اعتماد وجوہ ترجیح میں سے کوئی موجود ہو تو حکم راجح روایت کا ہی ہوگا۔ اس وقت ہم اس حدیث پر مضطرب کے وصف کا اطلاق نہیں کریں گے، نہ ہی اس کا حکم

مضطرب والا ہوگا۔" [1]

جب دو ایسے ثقہ راویوں کی ایک دوسرے کے مخالف روایت بھی "مضطرب" نہیں ہوسکتی، جن میں سے ایک حافظے میں دوسرے سے بڑھ کر ہو تو اس راوی کی روایت ثقہ راویوں کی روایت کے مقابلے میں آ کر "مضطرب" کیسے ہوسکتی ہے، جس کو خود میرٹھی صاحب "مجہول الحال" قرار دے رہے ہیں؟

یہ ہے میرٹھی صاحب کا مبلغ علم اور وہ اعتراضات کرتے ہیں امتِ مسلمہ کے اتفاقی فیصلے صحیح بخاری پر! بلاشبہ انکارِ حدیث کا بڑا سبب اصولِ حدیث سے لاعلمی ہے۔ کسی دانشور نے سچ کہا ہے:

إنما الناس أعداء لما يجهلون.

"لوگ جس چیز کو نہ جان سکیں، یقیناً اس کے مخالف ہو جاتے ہیں۔"

"میں نہ مانوں" کا علاج تو کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔ منصف مزاج آدمی کے سامنے سارے حقائق رکھ دیے گئے ہیں۔ ہر ذی شعور سمجھ سکتا ہے کہ میرٹھی صاحب کا کبھی عبید اللہ بن موسیٰ کو "دروغ گو" وغیرہ کہہ کر مطعون کرنا اور کبھی تھوک چاٹ کر فوراً ساری "غلط بیانیوں" کا ذمہ دار اسرائیل بن یونس کو بنا نا محض ہٹ دھرمی پرمبنی ہے، تحقیق و تنقید قطعاً نہیں۔

قارئین کرام سے ہماری اپیل ہے وہ دلائل کو پرکھیں، حقائق کو دیکھیں اور حق کے پیرو بنیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق سمجھنے اور اس پر ڈٹ جانے کی توفیق عطا فرمائے! آمین!

---

[1] مقدمة ابن الصلاح : ص ٥٥

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ساتواں باب

مالِ تجارت کو دیکھ کر صحابہ کرام کے خطبۂ جمعہ کو چھوڑ کر جانے کے متعلق حدیث جابر رضی اللہ عنہ

صحیح بخاری (۹۳۶، ۲۰۵۸، ۲۰۶۴، ۴۸۹۹) و صحیح مسلم (۸۶۳) وغیرہما کی درج ذیل صحیح حدیث آپ نے پڑھ لی جس کی صحت پر اتفاق امت ہے، اس کی تحقیق آگئی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک کے تمام مسلمان اس صحیح حدیث کے مطابق سورۃ الجمعہ کی آیت (۱۱:۶۲) کی تفسیر بھی کرتے رہے ہیں کہ:

نبی کریم ﷺ ایک دفعہ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک تجارتی قافلہ مدینہ میں داخل ہوا۔ شروع میں جس طرح نماز میں ایک دوسرے سے بات کرنے کی گنجائش تھی، جمعہ میں کلام کی ممانعت نہ ہوئی تھی اسی طرح خطبہ میں بھی آنے جانے پر پابندیاں عائد نہیں کی گئی تھیں، لہذا سامعین میں سے بارہ آدمیوں کے علاوہ باقی تمام لوگ اس قافلے کی طرف چلے گئے، خطبہ کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور مسلمانوں کو سمجھا دیا کہ جمعہ کا خطبہ تمہارے لیے تجارت اور وغیرہ سے بہتر ہے۔ رہا تمہارا یہ اندیشہ کہ جمعہ پڑھتے پڑھتے ہم سامان خورد و نوش سے محروم ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ سب سے بڑا رازق ہے، وہ تمہیں ضرور سب کچھ مہیا کر دے گا۔ لہذا آئندہ ایسا کرنا تمہارے لیے قابل مؤاخذہ جرم ہوگا۔

لیکن چودہ سو سال سے ساری امت مسلمہ کی اس متفقہ تفسیر اور صحیح بخاری و مسلم کی صحت پر پوری امت کے اجماع و اتفاق کے خلاف چودھویں صدی میں پیدا ہونے والے شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب اس پر اعتراضات کرکے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک کے تمام محدثین

مفسرین کو جاہل واعظ اور گپیں ہانکنے والے راوی قرار دے کر اس کا انکار کر دیا ہے۔ ان کی ''گل افشانیاں'' پیشِ خدمت ہیں:

''ان وجوہ کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث باطل ہے اور اس میں جو قصہ مذکور ہے قطعاً بے اصل ہے۔ جاہل واعظوں اور اناپ شناپ بکنے والے راویوں نے قرآن کریم کی ہر آیت کا الگ الگ شانِ نزول بیان کرنے کی جو بے ہودہ بدعت تابعین و اتباع تابعین کے دور میں پھیلا دی تھی، وہی اس قصہ کے گھڑنے کا باعث ہے جو کہ حدیث میں مذکور ہے۔'' ❶

آیئے ان وجوہ کا جائزہ لیں، جن کی بنا پر میرٹھی صاحب نے اس حدیث کو باطل اور بے ہودہ قرار دیا ہے، تاکہ قارئین کو میرٹھی صاحب کی جہالت و حماقت کا یقین بھی ہو جائے اور اس بات کا صحیح اندازہ بھی ہو جائے کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم کی صحت پر امتِ مسلمہ کا اتفاق قطعی طور پر ناقابلِ تسخیر ہے۔

فصلِ اوّل: فنی اعتراضات کا جائزہ

میرٹھی صاحب نے اس حدیث پر روایت کے لحاظ سے جو اعتراضات کیے ہیں، وہ درحقیقت ان کے ''روایتی'' اعتراضات ہیں، علمی نہیں۔ ان کی علمی حیثیت ملاحظہ فرمائیں۔

❁ متن کے لحاظ سے ''اختلاف''!

''حصین بن عبدالرحمٰن سے یہ حدیث (۱) زائدہ (۲) خالد بن عبداللہ الطحان (۳) جریر بن عبدالحمید (۴) ہشیم بن بشیر اور (۵) عبداللہ بن ادریس نے روایت کی ہے۔

❶ صحیح بخاری کا مطالعہ: ۲/ ۸۲۔

ان پانچوں کی روایت میں متن و اسناد کے لحاظ سے اختلاف ہے۔ متن کا اختلاف یہ ہے کہ زائدہ کی روایت کے مطابق تجارتی قافلہ کی آمد پر بارہ شخصوں کے علاوہ تمام صحابہ کرام نماز پڑھنے کی حالت میں آپ کو چھوڑ کر توڑ کر نکل گئے تھے اور خالد و جریر وغیرہ کی اور ان کی روایت کے مطابق خطبہ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس وقت آپ خطبہ دے رہے تھے۔ ہشیم کی روایت محتمل ہے اس میں بصراحت خطبہ کا ذکر ہے نہ نماز کا بلکہ یہ ہے کہ اس وقت رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے تھے۔

اصولاً چار ثقہ راویوں کی روایت ایک ثقہ کی روایت پر راجح ہے اور باور کرنا چاہئے کہ زائدہ کو وہم ہو گیا تھا کہ خطبہ کی بجائے نماز کا ذکر کر دیا۔" ❶

تبصرہ: ① یہی بیس ہے جس کی بنا پر میرٹھی صاحب نے اس بالاتفاق صحیح حدیث کا انکار کیا ہے لیکن اس اعتراض کا باعث میرٹھی صاحب کی کم علمی ہے۔

شاذ کی تعریف

اپنے سے بڑے ثقہ راوی یا زیادہ ثقہ راویوں کے خلاف کسی ثقہ راوی کی روایت کو "شاذ" کہتے ہیں۔ اس کی تعریف محدثین کی زبانی سنئے اور پھر دیکھئے کہ زائدہ کی روایت کو "شاذ" کہنا اصولِ حدیث کی موافقت ہے یا مخالفت!

حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ امام شافعی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ليس من الشاذ أن يروي الثقة ما لا يروي غيره، إنما الشاذ أن يروي الثقة حديثا يخالف ما روى الناس

"شاذ یہ نہیں کہ ثقہ راوی وہ (حدیث یا الفاظ) بیان کرے جو دوسرے بیان نہیں کرتے،

---

❶ صحیح بخاری کا مطالعہ ۲: ۷۹۔۸۰

بلکہ شاذ تو صرف یہ ہے کہ ثقہ راوی ایسی حدیث بیان کرے جو دوسرے (ثقہ) لوگوں کی روایت کردہ کے مخالف ہو۔"

معلوم ہوا کہ اگر ایک ثقہ راوی اور زیادہ ثقہ راویوں کی بیان کردہ بات میں اختلاف ہو تو ایک ثقہ راوی کی بات "شاذ" اور غیر مقبول ہوگی، لیکن اگر سب کی بات ایک ہی ہو، جس میں کوئی حقیقی اختلاف نہ ہو، بلکہ صرف ایک آدمی کو اپنی کم علمی و کم فہمی کی وجہ سے اس میں اختلاف نظر آتا ہو تو اسے باطل کہنا خود باطل ہوگا۔ تمہید کے طور پر اتنی بات ذہن نشین کر لینے کے بعد ہم قارئین کو بتانا چاہتے ہیں کہ زائدہ کی روایت اور ان کے علاوہ چار راویوں کی روایت ایک ہی ہے، جس میں کوئی اختلاف نہیں۔

خطبہ نماز ہی ہے!

زائدہ راوی نے خطبہ کی جگہ نماز کا لفظ بولا ہے اور یہ اختلاف نہیں، بلکہ اتفاق ہے، کیونکہ:

(ا) خطبہ نمازِ جمعہ کا ہی حصہ ہے۔ نمازِ ظہر کی دو رکعت کم کر کے ان کی جگہ خطبہ رکھا گیا ہے، گویا خطبہ انہی دو رکعتوں کا بدل ہے جو جمعہ کے دن نمازِ ظہر سے ختم کی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نماز کی طرح خطبۂ جمعہ میں بھی آپس کی کلام اور دیگر مصروفیات مثلاً خرید و فروخت وغیرہ سے سختی کے ساتھ روک دیا گیا ہے۔ اس حدیث میں خطبہ کو نماز قرار دے کر اسی بات کی تعلیم دی گئی تھی، جسے میرٹھی صاحب نے اپنی کم عقلی کی وجہ سے رد کیا ہے۔

(ب) رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام نماز کے انتظار کو نماز ہی شمار کرتے تھے جیسا کہ:

❁ سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک رات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نمازِ عشاء کے لیے تقریباً آدھی رات تک رسول اللہ ﷺ کا انتظار کیا، پھر آپ ﷺ تشریف لائے اور یہ فرمان جاری کیا:

((ألا إن الناس قد صلوا ، ثم رقدوا ، وإنكم لم تزالوا في صلاة ما انتظرتم الصلاة))

"خبردار! یقیناً (مدینے سے باہر رہنے والے مسلمان) لوگ نماز پڑھ چکے، پھر سو بھی چکے، بلاشبہ تم جب تک نماز کا انتظار کرتے رہے ہو، نماز میں ہی رہے ہو۔" ❶

۞ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لا يزال العبد في صلاة ما كان في المسجد ينتظر الصلاة ، ما لم يحدث))

"بندہ جب تک باوضو ہو کر مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے، نماز میں ہی ہوتا ہے۔" ❷

۞ سیدنا سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((من كان في المسجد ينتظر الصلاة ، فهو في الصلاة))

"جو نماز کے انتظار میں مسجد کے اندر ہو، وہ نماز میں ہی ہوتا ہے۔" ❸

اس حدیث کو امام ابن حبان رحمہ اللہ (۱۷۵۲) نے "صحیح" قرار دیا ہے۔ کتبِ حدیث میں اس حدیث کے کئی اور شواہد بھی موجود ہیں۔

۞ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تھی، اس کا اثر یہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی نماز کے انتظار کو نماز ہی شمار کرتے تھے، جیسا کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے سیدنا عبداللہ بن

---

❶ صحیح بخاری: ۶۰۰، صحیح مسلم: ۶۴۰

❷ صحیح بخاری: ۱۷۶، صحیح مسلم: ۶۴۹

❸ مسند الإمام أحمد: ۳۳۱/۵، سنن النسائي: ۷۳۴، وسندہٗ حسن

سلام رضی اللہ عنہ سے نمازِ جمعہ کے دن قبولیت والے وقت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ یہ وقت عصر سے مغرب کے درمیان ہوتا ہے۔ آگے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی زبانی سنیے:

فقلت: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: في صلاة، وليست بساعة صلاة، قال: أو لم تعلم أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ((منتظر الصلاة في صلاة))، قلت: بلى هي، والله هي

"میں نے (عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے) کہا: بلاشبہ اللہ کے رسول ﷺ نے تو فرمایا ہے کہ (یہ وقت) نماز میں ہوتا ہے اور یہ (عصر سے مغرب تک کا وقت) تو نماز کا وقت نہیں ہے، انھوں نے فرمایا: کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ نماز کا انتظار کرنے والا نماز میں ہی ہوتا ہے؟ میں نے کہا: ہاں! یہی وقت ہے، اللہ کی قسم! یہی وقت ہے۔" ❶

اس حدیث کو امام ابن حبان رحمہ اللہ (۲۷۷۲) نے "صحیح" کہا ہے، امام حاکم (۱/۲۷۸) نے اسے "بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح" قرار دیا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت بھی کی ہے۔ حافظ نووی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو "بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح" کہا ہے۔

جب خطبہ نمازِ جمعہ کا حصہ ہے، نیز رسول اللہ ﷺ اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز کے لیے بیٹھنے کو بھی نماز ہی شمار کرتے تھے تو پھر [illegible] کو نماز اور باقی راویوں کا خطبہ کہنا مخالفت کیسے بن گئی؟ کیا خطبہ سننے والا نماز کے لیے بیٹھا نہیں ہوتا؟ معلوم ہوا کہ نماز سے مراد بھی خطبہ ہی ہے، لہٰذا قطعاً یہ مخالفت نہیں ہے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ (م ۴۵۸ھ) فرماتے ہیں:

---

❶ مسند الإمام أحمد: ۵/۴۵۱، سنن أبي داود: ۱۰۴۶، سنن الترمذي: ۴۹۱، سنن النسائي: ۱۴۳۰، سنن ابن ماجه: ۱۱۳۹، وسنده صحيح

وقول من قال : نصلي معه الجمعة أراد به الخطبة ، وكأنه عبّر بالصلاة عن الخطبة .

''جن راویوں نے یہ کہا ہے کہ ہم آپ ﷺ کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھ رہے تھے، انھوں نے خطبہ ہی مراد لیا ہے، گویا کہ انھوں نے خطبہ کو نماز سے تعبیر کر لیا ہے۔'' ❶

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ (م ۷۹۵ھ) لکھتے ہیں:

وقوله في الرواية التي خرّجها البخاري : بينما نحن نصلي مع النبي ، لم يرد به أنهم انفضّوا عنه في نفس الصلاة ، إنما أراد به ۔ والله أعلم ۔ أنهم كانوا مجتمعين للصلاة ، فانفضّوا وتركوه .

''راوی کا امام بخاری کی بیان کردہ ایک روایت میں یہ کہنا کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے، اس سے راوی کی مراد یہ نہیں کہ وہ آپ ﷺ کو نماز کے اندر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، بلکہ اس کی مراد یہ ہے کہ وہ نماز کے لیے جمع ہو چکے تھے، پھر وہ بھاگ گئے اور آپ ﷺ کو چھوڑ گئے۔'' ❷

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (۷۷۳۔۸۵۲ھ) لکھتے ہیں:

فقوله : يصلي ، أي ينتظر الصلاة . وقوله : في الصلاة ، أي في الخطبة ...

''راوی کا کہنا کہ ہم نماز پڑھ رہے تھے، اس سے مراد یہ ہے کہ ہم نماز کا انتظار کر رہے تھے اور راوی کا یہ کہنا کہ ہم نماز میں تھے، اس سے مراد ہے کہ ہم خطبہ میں تھے۔'' ❸

---

❶ السنن الکبریٰ للبیہقی ۳/۱۸۲۔

❷ فتح الباری لابن رجب ۵/۴۲۴۔

❸ فتح الباری لابن حجر ۲/۴۲۳۔

اتنی سی بات میرٹھی صاحب کی سمجھ میں نہیں آسکی اور انہوں نے امتِ مسلمہ کے اتفاقی فیصلے صحیح بخاری پر اعتراضات شروع کردیے ہیں۔ اب تو یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ ہر منکرِ حدیث، حدیث اور اصولِ حدیث سے جاہل ہوتا ہے۔ کاش کہ میرٹھی صاحب صحیح بخاری پر اعتراضات کرنے کی بجائے اپنے مطالعۂ حدیث کو وسعت دیتے!

(۴) میرٹھی صاحب کا یہ کہنا بھی بہت بڑی بھول ہے کہ حصین بن عبدالرحمٰن سے اس حدیث کو پانچ شاگرد بیان کرتے ہیں، کیونکہ صحیح بخاری (۲۰۶۴) میں اسی حصین سے ایک اور شاگرد محمد بن فضیل (ثقہ) بھی ان سے یہی حدیث روایت کر رہے ہیں۔ اسی طرح مسند عبد بن حمید (۱/۳۴۵ ح: ۱۱۱۰) میں ساتویں شاگرد سلیمان بن کثیر (صالح الحدیث فی غیر الزھری) بھی حصین سے یہی روایت بیان کر رہے ہیں۔

البتہ وہ دونوں بھی زائدہ کی طرح خطبہ کی بجائے نماز کا ذکر کرتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے میرٹھی صاحب اسے اُڑا گئے ہیں کہ اس طرح یہ کہنا صحیح نہیں رہے گا کہ صرف زائدہ نے یہ الفاظ بیان کیے ہیں، بلکہ اب تو تین راوی اسی طرح بیان کر رہے ہیں!

جب زائدہ کے ساتھ ساتھ محمد بن فضیل اور سلیمان بن کثیر بھی نماز ہی کا ذکر کر رہے ہیں تو میرٹھی صاحب اب کس کس راوی کو وہمی قرار دے کر اپنا مدعا حاصل کریں گے؟

اب قارئین خود اندازہ کرلیں کہ ان کے سب سے بڑے اعتراض کا یہ حال ہے، بعد والوں میں کتنی جان ہوگی؟

اسناد کا ”اختلاف“!

”اور اسناد کا اختلاف یہ ہے کہ زائدہ کی روایت کے مطابق سالم بن ابی الجعد نے حدثنا جابر کہا تھا۔ یعنی سالم نے یہ حدیث حضرت جابر سے سنی تھی، لیکن خالد و جریر

وہشیم، وہ بھی اور لیس چاروں کی روایت میں عن جابر ہے، جو اتصال وانقطاع دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ پس یہ سمجھنا بے جا نہیں کہ جیسے زائدہ کو اس کے متن میں وہم ہو گیا تھا، اسی طرح وہ اس کی اسناد میں بھی وہم کا شکار ہو گئے تھے کہ عن جابر کی بجائے حدثنا جابر کہہ دیا۔ اور معلوم ہے کہ سالم بن ابی الجعد کثیر الارسال تابعی تھے۔ سالم نے حضرت عمر وعثمان وعلی وثوبان وعبداللہ بن مسعود وام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم اور عمرو بن عنبسہ وابو امامہ وابو الدرداء وجابان وزیاد بن لبید رضی اللہ عنہم سے حدیثیں روایت کی ہیں اور وہ سب مرسل ہیں۔ سالم نے ان حضرات میں سے کسی سے کوئی حدیث نہیں سنی۔ پس یہ حدیث بھی سالم نے حضرت جابر سے براہ راست نہیں سنی، کسی نے ان سے بیان کر دی تھی۔ موصوف نے اس کا نام ذکر نہیں کیا۔۔۔“ ❶

① میرٹھی صاحب کا کہنا ہے کہ جس طرح زائدہ کو متن میں وہم ہو گیا تھا، اسی طرح اسناد میں بھی وہ وہم کا شکار ہو گئے ہیں، لیکن آپ بخوبی جان چکے ہیں کہ زائدہ کو متن میں کوئی وہم نہیں ہوا، بلکہ وہ میرٹھی صاحب کی اپنی علمی بے مائیگی تھی، لہٰذا جیسے زائدہ کو متن میں وہم نہیں ہوا تھا، اسی طرح اسناد میں بھی وہ وہم کا شکار نہیں ہوئے۔ یہاں بھی میرٹھی صاحب کی اپنی عقل ہی چکرائی ہے۔

② اب میرٹھی صاحب کی اصولِ حدیث سے جہالت ملاحظہ فرمائیں کہ:

غیر مدلس راویوں کا عنعنہ اتصال ہوتا ہے

(ل) وہ صیغہ ”عن“ کو اتصال وانقطاع دونوں کا محتمل قرار دے کر اس حدیث کے ضعف کا سبب بنا رہے ہیں، حالانکہ ہم گزشتہ صفحات میں اصولِ محدثین کی روشنی میں بار بار یہ واضح

---

❶ ”صحیح بخاری کا مطالعہ“: ۱/ ۸۰

کر چکے ہیں کہ صرف "مدلس" راویوں کی طرف سے بولا گیا یہ لفظ اتصال و انقطاع دونوں کا احتمال رکھتا ہے، لیکن اگر یہ لفظ "غیر مدلس" راویوں کی طرف سے بولا گیا ہو تو بالاجماع اتصال ہی کے لیے ہوتا ہے، دوسرا کوئی احتمال اس میں نہیں ہوتا۔ سالم بن ابی الجعد کثیر الارسال تو ہیں مگر "مدلس" نہیں ہیں، لہٰذا ان کے "عن" کہنے کو انقطاع پر محمول کرنا صریح جہالت ہے، کوئی علمی کاوش نہیں!

اب بالفرض زائدہ راوی کو وہم بھی ہوا ہو تو اصولِ محدثین کے مطابق یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔

میرٹھی صاحب کے معتقدین سے عرض ہے کہ اگر وہ میرٹھی صاحب کے اس قانون کو صحیح سمجھتے ہیں تو اسے اصولِ حدیث کی روشنی میں ثابت کر دیں، ورنہ انکارِ حدیث سے توبہ کر لیں۔

کثیر الارسال راوی کی تمام روایات مرسل نہیں ہوتیں!

(ب) کسی کثیر الارسال راوی کا کچھ لوگوں سے ارسال کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ اس کی ہر روایت "مرسل" ہی شمار ہوگی، بلکہ جن اساتذہ سے اس کے سماع کے عدم ہونے پر کوئی دلیل قائم ہو جائے، ان سے اس کی روایت "مرسل" ہوتی ہے اور باقی سب اساتذہ سے ان کی حدیث بالکل صحیح ہوتی ہے۔ اسے "مرسل" کہنا انتہائی بے اصولی ہے۔

محدثین کرام رحمہم اللہ نے اس موضوع پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں انہوں نے کثیر الارسال راویوں کے ان اساتذہ کے نام ذکر کر دیے ہیں جن سے انہوں نے "مرسل" احادیث بیان کی ہیں، مثلاً: المراسیل لابن ابی حاتم، جامع التحصیل لأحکام المراسیل للعلائی، تحفۃ التحصیل لأحکام المراسیل للحافظ العراقی، وغیرہا من الکتب۔ اب اگر ان کتب میں محدثین جابر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی صراحت کر دیں کہ سالم بن

بی الجعد کی ان سے روایت "مرسل" ہے تو سر آنکھوں پر، لیکن اگر وہ ایسا نہ کریں، تو پھر بھی ان احادیث کو "مرسل" کہنا بہت بڑی جہالت ہے۔

اس پر مستزاد یہ کہ محدثین نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے سالم بن ابی الجعد کے خود سننے کی صراحت بھی کر دی ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے امام بخاری رحمہ اللہ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا:

ولم يسمع من ثوبان، وسمع من جابر بن عبد الله وانس بن مالك.

"اس (سالم بن ابی الجعد) نے ثوبان رضی اللہ عنہ سے نہیں سنا، البتہ سیدنا جابر بن عبداللہ اور سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے احادیث سنی ہیں۔" [1]

قارئین کرام خود فیصلہ کریں کہ اتنی صراحت کے بعد بھی جو شخص سالم بن ابی الجعد کی سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کو "مرسل" قرار دیتا ہے، اس کی علمی اہمیت کتنی ہوگی؟

ہر سلیم القلب شخص خود سوچ لے کہ وہ محدثین کرام کی بات مان کر اس حدیث کو "متصل" مانے گا یا فن حدیث سے بالکل ناواقف شخص کی بات مان کر اسے "مرسل" قرار دے گا!

اس پر طرہ یہ ہے کہ اس حدیث میں سالم بن ابی الجعد نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے اپنے سننے کی صراحت بھی کی ہوئی ہے، جسے وہم قرار دینے کی میرٹھی کا ذہن یارا نہیں ہوئی۔

پھر اس پر طرہ در طرہ یہ ہے کہ اس حدیث کو سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے صرف سالم بن ابی الجعد اکیلے بیان نہیں کر رہے، بلکہ ایک اور راوی ابوسفیان طلحہ بن نافع (حسن الحديث) بھی سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے یہی حدیث بیان کر رہے ہیں۔ (صحیح مسلم: ٨٦٢) میرٹھی صاحب نے اس پر

---

[1] [illegible] ترمذی بحوالہ تحفة التحصيل لأحكام المراسيل لأبي زرعة العراقي: ١/١٢٠

بھی وہی اپنی منطق چلانے کی کوشش کی ہے، جس کا بھرپور رد ہم اگلے اعتراض کے جواب میں کریں گے۔ ان شاء اللہ!

اللہ کے لیے میرٹھی صاحب کے معتقدین ہی بتائیں کہ کیا تحقیق، تنقید اسی کا نام ہے؟؟؟

طلحہ بن نافع کے "ارسال" کی حقیقت!

"اور حصین کے تلامذہ میں سے ہُشیم و خالد بن عبداللہ نے اس کی اسناد میں سالم بن ابی الجعد کے ساتھ ابوسفیان طلحہ بن نافع کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن ابوسفیان کی حضرت جابر سے روایت کردہ اکثر احادیث "مرسل" ہیں۔ شعبہ و علی بن المدینی نے کہا ہے کہ ابوسفیان نے حضرت جابر سے بس چار حدیثیں سنی تھیں۔۔۔" ❶

① اکثر احادیث "مرسل" ہونے سے تمام احادیث کا "مرسل" ہونا تو لازم نہیں آتا۔ چار احادیث کے سننے کا تو میرٹھی صاحب کو بھی اعتراف ہے، وہ چار کون سی تھیں؟

آیئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے پوچھتے ہیں کہ وہ چار احادیث کون سی تھیں، وہ لکھتے ہیں:

قلت : لم يخرج البخاري له سوى أربعة أحاديث عن جابر ، وأظنها التي عناها شيخه علي بن المديني ، منها حديثان في الأشربة قرنه بأبي صالح ، وفي الفضائل حديث ((اهتز العرش)) ، كذلك ، والرابع في تفسير سورة الجمعة ، قرنه بسالم ابن أبي الجعد .

"امام بخاری رحمہ اللہ نے اس (ابوسفیان طلحہ بن نافع) کی صرف چار احادیث ہی بیان کی ہیں، میرے خیال میں یہ وہی چار حدیثیں ہیں، جو امام موصوف کے استاذ علی بن المدینی

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۲/۸۰۔۸۱

سے مراد لی ہیں۔ ان میں سے دو حدیثیں کتاب الاشربہ میں ہیں، جنہیں امام صاحب نے ابو صالح کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے اور اسی طرح ایک فضائل میں ہے اور چوتھی (زیرِ بحث) حدیث سورۂ جمعہ کی تفسیر میں ہے، اس کو امام صاحب نے سالم بن ابی الجعد کی حدیث کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے۔" ❶

معلوم ہوا کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے استاذ علی بن المدینی نے طلحہ بن نافع کے سماع والی جو چار احادیث بتائی تھیں، امام بخاری نے صرف انہی کو اپنی صحیح میں پیش کیا ہے، کیونکہ امام صاحب صحتِ حدیث میں بہت ہی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ امام موصوف کی اس باریک بینی کو خود میرٹھی صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"صحتِ حدیث کا التزام کر کے عالی مرتبہ شیخین (بخاری و مسلم) نے علمائے معاصرین اور بعد میں آنے والے محققین و محدثین کے لیے نہایت اچھی مثال پیش کر دی تھی اور تحقیق کی وہ صحیح راہ دکھا دی تھی، جس پر چلنے سے سنتِ نبویہ کی نقل و غش سے حفاظت ہو سکتی تھی۔" ❷

ساری دنیا کو تحقیق کی راہ دکھانے والے امام بخاری رحمہ اللہ کو بھلا اپنے استاذ کی وہ بات معلوم نہ ہوئی ہوگی، جو میرٹھی صاحب کو بھی معلوم ہو گئی ہے اور انہوں نے خود تحقیق کی راہ پر چل کر بھلا اپنے استاذ کی بتلائی ہوئی چار احادیث کا خیال نہیں کیا ہوگا؟

چونکہ امت مسلمہ نے صحیح بخاری و صحیح مسلم کی صحت پر جو اتفاق کیا ہے، وہ خود اس بات کی بڑی ٹھوس دلیل ہے کہ یہ حدیث انہی چاروں حدیثوں میں سے ہے، جو ابو سفیان طلحہ بن نافع نے اپنے استاذ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے سنی ہیں۔ اس کے برعکس میرٹھی صاحب اپنے موقف کی

---

❶ تہذیب التہذیب، لابن حجر: ۵/۲۷

❷ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۵۰

تائید میں کوئی دلیل پیش نہیں کر پائے۔

اس بارے میں بھلا امام بخاری اور پوری امت کے بڑے بڑے علمائے کرام کی بات مانی جائے گی، جو اس فن میں مہارت تامہ رکھتے تھے یا میرٹھی صاحب کی بات مانی جائے گی، جو کہ حدیث اور اصولِ حدیث کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں؟

فصلِ ثانی: عقلی اعتراضات کا جائزہ

شبہ: صحابہ کرام کا خطبہ چھوڑ کر جانا "عقلاً" محال!

"درایت کے لحاظ سے دیکھیے تو اس کے باطل ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ:

(الف) آیت شریفہ میں تجارۃ او لھوا ہے۔ پس اگر یہ سمجھا جائے کہ اس میں ذکر مسلمانوں کا ہے، جو جمعہ کے دن رسول اللہ ﷺ کو خطبہ دیتے ہوئے چھوڑ کر مسجد سے باہر نکل گئے تھے تو ماننا پڑے گا کہ یہ حادثہ کم از کم دو بار پیش آیا تھا۔ ایک بار خطبے کے دوران مسجد سے باہر غلہ فروش آ گئے تھے اور ایک بار مسجد سے باہر خطبے کے وقت کھیل کود اور تفریح کا سامان ہو گیا تھا۔ دونوں دفعہ مسجد میں خطبہ سنتے ہوئے مسلمان دیوانہ وار باہر نکل گئے۔ اور یقیناً یہ غلط ہے۔ لہٰذا یہ گمان غلط ہے کہ اس آیت میں مسلمانوں کا ذکر ہے۔" ❶

جواب: یقیناً دو بار سے بھی زائد دفعہ یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ صحابہ کرام خطبہ چھوڑ کر چلے گئے تھے، جیسا کہ زیر بحث حدیث کے راوی سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ خود ہی بیان کرتے ہیں۔

---

❶ تدبر قرآن [illegible]

كان الجواري إذا نكحوا، كانوا يمرون بالكبر والمزامير، ويتركون النبي صلى الله عليه وسلم قائماً على المنبر، وينفضون إليها، فأنزل الله: ﴿وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا﴾

"جب دو مدینہ والے نکاح کرتے تو چھوٹی بچیاں یا لونڈیاں ڈھول اور مزامیر لے کر گزرتیں تو لوگ نبی ﷺ کو منبر پر خطبہ دیتے چھوڑ کر اس طرف نکل جاتے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا﴾ (جب وہ کوئی تجارت یا کوئی کھیل دیکھتے ہیں تو اس طرف چلے جاتے ہیں اور آپ کو کھڑا چھوڑ جاتے ہیں)۔" [1]

یعنی جس طرح پہلے نماز کے اندر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپس میں روزمرہ کی بات چیت کر لیا کرتے تھے، لیکن نبی اکرم ﷺ نے ان پر اس وقت تک نکیر نہیں کی، جب تک اللہ تعالیٰ نے وحی نازل کر کے ان سے روک نہیں دیا، اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خطبہ کو معمولی سے معمولی کام کی وجہ سے چھوڑ کر چلے جاتے، جب تک اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل نہیں کی، جب تک ایسا کرنا کوئی جرم نہیں تھا، اسی لیے نبی اکرم ﷺ اس سے روکتے نہیں تھے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس سے روک دیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رک بھی گئے تھے، اس میں اعتراض والی کون سی بات ہے؟

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ولا بعد في أن تنزل في الأمرين معا أو أكثر.

"کوئی بعید بات نہیں ہے کہ یہ آیت دو یا دو سے زیادہ واقعات کے بارے میں نازل ہوئی ہو۔" [2]

---

[1] تفسیر طبری: ٢٢/٦٨٢، وسندہ صحیح
[2] فتح الباری لابن حجر: ٢/٤٢٤

③ عورتوں پر جمعہ فرض نہیں تھا اور وہ خرید و فروخت بھی کر سکتی تھیں، اسی طرح بچے بھی سامانِ تجارت خرید سکتے تھے، لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس خیال کا آ جانا کوئی بعید نہ تھا کہ کہیں سامانِ تجارت ختم ہی نہ ہو جائے۔

لہٰذا یہ برق صاحب کا اپنا ذہنی قصور ہے، حدیث نبوی کا نہیں۔

ان آیات میں مسلمانوں کا ذکر نہیں:

"(ح) اس آیت سے پہلے اہل ایمان کو خطاب کر کے ارشاد ہوا ہے۔۔۔ "اے اہل ایمان! جمعہ کے دن جب نمازِ جمعہ کی اذان ہو تو اللہ کے ذکر کی طرف لپکو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یعنی اس وقت دنیوی مشغلوں سے دست برداری تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔ پھر جب نمازِ جمعہ سے فراغت ہو جائے تو اپنے مشاغل کے لیے زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو یعنی مال و رزق حلال حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ کرو اور اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہو۔ امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔"

اس کے بعد آیت ﴿ وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً ﴾ ہے۔ اگر اس آیت میں بھی مسلمانوں کا ہی ذکر ہوتا اور ان کے عمل شنیع پر جس کا اس حدیث میں ذکر ہے، انکار مقصود ہوتا تو وإذا رأيتم تجارة أو لهوا انفضضتم إليه وتركتم الرسول قائما یعنی خطاب کے صیغے لائے جاتے۔"[1]

جواب: ① گزشتہ حدیث کے دفاع میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ برق صاحب نے حدیث میں ایک "غلطی" کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا تھا:

"لو تعلم عربیت کے لحاظ سے غلط ہے، صحیح لفظ لو علمنا ہے۔"

---

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/ ۸۱-۸۲

حالانکہ قرآن کریم میں بھی فسوف تعلمون موجود ہے۔ ہم نے وہاں بتایا تھا کہ جو اعتراض حدیث نبوی میں کیا جائے گا، بعینہٖ وہی قرآن کریم میں آجائے گا، کیونکہ دونوں ایک ہی ذات، یعنی اللہ تعالیٰ کی وحی ہیں، لہٰذا اگر میرٹھی صاحب اس کام سے باز ہی رہتے تو اچھا تھا۔ ان کو عربی زبان و ادب سے اتنی واقفیت تو ہے نہیں، لیکن وہ "ٹانگ اڑانے" سے رکتے نہیں ہیں۔

ان کا یہ اعتراض بھی بالکل اسی طرز کا ہے۔ حالانکہ بات واضح سی ہے کہ پہلے مسلمانوں کو خطاب تھا اور اب رسول اللہ ﷺ کو خطاب کیا گیا کہ آپ بھی ان سے کہہ دیجیے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس جو اجر و ثواب ہے، وہ تمہاری تجارت اور کھیل کود سے بہت بہتر ہے۔ اگر یہ خطاب بھی عام مسلمانوں کو ہوتا تو وہ اشکال آتا جو میرٹھی صاحب نے پیش کیا ہے۔

انکارِ حدیث نے منکرین حدیث کے دماغ سے سوچ و فکر کی صلاحیت ہی ختم کر دی ہے۔ ذی شعور بچہ بھی ایسی بے تکی بات نہیں کہہ سکتا۔

قرآن کریم میں بے ربطی کا شبہ!

(۶) "اس آیت میں مسلمانوں کا ذکر سمجھا جائے تو اس کا آیات ما قبل سے کوئی ربط نہیں رہتا۔ ایسی بے ربطی تو انسانی کلام میں بھی پسند نہیں ہوتی، پھر خدا تعالیٰ کے کلام میں اس کا کیا امکان ہے؟" ❶

پچھلی سطور میں ہم ابھی بتا رہے تھے کہ میرٹھی صاحب انکارِ حدیث کے نشے میں بے خود ہو گئے ہیں۔ بھلا اس آیت میں مسلمانوں کا ذکر ہونے سے بے ربطی کیسے آ گئی۔ پچھلی آیات میں بھی اہل ایمان کو خطاب ہے کہ جمعہ کی اذان سن کر خطبہ کی طرف جلدی جلدی آجاؤ اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ جب نماز جمعہ ادا ہو چکے تو پھر دوبارہ اپنے کام

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۸۲/۱

کام میں مشغول ہو جاؤ۔ ان کا ترجمہ گزشتہ اعتراض میں میرٹھی صاحب خود پیش کر چکے ہیں، قارئین وہاں سے پڑھ لیں اور اس سے اگلی آیت بھی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا ہے کہ آپ ان مسلمانوں سے کہہ دیں کہ جو اجر و ثواب اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، وہ تجارت اور کھیل تماشے سے بہت بہتر ہے۔ بھلا اس سے بے ربطی کیسے آ گئی؟

یہ ہے میرٹھی صاحب کی تحقیق و تنقید! نہ معلوم ایسے شخص کو صحیح بخاری پر اعتراض کرنے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟

② بے ربطی تو میرٹھی صاحب کی بیان کردہ تفسیر سے آتی ہے، کیونکہ ان کے نزدیک اس آیت میں یہود کا تذکرہ ہے۔ اب قارئین خود ہی فیصلہ کر کے بتائیں کہ اہل ایمان کے خطاب کے ساتھ بغیر کسی فاصلے اور بغیر کسی صراحت کے یہود کا تذکرہ بے ربطی ہے یا اہل ایمان کو خطاب کے بعد مسلمانوں کا تذکرہ بے ربطی ہے؟

ان آیات میں صحابہ کرام کا ذکر "عقلاً" محال ہے!

"(د) اس حدیث میں صحابہ کرام کی طرف جو فعل شنیع منسوب کیا گیا ہے، عصر حاضر کے جاہل مسلمانوں سے بھی اس کا صدور نہیں ہو سکتا، صحابہ کرام کا تو ذکر ہی کیا۔ ان واضح وجوہ کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث باطل ہے اور اس میں جو قصہ مذکور ہے، قطعاً بے اصل ہے۔۔۔ یہاں میں یہ بتانے پر اکتفا کرتا ہوں کہ اس آیت میں ذکر یہود کا ہے۔۔۔" ❶

جواب: یہ ہے آخری زور جو میرٹھی صاحب نے پوری امتِ مسلمہ کے اتفاقی فیصلے صحیح بخاری کے خلاف لگایا ہے، لیکن یہ بھی عقل کی کمی کا پرورده ہے، کیونکہ:

① جب تک خطبہ سننے کی پابندی نہیں آئی تھی، اس وقت تک ایسا کرنا کوئی جرم نہ تھا کہ

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" [illegible]

اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں کمی کا سبب بنے۔

② نماز میں کلام کی ممانعت آنے سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز کے اندر آپس میں بات چیت کر لیتے تھے۔ اگر کوئی جاہل کہہ دے کہ ''عصر حاضر کے جاہل مسلمانوں سے بھی اس کا صدور نہیں ہو سکتا، صحابہ کرام کا تو ذکر ہی کیا۔'' تو کیا اس سے اس حقیقت کا بھی انکار کر دیا جائے گا؟

③ اگر کوئی منکر قرآن اسی طرح کا اعتراض قرآن کریم پر کر دے اور کہہ دے کہ:

''سورۃ القصص (۱۵ تا ۱۸) میں ذکر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے سامنے دو آدمی لڑ رہے تھے۔ ایک ان کی قوم کا تھا اور دوسرے کا تعلق ان کے دشمنوں سے تھا۔ آپ علیہ السلام کی قوم کے آدمی نے موسیٰ علیہ السلام سے مدد کی درخواست کی۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دشمنوں کے آدمی کو مکا مار کر اس کا کام تمام کر دیا، پھر اس کام پر نادم ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی۔۔۔

قرآن کریم کی اس آیت میں موسیٰ علیہ السلام نے یہ تحقیق نہیں کی کہ قصور کس کا ہے اور حق پر کون ہے، بلکہ محض تعصب کی بنا پر اسے قتل کر دیا۔۔۔

یہ کام تو عصر حاضر کے کسی منصف مزاج کافر سے بھی ممکن نہیں، موسیٰ علیہ السلام کا تو ذکر ہی کیا۔۔۔

اس وجہ سے میں اس آیت کو باطل سمجھتا ہوں اور اس میں جو قصہ مذکور ہے وہ قطعاً بے اصل ہے۔'' (نقل کفر کفر نہ باشد)

تو منکرین حدیث کا اس کے پاس کیا جواب ہے؟ کیا اس اعتراض سے قرآن کریم کی صحت پر کوئی حرف آئے گا؟

جو جواب اس قرآنی آیت کا منکرین حدیث دیں گے وہی ہماری طرف سے قبول کر لیں۔

آخر میں قارئین کرام سے ہماری استدعا ہے کہ وہ حقائق کو تسلیم کرنے والے بنیں اور تحقیق

لوگوں کی چکنی چپڑی باتوں سے مرعوب نہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ حق کو دیکھ کر اس پر عمل کرنے کی توفیق دے اور باطل کو سمجھ کر اس سے بچنے کی ہمت عطا فرمائے!

آمین!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آٹھواں باب

منافقین کے بارے میں صحابہ کرام کی دو آراء

پر قرآنی تنبیہ کے متعلق عدی بن ثابت کی بیان کردہ حدیث

سورۃ النساء میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ وَاللَّهُ أَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوا أَتُرِيدُونَ أَنْ تَهْدُوا مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا﴾ (1)

"(اے مسلمانو!) تمہیں کیا ہے کہ منافقین کے بارے میں دو گروہ ہو رہے ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے عمل (بد) کی وجہ سے (سابقہ حالت کفر میں) لوٹا دیا ہے؟ کیا جس شخص کو اللہ نے گمراہ کر دیا ہے، تم اس کو ہدایت دینا چاہتے ہو؟ جس شخص کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو اس کے لیے (ہدایت کی) کوئی راہ نہیں پاؤ گے۔"

غزوہ احد کے موقع پر مسلمانوں کی فوج مدینہ سے تقریباً ایک ہزار کی تعداد میں مقام احد کی طرف نکلی تھی، لیکن کچھ منافقین راستے سے ہی واپس ہو گئے۔ اس پر بعض مسلمانوں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کی کہ یہ کافر ہو گئے ہیں، لہٰذا ان سے قتال کیا جائے، لیکن بعض نے ان کے کلمہ گو ہونے کی وجہ سے قتال نہ کرنے کی تجویز پیش کی، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ نازل فرما کر وضاحت فرمادی کہ منافقین کے بارے میں تمہاری دو آراء نہیں ہونی چاہئیں، بلکہ ایک ہی رائے ہونا چاہیے کہ اگر وہ کھلم کھلا اعلانِ بغاوت کر دیں تو ان سے قتال کیا جائے۔

(1) النساء: ۸۸

اس آیت کریمہ کی یہی تفسیر صحیح بخاری کی حدیث میں موجود ہے لیکن شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب نے اپنی ذہنیت "روایت" کے مطابق بغیر کسی معقول وجہ کے اس کا انکار کر دیا ہے۔ آیئے ان کے اعتراضات کا منصفانہ جائزہ لیتے ہیں۔

فصلِ اوّل: فنی اعتراضات کا جائزہ

عدی بن ثابت پر رافضی ہونے کا الزام!

"عدی بن ثابت غلو کا شیعہ یعنی رافضی تھا اور موقوف روایات کو مرفوع بیان کر دینے کا خوگر۔ بہت سی صحیح حدیثیں بھی اس نے روایت کی ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے کچھ لوگوں نے اسے ثقہ قرار دیا ہے اور رافضی ہونے کی وجہ سے حضرت علی اور ان کی آل کے متعلق بے سروپا روایات بھی اس نے ذکر کی ہیں۔ بقول امام ابو حاتم شیعوں کی مسجد کا امام اور ان کا واعظ تھا کان امام مسجد الشیعۃ وقاصّھم۔ یحییٰ بن معین نے اسے شیعی مفرط (غالی شیعہ) اور ابو اسحاق جوزجانی نے مائل عن القصد (اعتدال سے ہٹا ہوا) بتایا ہے۔ شعبہ نے کہا: کان من الرفاعین (موقوف روایات کو مرفوع بیان کر دینے والا تھا)۔" ❶

جواب: (۱) ہم پیچھے بھی باب نمبر ① میں یہ بات بہت واضح طور پر بیان کر چکے ہیں کہ متقدمین جس راوی کو غالی شیعہ کہیں اس کو رافضی قرار دینا بہت بڑی جہالت ہے کیونکہ بصراحت محدثین ایسا راوی رافضی نہیں ہوتا۔ افسوس کہ ہمارا پالا ایسے لوگوں سے پڑا ہے! ہم طوالت کے خوف سے قارئین کو باب نمبر ② کے مطالعہ کا مشورہ دیں گے۔

---

❶ تحقیق بخاری کا مطالعہ ص ۹۲ - ۹۵

② موقوف روایات کو مرفوع بنا کر بیان کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی قول یا فعل کو جو کسی صحابی کے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ اب اپنی سوچ کچھ ہی ایسی ہو گئی ہے کہ یہ بھی نہ بھانپ سکے کہ اس بات کا تعلق سرے سے اس حدیث سے نہیں ہے، کیونکہ اس حدیث میں آیت کریمہ کا شانِ نزول سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے۔ اگر اس شانِ نزول کے بیان کو رسول کریم ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا تو عدی بن ثابت پر یہ اعتراض ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے اس نے کسی صحابی کا قول رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا ہو۔

اگر میرٹھی صاحب کے کسی معتقد کے ذہن میں یہ بات آئے کہ اُحد کی طرف نکلنے کی بات تو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہے نا! تو اس سے بڑی جہالت اور کوئی نہیں، کیونکہ یہ کسی صحابی کا فعل ہوا ہی نہیں ہو سکتا کہ عدی بن ثابت نے اسے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا ہو، بلکہ اتفاقی طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لے کر رسول اللہ ﷺ خود ہی اُحد کی طرف نکلے تھے۔

موجودہ صورت حال میں عدی بن ثابت پر یہ جرح نقل کرنا سوائے ورق سیاہ کرنے کتاب کا حجم بڑھانے کے اور کچھ بھی نہیں۔

③ خود میرٹھی صاحب نے اقرار کر لیا ہے کہ بہت سی صحیح احادیث بھی اس نے بیان کی ہیں۔ یقیناً یہ حدیث بھی ان بہت سی صحیح حدیثوں میں سے ایک ہے، کیونکہ اگر یہ ان میں سے نہ ہوتی تو امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ اور دیگر کبار محدثین کو ضرور معلوم ہو جاتا اور وہ ضرور اس کی وضاحت کر دیتے۔

حیرت ہے کہ فنِ حدیث کے امام تو اس سے بے خبر رہے اور شیعہ اور رافضی کا فرق بھی نہ دیکھ سکنے والے میرٹھی صاحب اس سے واقف ہو گئے!

④ میرٹھی صاحب کا یہ فرمان بھی ہمری کو دن کہنے کے مترادف ہے کہ چند لوگوں نے اسے ثقہ قرار دیا ہے، کیونکہ محدثین کی ایک بڑی جماعت نے ان کی توثیق کی ہے۔

۸۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب صحیح مسلم میں ان کی بہت سی احادیث پیش کر کے ان کی ثقاہت پر مہر لگائی ہے۔ ❶

۹۔ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ کے نزدیک بھی عدی بن ثابت ثقہ ہیں، کیونکہ انھوں نے بھی اپنی کتاب صحیح ابن خزیمہ میں ان کی کئی احادیث پیش کی ہیں، جو کہ ان کی طرف سے توثیق ہیں۔ ❷

۱۰۔ امام ابن الجارود رحمہ اللہ نے بھی ان کی توثیق ضمنی کی ہے۔ ❸

۱۱۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے ان کی احادیث کو "بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح" قرار دے کر ان کی توثیق کی ہے۔ ❹

۱۲۔ امام الضیاء المقدسی رحمہ اللہ نے بھی ان کی احادیث کو صحیح قرار دے کر ان کی توثیق کی ہے۔ ❺

۱۳۔ مسند ابی عوانہ میں بھی ان کی احادیث موجود ہیں، جو کہ امام ابو عوانہ کے نزدیک ان کے ثقہ ہونے کی دلیل ہیں۔ ❻

۱۴۔ ناقد رجال حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے سارے اقوال کو مدنظر رکھ کر لکھا ہے:

ثقة، لكنه قاعي الشيعة وإمام مسجدهم بالكوفة.

---

❶ صحيح مسلم [illegible] وغيرها

❷ صحيح ابن خزيمة [illegible] وغيرها

❸ المنتقى لابن الجارود: ٦٨١

❹ مستدرك على الصحيحين للحاكم [illegible] وغيره

❺ المختارة للضياء المقدسي [illegible] وغيرها

❻ مسند ابي عوانة [illegible] وغيرها

"وہ ثقہ تھے لیکن شیعہ کے واعظ اور کوفہ میں ان کی مسجد کے امام تھے۔" ❶

۱۵۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی سب محدثین کے اقوال کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ثقة، رمي بالتشيع. "ثقہ تھے، ان پر شیعہ ہونے کا الزام ہے۔" ❷

ان کے علاوہ بھی بہت سے ماہرینِ رجالِ حدیث کے اقوال پیش کیے جا سکتے ہیں، لیکن وہ طوالت کا باعث ہوں گے۔

اب قارئین کرام خود ہی فیصلہ کر لیں کہ حدیث کے اماموں اور ماہرینِ فن لوگوں کی بات معتبر ہوگی یا میرٹھی صاحب کی، جن کو متقدمین اور متاخرین کی اصطلاح "شیعہ" میں موجود فرق کا بھی علم نہیں؟

رہی یہ بات کہ امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

عدي بن ثابت ممن يجب التثبت في نقله.

"عدی بن ثابت ان لوگوں میں سے ہیں، جن کی نقل کردہ روایت کی تحقیق کرنا ضروری ہے۔" ❸

اول تو اس کی سند معلوم نہیں، نہ ہی کہیں امام طبری رحمہ اللہ کی کسی کتاب میں یہ قول ملتا ہے۔

ثانیاً یہ کوئی ایسی جرح نہیں، جس سے عدی بن ثابت کا رافضی یا مجروح ہونا لازم آتا ہو۔

رہا امام دارقطنی کا ان کو غالی رافضی کہنا (سوالات السلمي للدارقطني: ٢٠٦) تو وہ ثابت نہیں

---

❶ الكاشف للذهبي: ٣٧٥٤

❷ تقريب التهذيب لابن حجر: ٤٥٣٩

❸ تهذيب التهذيب لابن حجر: ١٦٤/٧

ہے، کیونکہ ان سے یہ قول بیان کرنے والا راوی ابو عبدالرحمن محمد بن حسین السلمی خود گمراہ صوفی تھا۔

اس کے بارے میں خطیب بغدادی رحمہ اللہ محمد بن یوسف القطان سے نقل کرتے ہیں:

كان أبو عبد الرحمن السلمي غير ثقة .. وكان يضع للصوفية الأحاديث

"ابو عبدالرحمن السلمی ثقہ نہیں تھا۔ یہ صوفیوں کے لیے احادیث گھڑتا تھا۔" ❶

نیز وہ الحسین بن منصور الحلاج صوفی کا معتقد تھا، جس کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ خبردار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فتدبر يا عبد الله! نحلة الحلاج الذي هو من رؤوس القرامطة، ودعاة الزندقة، وأنصف، وتورع، واتق ذلك، وحاسب نفسك، فإن تبرهن لك أن شمائل هذا المرء شمائل عدو للإسلام، محب للرئاسة، حريص على الظهور بباطل وبحق، فتبرأ من نحلته، وإن تبرهن لك ـ والعياذ بالله ـ أنه كان ـ والحالة هذه ـ محقا، هاديا، مهديا، فجدد إسلامك، واستغث بربك أن يوفقك للحق، وأن يثبت قلبك على دينه، فإنما الهدى نور يقذفه الله في قلب عبده المسلم، ولا قوة إلا بالله ...

"اے اللہ کے بندے! آپ اس حلاج کے مذہب پر غور کریں، جو کہ قرامطہ (تاویل اور خطرناک قسم کے باطنی لوگوں) کا ایک سردار اور الحاد و بے دینی کا داعی تھا۔ آپ انصاف و پرہیزگاری سے کام لیں، اس سے بچ جائیں اور اپنے نفس کا محاسبہ

❶ تاریخ بغداد للخطیب: ۲/ ۲۴۸

کریں۔ اگر آپ کے لیے واضح ہو جائے کہ اس شخص کے خصائل اسلام دشمن، حکومت پسند اور باطل و حق کے اختلاط کے ساتھ غلبہ حاصل کرنے کے خواہش مند شخص کے خصائل ہیں تو فوراً اس کے مذہب سے دستبردار ہو جائیے! اور اللہ نہ کرے، اگر اس صورتِ حال کے باوجود آپ کو وہ حق بجانب، ہدایت یافتہ اور ہدایت کنندہ نظر آئے تو اپنے اسلام کی تجدید کیجیے اور اپنے رب سے مدد مانگیے کہ وہ آپ کو حق کی توفیق دے اور آپ کے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھے، کیونکہ ہدایت تو ایک نور ہے، جسے اللہ تعالیٰ اپنے مسلمان بندے کے دل میں جاگزیں کر دیتا ہے۔ گمراہی سے بچنے اور حق کو پانے کی قوت و طاقت صرف اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔“ ❶

اسی لیے خود حافظ ذہبی رحمہ اللہ ابو عبدالرحمن السلمی کے بارے میں لکھتے ہیں:

وما هو بالقوي في الحديث.

”یہ حدیث میں قوی نہیں تھا۔“ ❷

ان وجوہ کی بنا پر امام دارقطنی کا عدی بن ثابت کو رافضی کہنا پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ پایا، البتہ ان کا عدی بن ثابت کو ثقہ کہنا ہم ثابت کر چکے ہیں۔ والحمد للہ!

اگر کوئی امام دارقطنی رحمہ اللہ کے اس قول کو ثابت ہی سمجھے تو بھی یہ قول عدی بن ثابت کے ضعف پر دلالت نہیں کرتا، کیونکہ امام موصوف نے ان کو غالی رافضی کہنے کے متصل پہلے ان کو ثقہ بھی قرار دیا ہے، حالانکہ غالی رافضی تو کافر ہوتے ہیں۔ بھلا امام دارقطنی رحمہ اللہ جیسا شخص ایک کافر کو ثقہ کیسے قرار دے سکتا ہے؟ اگر یہ قول تسلیم کیا جائے تو اس کو مبالغہ پر محمول کیا جائے گا۔

❶ سیر أعلام النبلاء للذهبي: 374/18

❷ سیر أعلام النبلاء للذهبي: 247/17

⑤ جب میرٹھی صاحب عدی بن ثابت کا رافضی ہونا ہی ثابت نہیں کر سکے تو یہ کہنا سینہ زوری ہے کہ:

"رافضی ہونے کی وجہ سے حضرت علی اور ان کی آل کے متعلق بے سروپا روایات بھی اس نے ذکر کی ہیں۔"

محدثین کرام کی ایک بڑی جماعت ان کو حدیث میں ثقہ اور قابلِ اعتماد قرار دے رہی ہے، ان سب کے خلاف میرٹھی صاحب کی خود ساختہ بات کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

شیعہ ہونا روایت میں کوئی جرح نہیں

⑥ میرٹھی صاحب نے امام ابوحاتم رحمہ اللہ کا قول پیش کرنے میں دیانت سے کام نہیں لیا۔ وہ اس طرح کہ ان کا یہ قول تو پیش کر دیا ہے کہ وہ شیعہ کے امام اور واعظ تھے، لیکن اس سے پہلے الفاظ ذکر نہیں کیے۔ کیونکہ وہ ان کے خلاف تھے۔ ہم باحوالہ نقل کر چکے ہیں کہ امام ابوحاتم رحمہ اللہ نے شیعہ کا امام و واعظ کہنے سے پہلے عدی بن ثابت کو "صدوق" یعنی سچا راوی قرار دیا ہے۔

یہ بات میرٹھی صاحب کے معتقدین کی اصلاح کے لیے کافی ہے کہ امام ابوحاتم رحمہ اللہ شیعہ ہونے کے باوجود ان کو سچا قرار دے رہے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ ہونا اصولِ حدیث میں کوئی جرح نہیں ہے اور میرٹھی صاحب کا اس پر بے سروپا روایات بیان کرنے کا الزام لگانا بہت بڑا بہتان ہے۔

⑦ رہا امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ کا عدی کو غالی شیعہ کہنا تو اولاً اس کی کوئی سند ہمیں نہیں مل سکی۔ ثانیاً اس کا معنی رافضی ہونا نہیں، لہٰذا یہ کوئی جرح نہیں، جیسا کہ ہم بارہا بیان کر چکے ہیں۔

(۴) رہا ابو اسحاق جوزجانی کا انھیں سائل عن القصد (اعتدال سے ہٹے ہونے) قرار دینا تو یہ کوئی جرح ہے؟ متقدمین کی اصطلاح میں جن کو شیعہ کہا جاتا تھا وہ واقعی اعتدال سے ہٹے ہوئے ہوتے تھے لیکن ان کا اعتدال سے ہٹنا انھیں تفریق کی طرف نہیں لے جاتا تھا وہ تو اس بے اعتدالی میں باوجود ثقہ ہوتے تھے لہٰذا اس کا ان کی حدیث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

نیز ہم باب نمبر ⑥ میں بیان کر چکے ہیں کہ ابو اسحاق جوزجانی ناصبی ہیں۔ شیعہ راویوں کے خلاف جرح میں وہ خود اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں لہٰذا ان کی یہ جرح اصولاً بھی مردود ہے۔

(۵) رہا امام شعبہ رحمہ اللہ کا ان کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ موقوف روایات کو مرفوع بیان کر دینے والے تھے تو ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ اس جرح کا تعلق اس حدیث سے ہی نہیں، یہ بات میرٹھی صاحب کی کم عقلی کو ظاہر کرنے کے سوا کوئی فائدہ نہیں دیتی۔

یہ تھے میرٹھی صاحب کے عدی بن ثابت پر اعتراضات والزامات جن کا حشر آپ نے دیکھ لیا ہے۔ اب آپ خود انصاف سے کام لے کر فیصلہ کریں کہ بھلا اس وجہ سے حدیثِ صحیح بخاری کا انکار کرنا عدل وانصاف کا خون کرنے کے مترادف ہے یا نہیں؟

فصلِ ثانی: عقلی اعتراضات کا جائزہ

❀ "نامعقولیت" کا دعویٰ اور امام بخاری سمیت تمام محدثین کی قرآن فہمی پر کڑی تنقید!

جب اس حدیث کی سند میں کوئی قابلِ التفات اعتراض نہیں ہے تو پھر اس پر عقلی اعتراضات کرنا تو بالکل اسی طرح ہے جیسے بعض ناعاقبت اندیش لوگ قرآن کریم پر اعتراضات کر دیتے ہیں۔ اس سے نہ قرآن کریم کی صحت پر کچھ اثر پڑتا ہے اور نہ حدیثِ نبوی ﷺ کی صحت مشکوک ہوتی ہے۔

آیئے ان کے "ان عقلی" اعتراض کا علمی و تحقیقی جائزہ لیں۔ مدیر تجلی صاحب لکھتے ہیں:

"میں کہتا ہوں کہ حضرت زید بن ثابت ﷺ نہایت ذہین و فہیم اور حافظ قرآن و کاتب وحی صحابی تھے۔ یقیناً یہ منقول اور قطعاً غلط بات انہوں نے نہیں کہی، کیونکہ المنافقین سے اس آیت میں عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کو جو جنگ احد کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی مدینہ سے نکلے تھے اور راستے سے ہی واپس ہوگئے تھے، یہ کہہ کر کہ لو نعلم قتالا لاتبعناکم اور اپنے اسی عمل شنیع سے انہوں نے باقی ماندہ مسلمانوں میں پست ہمتی پیدا کرنی چاہی تھی، ہو ہی نہیں سکتی۔ بے وقوف شخص مراد لے سکتا ہے، جس کے علم و حفظ میں بعد کی آیت نہ ہو۔ بعد کی آیت یہ ہے۔۔۔

یعنی ان منافقین کی آرزو ہے کہ تم بھی کافر ہوجاؤ جیسے وہ کافر ہوگئے۔ اس طرح تم سب برابر ہوجاؤ۔۔۔ لہٰذا تم اہل ایمان ان میں سے دوست نہ بنانا یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کریں۔۔۔

لفظ حتی یھاجروا فی سبیل اللہ بے تکلف اعلان کر رہا ہے کہ ذکر مدینہ میں رہنے والے منافقین عبداللہ بن ابی کے ساتھیوں کا نہیں، جو جنگ احد کے موقع پر مدینہ واپس ہوگئے تھے اور پورا رکوع مطالعہ کر جائیے تو قطعاً واضح ہوجائے گا کہ فما لکم فی المنافقین فئتین میں منافقین سے مراد وہ لوگ ہیں، جو مدینہ سے باہر مختلف قبائل میں سے مسلمان ہوگئے تھے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ ہجرت کر کے مدینہ آجاؤ تاکہ اسلام کو اچھی طرح سمجھو، قرآن کو یاد کرسکو اور صحیح معنوں میں اسلامی زندگی گزارنا جان جاؤ۔ مگر ان نو مسلم لوگوں نے اس حکم کی قصداً تعمیل نہ کی اور یہ خیال کر کے ہجرت سے باز رہے کہ مدینہ پہنچ کر کیا کریں گے، کیا کھائیں گے، کیا پہنیں گے؟

سیاسی و جنگی ضرورت کے تحت ان قبائل کو سزا دینے کی ضرورت تھی، جن میں اس طرح کے

انکو ڈھکا نام نہاد مسلمان تھے۔ ان مسلمانوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے ہجرت نہ کرنے کی وجہ سے وہ بھی پورے قبیلہ کی طرح محل قتل و قتال ہیں اور ان کا اسلام غیر معتبر ہے یا انہیں مسلمان سمجھا جائے اور ان سے جنگ کرنے اور انہیں قتل کرنے سے گریز کیا جائے! کچھ مسلمانوں کا خیال وہ تھا اور کچھ کا یہ۔

انہیں کے متعلق فرمایا کہ ایسے نام نہاد مسلمانوں کو اپنا نہ سمجھو اور تم سب باتفاق رائے انہیں گمراہ و بدبخت ہی مانو۔۔۔

یہ غلط روایت عدی بن ثابت کی ساختہ پرداختہ ہے۔ راویانِ حدیث کو قرآن یاد کرنے، اسے سمجھنے اور اس میں غور و تدبر کرنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ امام بخاری نے آیت فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ کو بعد کی آیات کے ساتھ ملا کر پڑھا اور سمجھا ہوتا تو زید بن ثابت کی طرف منسوب اس حدیث کو ہرگز درج صحیح نہ فرماتے۔" ❶

جواب: ① سب سے پہلے تو ہم میرٹھی صاحب کی سب سے آخری بات کا جواب دیتے ہیں۔ کیونکہ عدی بن ثابت کے بارے میں تو قارئین کرام مزید کسی تفصیل کے محتاج نہیں رہے۔

اب رہا میرٹھی صاحب کا راویانِ حدیث اور خصوصاً امام بخاری رحمہ اللہ کے خلاف قرآن کو یاد نہ کرنے، نہ سمجھنے اور غور و تدبر نہ کرنے کی بات کرنا تو اس بات نے خود انہی کو قیامت تک کے لیے رسوا کیا ہے، کیونکہ قارئین باب نمبر ② میں ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ میرٹھی صاحب نے قرآن کریم کے الفاظ فَلَوْ نَعْلَمُ کو عربیت کے لحاظ سے غلط کہہ کر اپنی عقبی خراب کر لی تھی۔ اب ملاحظہ فرمائیں کہ یہاں پر انہوں نے خود وہی الفاظ لکھ دیئے ہیں کہ منافقین نے لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ": 1/185 ۔ 9

کیا شخص کیمو ... ہی کہا تھا!

میرٹھی صاحب کی ان دونوں متناقض عبارتوں میں (۲۴۰-۲۰۸) صرف بارہ صفحات کا فاصلہ ہے۔ اب ہر انصاف پسند قاری فیصلہ کر سکتا ہے کہ قرآن، راویانِ حدیث اور امام بخاری نے تھے کو یاد نہ تھا یا خود میرٹھی صاحب کو ہی انہیں بارہ صفحات قبل لکھی ہوئی اپنی بات بھی یاد نہیں رہ سکی؟ کسی کی پگڑی اچھالنا بہت آسان ہے اور اپنی۔۔۔

تف ہے ایسی تحقیق پر، جو میرٹھی صاحب کی سی "عزت افزائی" کے باوجود قائم رہے!

(۲) اس حدیث میں عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کا کوئی ذکر نہیں۔ میرٹھی صاحب نے اپنی طرف سے صحیح بخاری پر یہ افترا کیا ہے کہ اس میں ان کی بات ہو رہی ہے۔
صحیح بخاری میں صرف اتنا بیان ہے کہ کچھ منافقین جو جنگ کے لیے پہلے مسلمانوں کے ساتھ شامل ہوئے تھے، پھر مسلمان فوج سے جدا ہو گئے تھے اور ان کے بارے میں صحابہ کرام مختلف الخیال ہو گئے تھے۔ صحیح بخاری کے علاوہ جن روایات میں اس آیتِ کریمہ کا مصداق عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کو ٹھہرایا گیا ہے، وہ یا تو بے سند ہیں یا ان میں ضعف و انقطاع ہے۔ فتح الباری (۸/۲۵۶) میں اگرچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا بھی رجحان اسی طرف ہے کہ یہاں عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی مراد ہیں، لیکن انہوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ عبداللہ بن ابی منافق اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں اس آیت کے نزول کا قصہ صحیح بخاری میں نہیں، بلکہ اور کتب میں ہے۔ یہی علمی دیانت کا تقاضا ہے، لہٰذا میرٹھی صاحب کا اسے صحیح بخاری کی طرف منسوب کر کے اس پر اعتراضات کرنا ناانصافی ہے، کوئی علمی کاوش نہیں ہے۔

(۳) ہجرت کا مطلب ہر جگہ اور ہر وقت مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے جانا نہیں ہوتا، بلکہ یہ ایک جامع لفظ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((والمهاجر من هجر ما نهى الله عنه))

"اور جہاد کرنے والا وہ ہے جو اللہ کی منع کردہ چیزوں کو چھوڑ دے۔" ❶

لہٰذا اگر عبداللہ بن اُبَی اور اس کے ساتھی بھی اس آیت کریمہ کے مصداق قرار دیے جائیں تو کوئی اعتراض نہیں آتا، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب تک منافقین اللہ کے منع کردہ کام یعنی نفاق کو اللہ کے رضا کے لیے چھوڑ نہ دیں، اس وقت تک ان سے دوستی نہ کرو، اگر وہ نفاق سے باز نہ آئیں تو پھر ان سے لڑائی کرو۔۔۔

④ اب میرٹھی صاحب کے وہ معتقدین، جن کے ذہن میں اب بھی ان کا کچھ اعتقاد باقی ہے، ان سے سوال ہے کہ صحیح بخاری کی اس اتفاقی طور پر صحیح حدیث کا انکار کر کے جو تفسیر میرٹھی صاحب نے خود کی ہے، اس کی کیا دلیل ہے؟ میرٹھی صاحب خود تو غزوۂ اُحد میں موجود تھے نہ، تو کس ذریعہ سے ان کو یہ بات پہنچی ہوگی کہ اس آیت میں "تمام مجاہد مسلمانوں" کا ذکر ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم وغیرہ کی اس صحیح حدیث کے علاوہ جتنے بھی شانِ نزول اس آیت کریمہ کے ذکر کیے گئے ہیں، سب کے سب بے اصل اور سخت ضعیف ہیں، ان کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں:

① حدیث زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ❷

اس کی سند سخت "ضعیف" بلکہ موضوع ہے، کیونکہ اس میں جویبر بن سعید [illegible] "متروک" راوی ہے۔ [illegible] امام [illegible] کی "تفسیر" بھی اس [illegible] ہے۔

❶ صحیح بخاری [illegible]

❷ [illegible]
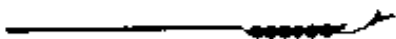
(۲) حدیث عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ❶

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

رواه أحمد، وفيه ابن إسحاق، وهو مدلس، وأبو سلمة لم يسمع من أبيه.

"اسے امام احمد نے بیان کیا ہے، اس میں محمد بن اسحاق ہیں اور وہ مدلس ہیں، نیز ابو سلمہ نے اپنے والد سے سماع نہیں کیا۔" ❷

اور جس روایت پر اعتبار کر کے میرٹھی صاحب نے یہ تفسیر کی ہے، اس کا حال بھی ملاحظہ فرمائیں:

(۳) حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما ❸

اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے، سند کا سلسلہ یوں ہے:

حدثني محمد بن سعد، قال: حدثني أبي (سعد بن محمد)، قال: حدثني عمي (الحسين بن الحسن بن عطية)، قال: حدثني أبي (الحسن بن عطية)، عن أبيه (عطية بن سعد بن جنادة)، عن ابن عباس ...

اب ترتیب وار اس سند کے سارے راویوں کے حالات ملاحظہ فرمائیں، جس پر میرٹھی صاحب نے اعتماد کر کے صحیح بخاری کی اتفاقی طور پر صحیح حدیث کا انکار کیا ہے:

---

❶ مسند الامام احمد ۱/۱۹۳

❷ مجمع الزوائد: ۲/۹۶

❸ تفسیر ابن ابی حاتم: ۳۳۱۳ - تفسیر الطبری ۸/۱

ا۔ محمد بن سعد العوفی:

خطیب بغدادی رحمہ اللہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

كان لينا في الحديث "وہ حدیث میں کمزور تھا۔" ❶

۲۔ سعد بن محمد العوفی:

امام احمد رحمہ اللہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

ذاك جهمي ... لو لم يكن هذا أيضا لم يكن ممن يستأهل أن يكتب عنه.

"یہ جہمی راوی ہے، اگر یہ ایسا نہ بھی ہوتا تو ان لوگوں میں سے نہیں، جن کی حدیث لکھنے کے قابل سمجھی جاتی ہے۔" ❷

۳۔ الحسین بن الحسن بن عطیہ العوفی:

امام ابوحاتم رحمہ اللہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

ضعيف الحديث. "اس کی حدیث ضعیف ہوتی ہے۔" ❸

امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے اسے "ضعیف" قرار دیا ہے۔ ❹

امام ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

❶ تاریخ بغداد للخطیب: ۳۲۲/۵

❷ تاریخ بغداد للخطیب: ۱۲۶/۵ و سندہ حسن ان شاء اللہ

❸ الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم: ۴۸/۳

❹ الکامل لابن عدی: ۳۶۴/۲

وللحسين بن الحسن أحاديث عن أبيه عن الأعمش وعن أبيه وعن غيرهما وأشياء لا يتابع عليه .

”حسین بن حسن کی اپنے والد کے واسطے سے اعمش سے اور اپنے والد سے اور ان کے علاوہ سے احادیث اور کئی دوسرے منکر آثار ہیں، جن پر اس کی کوئی موافقت نہیں کرتا۔“ ❶

امام ابن سعد رحمہ اللہ لکھتے ہیں

سمع سماعا كثيرا ، وكان ضعيفا في الحديث ...

”اس نے (احادیث کا) بہت زیادہ سماع کیا تھا، لیکن حدیث میں ضعیف تھا۔“ ❷

امام عقیلی رحمہ اللہ نے بھی اسے ”ضعیف“ راویوں میں شمار کیا ہے۔ ❸

امام ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

منكر الحديث .. ولا يجوز الاحتجاج بخبره .

”یہ منکر الحدیث تھا۔۔۔ اس کی حدیث سے حجت لینا جائز ہی نہیں۔“ ❹

علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے اسے ”ضعیف ومتروک“ راویوں میں شمار کیا ہے۔ ❺

۳۔ الحسن بن عطیہ بن سعد:

امام بخاری رحمہ اللہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

---

❶ الكامل في ضعفاء الرجال لابن عدي: ٢/ ٣٦٣

❷ طبقات الكبرى لابن سعد: ٧/ ٣٣١

❸ الضعفاء للعقيلي: ١/ ١٥٠

❹ المجروحين لابن حبان: ٢٣٦

❺ كتاب الضعفاء والمتروكين لابن الجوزي: ١/ ٢١١

ليس بذاك . "یہ اس (حدیث) کے قابل نہیں۔" ❶

امام ابو حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ضعيف الحديث . "اس کی حدیث ضعیف ہوتی ہے۔" ❷

امام ابن حبان رحمہ اللہ کا فرمان ہے:

واحاديث الحسن بن عطية ليست بنقية .

"حسن بن عطیہ کی احادیث صاف (صحیح) نہیں ہیں۔" ❸

نیز لکھتے ہیں:

منكر الحديث ... ووجب تركه .

"یہ منکر الحدیث راوی ہے۔۔۔ اس (کی احادیث) کو چھوڑ دینا واجب ہو گیا ہے۔" ❹

علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے اسے "ضعیف و متروک" راویوں میں شمار کیا ہے۔ ❺

۵۔ عطیہ بن سعد العوفی:

جمہور کے نزدیک "ضعیف" ہے، نیز "مدلس" بھی ہے۔

حافظ نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ضعيف عند الجمهور .

---

❶ التاريخ الكبير للبخاري : ٢٥٤٢

❷ الجرح والتعديل لابن ابي حاتم : ٢٦/٣

❸ الثقات لابن حبان : ١٧٠/٦

❹ المجروحين لابن حبان : ٢٣٤/١

❺ كتاب الضعفاء والمتروكين لابن الجوزي : ٢٠٥/١

"جمہور کے نزدیک یہ راوی ضعیف ہے۔" ❶

حافظ عراقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ضعفه الجمهور. "اسے اکثر محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔" ❷

حافظ ہیثمی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

والأكثر على تضعيفه. "اکثر ائمہ اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔" ❸

حافظ ابن الملقن رحمہ اللہ اسے "ضعیف" قرار دے کر لکھتے ہیں:

والجمهور على تضعيفه "جمہور اس کی تضعیف کرتے ہیں۔" ❹

امام ہشیم بن بشیر اور امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے اسے "ضعیف" قرار دیا ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ضعيف الحديث. "یہ ضعیف حدیث والا ہے۔" ❺

امام ابو زرعہ الرازی نے اسے "لیّن" کہا ہے اور امام ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ضعيف الحديث، يكتب حديثه.

"ضعیف الحدیث ہے، اس کی حدیث (متابعات و شواہد میں) لکھی جائے گی۔" ❻

امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے "ضعیف" قرار دیا ہے۔ ❼

---

❶ تهذيب الأسماء واللغات للنووي: ۴۸/۱

❷ طرح التثريب لابن العراقي: ۴۲/۳

❸ مجمع الزوائد: ۱۲۴/۱۰

❹ البدر المنير لابن الملقن: ۳۶۴/۷

❺ الجرح والتعديل: ۲۸۳/۶

❻ الجرح والتعديل لابن أبي حاتم: ۲۸۳/۶

❼ سنن الدارقطني: ۳۹/۴

نیز فرماتے ہیں کہ "مضطرب الحدیث" ہے۔ ❶

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

كان يحيىٰ يتكلم في عطية .

"امام یحییٰ عطیہ پر کلام (جرح) کرتے تھے۔" ❷

نیز فرماتے ہیں:

كان يحيىٰ لا يروي عن عطية .

"امام یحییٰ عطیہ بن سعد العوفی سے روایت نہیں کرتے تھے۔" ❸

امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں

ضعيف ، إلا أنه يكتب حديثه .

"یہ راوی ضعیف ہے، البتہ اس کی روایت (متابعات و شواہد) میں لکھی جائے گی۔" ❹

امام نسائی رحمہ اللہ نے "ضعیف" کہا ہے۔ ❺

امام ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں!

وهو مع ضعفه يكتب حديثه .

"ضعیف ہونے کے باوجود اس کی حدیث (متابعات و شواہد) میں لکھی جائے گی۔" ❻

---

❶ [illegible]

❷ [illegible]

❸ [illegible]

❹ [illegible]

❺ [illegible]

❻ [illegible]

امام ساجی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

ليس بحجة. "قابلِ حجت نہیں ہے۔" ❶

حافظ ابن حزم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ضعيف جدًا. "سخت ضعیف ہے۔" ❷

حافظ نووی رحمہ اللہ نے بھی "ضعیف" کہا ہے۔ ❸

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

ضعيف الحديث، مشهور بالتدليس القبيح.

"یہ راوی ضعیف الحدیث اور بری تدلیس کے ساتھ مشہور ہے۔" ❹

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اسے "ضعیف" کہا ہے۔ ❺

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ بھی "ضعیف" قرار دیتے ہیں۔ ❻

لہٰذا امام عجلی، امام ابن سعد اور امام ترمذی رحمہم اللہ کا اسے "ثقہ" کہنا جمہور کے خلاف ہونے کی وجہ سے قابلِ قبول نہیں ہے۔

اب قارئین کرام ہی فیصلہ فرمائیں کہ عدی بن ثابت جیسے ثقہ راوی پر میرٹھی صاحب کا جرح کرنا، جس کو کسی ایک محدث نے بھی "ضعیف" قرار نہیں دیا تھا، لیکن دوسری طرف اس طرح

---

❶ تہذیب التہذیب: [illegible]

❷ المحلی لابن حزم: [illegible]

❸ خلاصۃ الاحکام للنووی: [illegible]

❹ طبقات المدلسین لابن حجر: [illegible]

❺ میزان الاعتدال للذہبی: [illegible]

❻ تفسیر ابن کثیر: [illegible]

کے راوی پر اعتماد کرتا ہے جسے درجنوں محدثین نے واضح طور پر "ضعیف" قرار دیا ہے! یہ کہاں کا انصاف ہے؟

اب قارئین ہی بتائیں کہ اس میں قصور صحیح بخاری کا ہے یا میرٹھی صاحب کی "سمجھداری" کا؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نواں باب

سیدنا علی ؓ کی منقبت میں سیدنا بریدہ بن حصیب ؓ کی حدیث

صحیح بخاری میں سیدنا بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث مروی ہے کہ:

بعث النبيّ صلّى الله عليه وسلّم عليّا إلى خالد ليقبض الخمس ، وكنت أبغض عليّا ، وقد اغتسل ، فقلت لخالد : ألا ترى إلى هذا ، فلمّا قدمنا على النبيّ صلّى الله عليه وسلّم ذكرت ذلك له ، فقال : يا بريدة ! أتبغض عليّا ؟ فقلت : نعم ! قال : لا تبغضه ، فإنّ له في الخمس أكثر من ذلك .

"نبی اکرم ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کی طرف بھیجا تاکہ وہ مالِ خمس کو قبضے میں لیں۔ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے نفرت رکھتا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے (رات کو مالِ غنیمت کی ایک لونڈی سے جماع کیا اور صبح کو) غسل کیا۔ میں نے کہا: اے خالد! کیا آپ اس کی طرف نہیں دیکھتے؟ جب ہم نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تو میں نے آپ ﷺ سے یہ واقعہ ذکر کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا آپ علی (رضی اللہ عنہ) سے نفرت کرتے ہیں؟ میں نے کہا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: آپ ان سے بغض نہ رکھیں، کیونکہ ان کا مالِ خمس میں اس سے بھی زیادہ حصہ ہے۔" ❶

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

❶ صحیح البخاری: ۴۳۵۰

فلا تبغضه، وإن كنت تحبه فازدد له حبًا، فوالذي نفس محمد بيده لنصيب آل علي في الخمس أفضل من وصيفة...

"(اے بریدہ!) آپ ان (علی رضی اللہ عنہ) سے بغض نہ رکھیں اور اگر ان سے محبت ہے تو ان سے محبت میں اضافہ کر لیں، اس ذات کی قسم ہے، جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! علی رضی اللہ عنہ کی آل کا مالِ خمس میں حصہ ایک لونڈی سے زیادہ ہے..." ❶

ایک روایت ان الفاظ سے ہے:

فقال: ((لا تقع في علي، فإنه مني وأنا منه، وهو وليكم بعدي، وإنه مني وأنا منه، وهو وليكم بعدي))

"آپ ﷺ نے فرمایا: (اے بریدہ) آپ علی (رضی اللہ عنہ) کی شان میں گستاخی نہ کریں، کیونکہ وہ مجھ سے اور میں ان سے ہوں اور وہ میرے بعد تمہارے ولی ہیں۔ یقیناً وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں اور وہ میرے بعد تمہارے ولی ہیں۔" ❷

اس حدیث میں چونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت بیان ہوئی ہے، لہٰذا شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب کو برداشت نہیں ہوئی اور انھوں نے اول فول باتوں کو ملا کر کچھ بے ہودہ اعتراضات شروع کر دیے ہیں۔

آیئے ان کے اعتراضات کا علمی محاسبہ کریں تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو سکے۔

---

❶ مسند الإمام أحمد: 350/5، وسنده صحيح

❷ مسند الإمام أحمد: 356/5، وسنده حسن

فصلِ اوّل: فنی اعتراضات کا جائزہ

علی بن سوید بن منجوف پر رافضی اور کذاب ہونے کا الزام!

اس حدیث کو "ضعیف" قرار دینے کے لیے میرٹھی صاحب کے پاس کوئی فنی اعتراض نہیں ہے اس لیے وہ لکھتے ہیں:

"مگر یہ تو ایک فرضی قصہ ہے جو کسی بدبخت راوی مثلاً علی بن سوید بن منجوف کا گھڑا ہوا ہے۔" 1

نیز لکھتے ہیں:

"اور میرا خیال ہے کہ علی بن سوید بن منجوف کوئی رافضی اور غالی شیعہ تھا۔ یہ حدیث اس انداز سے اسی کی ساختہ پرداختہ ہے۔۔۔" 2

تبصرہ ① "غالباً" اور "میرا خیال ہے" کے الفاظ سے

ہر ذی شعور آدمی اس حدیث پر اعتراض میں میرٹھی صاحب کے غیر علمی انداز اور خود اعتمادی کے فقدان کا اندازہ بخوبی کر سکتا ہے۔ انہوں نے اس حدیث کے ایک راوی علی بن سوید بن منجوف کو بغیر کسی دلیل کے صرف اپنے باطل زعم و خیال کو کام میں لاتے ہوئے کوئی "رافضی" اور "غالی شیعہ" قرار دے دیا ہے اور اس پر اس حدیث کے گھڑنے کا بے بنیاد الزام لگا دیا ہے۔

لیکن سوچنے کی بات ہے کہ یہ الزام تو علی بن سوید کا کوئی ہم عصر یا کوئی ماہرِ فن محدث ہی اس کے حالات سے واقف ہو کر اس پر لگا سکتا ہے۔ درجنوں صدیاں گزر جانے کے بعد میرٹھی صاحب

1 "صحیح بخاری کا مطالعہ": 1/92

2 "صحیح بخاری کا مطالعہ": 1/93

جیسا شخص اگر اس کے بارے میں کوئی ایسی بات کرتا ہے تو وہ دیوانے کی بڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

علی بن سوید بن منجوف ثقہ راوی ہے

آج تک کسی ایک محدث نے بھی علی بن سوید بن منجوف کو رافضی یا غالی شیعہ نہیں کہا، بلکہ سب نے بیک زبان ان کی تعریف وتوثیق کی ہے، جیسا کہ:

۱۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ما أرى به بأسا.

"میں ان میں کوئی حرج (خرابی) محسوس نہیں کرتا۔" ❶

۲۔ امام یحییٰ بن سعید القطان رحمہ اللہ ان سے روایات بیان کرتے تھے ❷ اور وہ صرف ثقہ سے ہی روایات لیتے تھے لہٰذا ان کے نزدیک بھی علی بن سوید ثقہ راوی ہیں۔

۳۔ امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

علي بن سويد بن منجوف السدوسي، ثقة.

"علی بن سوید بن منجوف سدوسی ثقہ راوی ہیں۔" ❸

۴۔ امام احمد بن عبداللہ العجلی رحمہ اللہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

بصري، ثقة.

"یہ بصرہ کے رہنے والے ثقہ راوی تھے۔" ❹

---

❶ العلل ومعرفة الرجال لأحمد بن حنبل: ۲/ ٤۹۱، ت: ۳۲٦۳

❷ الجرح والتعديل لابن أبي حاتم: ٦/ ۱۸۷ ❸ الجرح والتعديل: ٦/ ۱۸۷ وسنده صحيح

❹ معرفة الثقات للعجلي: ۲/ ١٥٤، ت: ١٢٩٥

۵۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ بھی انہیں ثقہ قرار دیتے ہیں۔ [1]

۶۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان سے اپنی صحیح میں روایت لے کر ان کی توثیق کی ہے۔

۷۔ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے ان کی حدیث کو صحیح قرار دے کر ان کی توثیق کی ہے۔ [2]

۸۔ امام ابوعوانہ رحمہ اللہ نے بھی ان کی توثیق ضمنی کی ہے۔ [3]

۹۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے بھی ان کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے۔ [4]

۱۰۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لا بأس به.

"ان میں کسی قسم کی کوئی خرابی نہیں ہے۔" [5]

تلك عشرة كاملة. یہ پوری دس توثیقیں ہیں۔

دیکھا قارئین آپ نے کہ جس راوی کو محدثین بیک زبان ثقہ قرار دے رہے ہیں، اسے مرزا صاحب رافضی، غالی شیعہ، حدیث گھڑنے والا وغیرہ کہہ کر حدیث سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں، حالانکہ علی بن سوید بن منجوف رحمہ اللہ پر جرح کا ادنیٰ ترین کلمہ بھی ثابت نہیں۔ راویانِ حدیث کے بارے میں محدثین کی انصاف پر مبنی بات مانی جائے گی یا مرزا صاحب کا سفید جھوٹ تسلیم کیا جائے گا؟

مرزا صاحب کے معتقدین توجہ فرمائیں!

مرزا صاحب کے معتقدین کو چیلنج ہے کہ وہ کسی ایک محدث سے علی بن سوید بن منجوف کا

---

[1] سوالات الحاکم للدارقطني: ٤١٤

[2] [illegible] صحیح ابن خزیمہ: ٢/٨٤٢/٣٢٦٤

[3] مسند ابی عوانہ: ٣٧٢٣

[4] الثقات لابن حبان: ٧/٢١٠

[5] تقریب التہذیب: ٤٧٩٩

رافضی، غالی شیعہ یا احادیث گھڑنے والا ہونا ثابت کریں، ورنہ اعتراف کرلیں کہ صحیح بخاری پر میرٹھی صاحب کی طرف سے کیے گئے اعتراضات کی کوئی وقعت نہیں۔

② پھر اس حدیث کو بیان کرنے میں علی بن سوید بن منجوف اکیلے نہیں ہیں کہ ان پر اس کو گھڑنے کا الزام درست ہو سکے، بلکہ کئی اور ثقہ راویوں مثلاً عبدالجلیل بن عطیہ ❶ اور اجلح الکندی ❷ نے بھی یہی واقعہ عبداللہ بن بریدہ سے بیان کیا ہے، لہٰذا علی بن سوید بن منجوف پر میرٹھی صاحب کی یہ جرح بالکل بے بنیاد ہے۔

قارئین! جب میرٹھی صاحب کو علم ہوا کہ اس حدیث کے بیان میں علی بن سوید بن منجوف اکیلے نہیں ہیں، بلکہ مذکورہ راوی بھی علی بن سوید بن منجوف کی طرح یہی حدیث بیان کرتے ہیں تو انھوں نے اپنی سابقہ روایت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ان کی طرف بھی بلا دلیل طعن و تشنیع کے تیر پھینکنا شروع کر دیے ہیں اور اپنے آپ کو امام الجرح والتعدیل خیال کرتے ہوئے یہ ''فرمان'' جاری کردیا ہے:

''اس (علی بن سوید بن منجوف) کے علاوہ اجلح کندی، عبدالجلیل بن عطیہ اور سعد بن عبیدہ نے بھی عبداللہ بن بریدہ سے اسی مضمون کی روایت ہے۔ یہ سب لوگ بھی روافض تھے۔'' ❸

اب میرٹھی صاحب کا کوئی منصف مزاج معتقد ہمت کرے اور عبدالجلیل بن عطیہ اور سعد بن عبیدہ کے رافضی ہونے کے ثبوت میں دنیائے جرح و تعدیل میں سے کسی ایک معتبر امام کا کوئی ایک ثابت شدہ قول ہمیں دکھا کر اپنے صاحب کی عزت بچالے!

---

❶ مسند الامام احمد: ۵/۳۵۰، وسندہ صحیح

❷ مسند الامام احمد: ۵/۳۵۶، وسندہ حسن

❸ ''صحیح بخاری کا مطالعہ'': ۱/۹۲

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سعد بن عبیدہ "ثقہ" اور عبدالجلیل بن عطیہ "صدوق" راوی ہیں۔ ان کے رافضی ہونے کے بارے میں کسی معتبر امام کا کوئی ثابت شدہ قول تو درکنار، کسی غیر معتبر امام کا کوئی ایک غیر ثابت قول بھی نہیں ملتا۔

اجلح بن عبداللہ الکندی ثقہ راوی ہے

رہی بات اجلح بن عبداللہ الکندی کی تو وہ جمہور کے نزدیک ثقہ ہے، جیسا کہ:

❀ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

واختلف في الأجلح، والأكثر على توثيقه.

"الاجلح (بن عبداللہ الکندی) کے بارے میں اختلاف ہے، لیکن جمہور نے اس کی توثیق کی ہے۔" [1]

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ کا یہ فیصلہ بالکل برحق ہے، کیونکہ:

١. امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ ہے۔ [2]

٢. امام عجلی رحمہ اللہ بھی اسے ثقہ قرار دیتے ہیں۔ [3]

٣. ناقد رجال و حدیث، امام ابو احمد عبداللہ بن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وأجلح بن عبد الله له أحاديث صالحة، غير ما ذكرته، يروي عنه الكوفيون وغيرهم، ولم أجد له شيئا منكرا مجاوزا الحد، لا إسنادا ولا متنا، وهو أرجو أنه لا بأس به إلا أنه يعد في شيعة الكوفة، وهو عندي مستقيم الحديث، صدوق.

---

[1] مجمع الزوائد: ٩/٤٩١ [2] تاريخ ابن معين برواية الدوري: ٢٧٦١

[3] معرفة الثقات للعجلي: ت ٤٨

"جو روایات میں نے ذکر کی ہیں ، ان کے علاوہ اجلح بن عبد اللہ کی احادیث حسن ہیں ۔ اس سے کوفی وغیرہ راوی روایات بیان کرتے ہیں ۔ میں نے اس کی کوئی روایت ایسی منکر نہیں دیکھی جو (صحت کی) حد سے تجاوز کرنے والی (ضعیف) ہو، نہ سند کے اعتبار سے اور نہ متن کے اعتبار سے ۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ، ہاں ! یہ بات ہے کہ وہ کوفہ کے شیعہ میں شمار ہوتا تھا ۔ میرے نزدیک اس کی حدیث درست ہے اور وہ صدوق درجہ کا راوی ہے ۔" ❶

ہم باب نمبر ⑨ میں بالتفصیل بیان کر چکے ہیں کہ شیعہ ہونا کوئی جرح نہیں ہے ، جیسا کہ یہاں بھی امام ابن عدی باوجود اسے شیعہ قرار دینے کے "مستقیم الحدیث" اور "صدوق" بھی کہہ کر اس کی توثیق بھی کر رہے ہیں ۔

۵۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اس کے بارے میں فرمایا ہے :

ما أقرب الأجلح من فطر بن خليفة .

"اجلح فطر بن خلیفہ کے بہت قریب ہے !" ❷

یہ توثیق نسبی ہے ۔

توثیقِ نسبی کے لیے اصول

اس میں اصول یہ ہے کہ کوئی امام جس کی نسبت کسی راوی پر حکم لگائے ، اسی کا حکم تلاش کر کے فیصلہ کیا جاتا ہے ، مثلاً یہاں امام احمد رحمہ اللہ نے اجلح کو فطر بن خلیفہ کے ہم مرتبہ قرار دیا ہے ۔ اب ہم فطر بن خلیفہ کا حکم امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک معلوم کریں گے ۔ امام موصوف نے فطر بن خلیفہ

❶ الكامل في ضعفاء الرجال لابن عدي : ۲۲۸/۱

❷ العلل لأحمد بن حنبل ، ۲۸٤٩

کو "ثقہ صدوق" قرار دیا ہے۔ ❶

لہٰذا ان کے نزدیک اجلح بن عبداللہ کندی بھی "صدوق، حسن الحدیث" ہے۔

رہا امام احمد رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ اس کی کئی احادیث "منکر" ہیں ❷ تو اس کی تمام "منکر" روایات امام ابن عدی رحمہ اللہ نے ذکر کر دی ہیں اور صحیح بخاری والی زیرِ بحث حدیث ان میں نہیں ہے۔

٥۔ امام عمرو بن علی الفلاس رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وهو رجل من بجيلة، مستقيم الحديث صدوق.

"وہ بجیلہ سے تعلق رکھنے والا آدمی ہے، اس کی حدیث درست ہے اور وہ صدوق درجہ کا راوی ہے۔" ❸

٦۔ امام یعقوب بن سفیان الفسوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

كوفي، ثقة، في حديثه لين

"یہ کوفی ہے اور ثقہ راوی ہے، اس کی حدیث میں کچھ کمزوری ہے۔" ❹

جن روایت میں کمزوری ہے، وہ "منکر" روایات امام ابن عدی رحمہ اللہ نے بیان کر دی ہیں، باقی روایات بالکل صحیح ہیں، ان میں سے ایک زیرِ بحث حدیث بھی ہے۔

٧۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے اس کی حدیث کو "صحیح الاسناد" کہہ کر اس کی توثیق کی ہے اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی ان کی موافقت کی ہے۔ ❺

---

❶ العلل لأحمد بن حنبل: ٢٩٩

❷ الجرح والتعديل لابن أبي حاتم: ٢/٣٤٦

❸ الكامل لابن عدي: ١/٤٢٧، تهذيب الكمال: ت ٢٨٦، واللفظ له

❹ المعرفة والتاريخ للفسوي: ٣/٨٨ ❺ المستدرك على الصحيحين: ٣/٤٩١

۸۔ حافظ الضیاء المقدسی رحمہ اللہ نے بھی اس کی حدیث کو صحیح کہہ کر اس کی توثیق ضمنی کی ہے۔ ❶

۹۔ مسند ابی عوانہ ❷ میں بھی اس کی حدیث موجود ہے، لہٰذا یہ راوی امام ابوعوانہ کے نزدیک بھی ثقہ ہے۔

۱۰۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو ان راویوں میں ذکر کیا ہے، جن پر جرح تو کی گئی ہے، لیکن وہ جرح قابل اعتبار نہیں، حقیقت میں وہ ثقہ ہی ہیں۔ ❸

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ . "یہ پوری دس توثیقیں ہیں۔"

اجلح بن عبداللہ پر جرح کی حقیقت

۱۔ امام نسائی رحمہ اللہ کا اسے "ضعیف" کہنا ❹ ثابت نہیں ہو سکا، کیونکہ امام موصوف کی کتاب "الضعفاء والمتروکون" میں یہ قول نہیں مل سکا، نہ ہی کسی دوسری کتاب میں اس کی کوئی سند ملی ہے۔

۲۔ امام ابوداود رحمہ اللہ کا اسے "ضعیف" قرار دینا ❺ بھی ثابت نہیں ہے، کیونکہ اس کی بھی کوئی سند نہیں، اس کے برعکس امام موصوف نے خود اجلح کندی کی روایات ❻ پیش کر کے ان پر سکوت کیا ہے۔

---

❶ المختارة للضياء المقدسي: ١٢٤٦ ❷ ٤٥٩٦

❸ من تكلم فيه وهو موثق للذهبي: ٣٤/١

❹ تهذيب الكمال للمزي: ٢٧٨/٢

❺ تهذيب التهذيب لابن حجر: ١٦٥/١

❻ سنن أبي داود: ١٦٦٧، ٢٩٨٣، ٥١١٧، ٥٢٢٤]

٣۔ ابواسحاق ابراہیم بن یعقوب الجوزجانی کا اسے مفتری یعنی جھوٹا کہنا ❶ تو ہم باب نمبر ⑥ میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ جوزجانی خود ناصبی تھا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کے قائل شیعہ راویوں پر بھی یہ "رافضی" کے القابات تھوپ دیتا تھا لہٰذا محدثین کے نزدیک شیعہ راویوں کے خلاف اس کی جرح بالکل مقبول نہیں ہوتی، بلکہ اس کو پیش کرنا اصولِ حدیث سے ناواقفیت کی علامت ہے۔

٤۔ امام ابن سعد رحمہ اللہ کا اسے "ضعیف" کہنا ❷ جمہور کے خلاف ہونے کی وجہ سے قابلِ قبول نہیں۔

٥۔ باقی رہا امام یحییٰ بن سعید القطان رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ:

في نفسي منه شيء.

"میرے دل میں اس کے بارے میں کوئی کھٹک ہے۔" ❸

اور امام ابوحاتم رحمہ اللہ کا اسے کمزور قرار دینا ❹ اور امام ابن حبان رحمہ اللہ کا اس کے بارے میں یہ کہنا کہ:

لا يدري ما يقول... "وہ جو کہتا تھا اسے سمجھتا نہ تھا۔" ❺

تو یہ ان ائمہ کے تشدد پر محمول ہے (یعنی راویوں پر حکم لگانے میں زیادہ سختی سے کام لینے کی وجہ سے ہے)۔

---

❶ أحوال الرجال للجوزجاني ص [illegible] ت ٣٢

❷ الطبقات الكبرى لابن سعد: ٦/ ٣٥٠

❸ الجرح والتعديل لابن أبي حاتم: ٢/ ٣٤٦ وسنده صحيح

❹ الجرح والتعديل: ٢/ ٣٤٦

❺ المجروحين لابن حبان: ١/ ١٧٣

امام ابوحاتم، امام ابن القطان اور امام ابن حبان کی راویوں کے بارے سخت احتیاط

اصولِ حدیث کا ادنیٰ سا طالب علم بھی امام ابوحاتم رحمہ اللہ، امام یحییٰ بن سعید القطان رحمہ اللہ اور امام ابن حبان رحمہ اللہ کے راویوں کے بارے میں سخت رویے سے بخوبی آشنا ہے۔

امام ابوحاتم رحمہ اللہ کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

إذا وثّق أبو حاتم رجلا فتمسّك بقوله، فإنّه لا يوثّق إلّا رجلا صحيح الحديث، وإذا ليّن رجلا أو قال فيه: لا يحتجّ به، فتوقّف حتّى ترى ما قال غيره فيه، فإن وثّقه أحد، فلا تبن على تجريح أبي حاتم، فإنّه متعنّت في الرّجال، قد قال في طائفة من رجال الصّحاح: ليس بحجّة، ليس بقويّ، أو نحو ذلك.

"جب امام ابوحاتم رحمہ اللہ کسی راوی کو ثقہ قرار دیں تو ان کی بات کو مضبوطی سے پکڑ لیجیے، کیونکہ وہ صرف صحیح حدیث والے راوی کی ہی توثیق کرتے ہیں اور جب وہ کسی راوی کو کمزور قرار دیں یا اس کے بارے میں یہ کہہ دیں کہ اس کی حدیث سے حجت نہیں لی جائے گی تو آپ توقف کریں حتی کہ اس راوی کے بارے میں دوسرے ائمہ کی رائے دیکھ لیں۔ اگر کسی نے اس راوی کی توثیق کی ہو تو پھر امام ابوحاتم کی جرح پر اعتبار نہ کریں، کیونکہ امام ابوحاتم رحمہ اللہ راویوں (پر جرح) کے بارے میں سخت ہیں، انھوں نے صحاح (صحیح بخاری و مسلم وغیرہما) کے بہت سے راویوں کے بارے میں یہ کہہ دیا ہے کہ وہ حجت نہیں ہیں، قوی نہیں ہیں وغیرہ۔" ❶

امام یحییٰ بن سعید القطان رحمہ اللہ کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں:

❶ سیر اعلام النبلاء للذہبی: ۱۳/ ۲۶۰

كان يحيى بن سعيد متعنتا في نقد الرجال، فإذا رأيته قد وثق شيخا، فاعتمد عليه، أما إذا لين أحدا فتأن في أمره حتى ترى قول غيره فيه، فقد لين مثل إسرائيل وهمام وجماعة احتج بهم الشيخان...

''امام یحییٰ بن سعید نقد رجال میں بہت سخت تھے۔ جب آپ دیکھیں کہ انھوں نے کسی شیخ کو ثقہ کہا ہے تو اس پر اعتماد کر لیں لیکن جب وہ کسی کو کمزور قرار دیں تو اس کے بارے میں غور و فکر کریں حتیٰ کہ اس کے بارے میں دوسرے محدثین کے اقوال دیکھ لیں۔ کیونکہ انھوں نے اسرائیل، ہمام اور بہت سے ان راویوں کو بھی کمزور قرار دے چھوڑا ہے، جن سے امام بخاری و مسلم نے حجت لی ہے۔'' [1]

⑤ امام ابن حبان رحمہ اللہ بھی بعض ثقہ راویوں پر سختی کی وجہ سے جرح کر دیتے ہیں، ایک راوی افلح بن سعید القبائی کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

صدوق، يبالغ ابن حبان في الحط عليه. ''یہ صدوق (حسن الحدیث) راوی ہے امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اس پر جرح کرنے میں مبالغے سے کام لیا ہے۔'' [2]

دیکھا قارئین آپ نے کہ اجلح الکندی کے بارے میں دس ائمہ کی واضح توثیق ہم پیش کر چکے ہیں، جبکہ اس کے مقابلے میں جرح کے جو اقوال ملتے ہیں، ان میں سے کئی اقوال ان ائمہ سے ثابت ہی نہیں ہیں اور جو ثابت ہیں، ان میں سے جوزجانی کا قول تعصب اور امام ابو حاتم، امام یحییٰ بن سعید القطان و امام ابن حبان رحمہم اللہ کے اقوال تشدد کی وجہ سے ہیں۔ اور اصولی طور پر ان مردود اقوال میں سے بھی اکثر اقوال جرح میں صریح نہیں ہیں۔ باقی رہ گیا صرف امام ابن

---

[1] سیر اعلام النبلاء للذہبی: ۹/۱۸۳

[2] من تکلم فیہ وهو موثق للذهبی: ص ٥٠، ت: ٤٥

سعد رضی اللہ عنہ کا ایک قول تو وہ جمہور ائمہ کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

ثابت ہوا کہ علی بن سوید مَن مَعروف کے علاوہ عبدالجلیل بن عطیہ اور اجلح الکندی سے بھی یہ حدیث مروی ہے اور وہ دونوں ثقہ راوی ہیں۔ ان کو رافضی کہنے کا میرٹھی الزام بالکل غلط ہے۔

③ مسند الامام احمد (۴/ ۴۳۷) اور جامع ترمذی (۳۷۱۲) وغیرہما میں اس حدیث کا ''حسن'' درجہ کا ایک شاہد بھی موجود ہے۔

اس کے راوی جعفر بن سلیمان الضبعی کے بارے میں میرٹھی صاحب کا تبصرہ یہ ہے:

''اس کا راوی جعفر بن سلیمان رافضی تھا۔ حضرت معاویہ کا ذکر ہوتا تو انھیں گالیاں بکتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر ہوتا تو رونے بیٹھ جاتا تھا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ کیا تو شیخین ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو برا کہتا اور گالی بکتا ہے؟ بولا زبان سے انھیں برا نہیں کہتا اور دل میں جو ان کا بغض ہے، اس سے انکار نہیں کرتا۔ (تہذیب التہذیب)'' ❶

حالانکہ

جعفر بن سلیمان ضبعی ثقہ تھے

جعفر بن سلیمان رحمہ اللہ قطعاً رافضی نہیں تھے، نہ ہی سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بغض رکھتے تھے، بلکہ یہ بات میرٹھی صاحب نے علمِ رجال سے اپنی صریح جہالت کی بنا پر لکھ دی ہے، جیسا کہ ہم ابھی تفصیل سے سب کچھ بتانے والے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ثقہ راوی تھے، کیونکہ:

۱۔ امام علی بن المدینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ثقة عندنا. ''وہ ہمارے نزدیک ثقہ ہیں۔'' ❷

---

❶ ''صحیح بخاری کا مطالعہ'' (۱/ ۱۰۱)

❷ سؤالات ابن أبي شيبة لعلي بن المديني: ص ۱۰۳، رقم: ۹۱

۲۔ امام ابن معین رحمہ اللہ اسے ثقہ قرار دیتے ہیں۔ [1]

۳۔ امام حماد بن زید رحمہ اللہ بھی ان سے حدیث بیان کرنے سے نہیں روکتے تھے۔ [2]

۴۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

جعفر بن سليمان، لا بأس به ... إنما كان يتشيع.

"جعفر بن سلیمان میں کوئی خرابی نہیں۔۔۔ وہ صرف تشیع میں مبتلا تھے۔" [3]

۵۔ امام عبدالرحمن بن مہدی رحمہ اللہ ان سے روایت لیتے تھے اور ان کا یہ طریقہ تھا کہ وہ صرف ثقہ راویوں سے روایات بیان کرتے تھے۔ [4]

۶۔ امام ابن عدی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

ولجعفر حديث صالح وروايات كثيرة، وهو حسن الحديث، وهو معروف في التشيع ...

"جعفر (بن سلیمان) کی حدیث قابل قبول ہے اور بہت سی روایات انہوں نے بیان کی ہیں، وہ حسن الحدیث ہیں۔ تشیع میں معروف تھے۔" [5]

نیز لکھتے ہیں:

وأحاديثه ليست بالمنكرة، وما كان منها منكرا، فلعل البلاء فيه من الراوي عنه، وهو عندي ممن يجب أن يقبل حديثه.

---

[1] تاریخ ابن معین للدوری: ۴/۱۰۳

[2] الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم: ۲/۴۸۱، ۷۹۱، وسندہ صحیح

[3] الکامل فی ضعفاء الرجال لابن عدی: ۲/۱۴۵، وسندہ صحیح

[4] الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم: ۲/۴۸۱، وسندہ صحیح

[5] الکامل فی ضعفاء الرجال لابن عدی: ۲/۱۴۴

۱۱۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے کئی ایک مقامات پر جعفر بن سلیمان رحمہ اللہ سے حدیث بیان کرکے ان کی ثقاہت ثابت کی ہے۔ ❶

۱۲۔ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے بھی ان کی احادیث کو "صحیح" قرار دے کر ان کی توثیق کی ہے۔ ❷

۱۳۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے ان کی حدیث کو امام مسلم کی شرط پر "صحیح" قرار دیا ہے اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔ ❸

۱۴۔ امام ابو عوانہ رحمہ اللہ نے بھی ان کی بہت سی احادیث کو "صحیح" کہا ہے، جو کہ توثیق کی واضح علامت ہے۔ ❹

۱۵۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وكان جعفر بن سليمان من الثقات المتقنين في الروايات، غير أنه ينتحل الميل إلى أهل البيت، ولم يكن داعية إلى مذهبه، وليس بين أهل الحديث من أئمتنا خلاف أن الصدوق المتقن إذا كان فيه بدعة، ولم يكن يدعو إليها أن الاحتجاج بأخباره جائز.

"جعفر بن سلیمان روایات بیان کرنے میں پختہ اور ثقہ راویوں میں شمار ہوتے ہیں، ہاں! وہ اہل بیت کی طرف میلان (تشیع) کی طرف منسوب تھے، لیکن وہ اپنے مذہب کی

---

❶ صحیح مسلم: ۹۱۱/۴۸۸، ۱۲۱/۸، ۲۰۸، ۲۹۱۱ وغیرہ

❷ صحیح ابن خزیمہ: ۲۶۷، ۲۵۳۴، ۲۱۸۰

❸ المستدرک للحاکم: ۱/۲۸، ۲/۶۱۰، ۲/۸۹۲ وغیرہ

❹ مسند ابی عوانہ: ۶۰۶، ۴۰۷، ۷۸۲۴، ۹۷۴ وغیرہ

طرف دعوت دینے والے نہیں تھے اور ہمارے اہل حدیث (محدثین) ائمہ کرام کے درمیان اس بات پر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قول کے سچے اور حافظے کے پکے راوی میں اگر کوئی بدعت ہو، لیکن وہ اس کی طرف دعوت دینے والا نہ ہو تو اس کی احادیث سے دلیل لینا جائز ہوتا ہے۔"[1]

١٦. امام الضیاء المقدسی رحمہ اللہ نے بھی بہت سے مقامات پر ان کی توثیق ضمنی کی ہے۔[2]

١٧. علامہ ہیثمی نے بھی جعفر بن سلیمان کو صحیح مسلم کا راوی قرار دے کر ان کی توثیق کی ہے۔[3]

١٨. حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے سب اقوال کو مد نظر رکھ کر جعفر بن سلیمان کو ان راویوں میں ذکر کیا ہے، جن پر کلام تو کی گئی ہے، لیکن در حقیقت وہ ثقہ ہیں۔[4]

١٩. حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

صدوق، زاهد، لكنه كان يتشيع.

"وہ سچے اور عبادت گزار تھے، لیکن شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔"[5]

٢٠. امام بزار رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لم نسمع أحدا يطعن عليه في الحديث، ولا في خطأ فيه، إنما ذكرت

---

[1] الثقات لابن حبان: ٦/١٤٠

[2] الأحاديث المختارة للضياء المقدسي: ٦/٢٣٦، ١٠/١٩٩١، ٤٨٤٥، وغيرها

[3] مجمع الزوائد: ٦/١٠٦

[4] من تكلم فيه وهو موثق للذهبي: ٦٠

[5] تقريب التهذيب لابن حجر: ٩٤٤

شیعته، و اما حدیثه فمستقیم.

"ہم نے کسی کو حدیث کے معاملے میں ان (جعفر بن سلیمان رحمہ اللہ) پر جرح کرتے ہوئے نہیں پایا، نہ ہی ان (کی حدیث) میں کسی غلطی کے بارے میں (کسی نے ان پر کلام کیا ہے) صرف ان کی شیعیت کا ذکر کیا گیا ہے، رہی ان کی حدیث تو وہ بالکل صحیح ہے۔" ❶

جعفر بن سلیمان پر جرح کی حقیقت

مذکورہ اقوالِ محدثین سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ بعض ائمہ مثلاً سلیمان بن حرب رحمہ اللہ ❷، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ❸، جوزجانی ❹، یحییٰ بن سعید القطان رحمہ اللہ ❺ اور یحییٰ بن معین رحمہ اللہ ❻ نے جعفر بن سلیمان پر جو کلام کیا ہے یا ان سے روایت لینے سے احتراز کیا ہے، وہ صرف ان کے مذہب کی بنا پر ہے ورنہ ان کی حدیث تو اس میں کوئی جرح نہیں ہے۔ بلکہ کئی ائمہ مثلاً امام بخاری رحمہ اللہ ❼، یحییٰ بن معین رحمہ اللہ ❽، امام ابن سعد رحمہ اللہ ❾

---

❶ تہذیب التہذیب لابن حجر: ۹۷/۲

❷ الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم: ۴۸۱/۲، وسندہ صحیح

❸ الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم: ۴۸۱/۲، وسندہ صحیح

❹ احوال الرجال للجوزجانی: ت ۱۷۲

❺ تاریخ ابن معین بروایۃ الدوری: ۱۳۰/۴، ت ۳۴۲۳

❻ الضعفاء الکبیر للعقیلی: ۱۸۸/۱، وسندہ صحیح

❼ التاریخ الکبیر للبخاری: ۱۹۲/۲

❽ الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم: ۴۸۱/۲، وسندہ صحیح

❾ الطبقات الکبریٰ لابن سعد: ۲۸۸/۷

نے جعفر بن سلیمان کی حدیث پر جو کلام کی ہے، وہ صرف ثابت بن اسلم البنانی سے بیان کردہ روایات کے بارے میں ہے، نہ کہ تمام روایات کے بارے میں، جیسا کہ امام علی بن المدینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

أكثر جعفر، يعني ابن سليمان، عن ثابت، وكتب مراسيل، وفيها أحاديث مناكير عن ثابت عن النبيّ صلّى الله عليه وسلّم.

"جعفر بن سلیمان نے ثابت البنانی سے بہت زیادہ روایات بیان کی ہیں اور مرسل روایات بھی لکھی ہیں۔ ان میں کچھ منکر روایات بھی ہیں، جو ثابت البنانی (ڈائریکٹ) نبی اکرم ﷺ سے بیان کرتے ہیں۔" [1]

امام بخاری رحمہ اللہ کا قول بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

يخالف في بعض حديثه.

"وہ (ساری میں نہیں، بلکہ) کچھ حدیثوں میں (دوسرے ثقہ راویوں کی) مخالفت کرتا ہے۔" [2]

اب تو قارئین کرام کو یقین ہو گیا ہوگا کہ جعفر بن سلیمان کی تمام احادیث پر کلام نہیں کی گئی، بلکہ صرف ان روایات میں سے بعض "منکر" ہیں، جو جعفر بن سلیمان اپنے شیخ ثابت البنانی سے مرسلاً بیان کرتے ہیں، جبکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی منقبت کے بارے میں یہ حدیث جعفر بن سلیمان نے اپنے شیخ ثابت البنانی سے نہیں، بلکہ یزید الرشک سے بیان کی ہے، لہٰذا اسے "ضعیف" قرار دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔

[1] الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم: 481/2، وسندہ صحیح

[2] التاریخ الکبیر للبخاری: 192/2

جعفر بن سلیمان پر رافضی ہونے کے الزام کی حقیقت

رہا ان کے بارے میں میرٹھی صاحب کا یہ کہنا کہ وہ سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے دلی بغض رکھتے تھے تو یہ در اصل میرٹھی صاحب کے متعصبانہ ذہن کا شاخسانہ ہے۔ اگر میرٹھی صاحب کتب رجال میں جعفر بن سلیمان کے مکمل حالات پڑھ لیتے تو شاید انہیں جہالت کا مظاہرہ نہ کرنا پڑتا، کیونکہ:

امام ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وإنما الحكاية التي رويت عنه، يعني هذه الحكاية التي ذكرتها، إنما عنى به جارين كانا له، وقد تأذى بهما، يكنى أحدهما أبا بكر ويسمى الآخر عمر، فسئل عنهما، فقال: السب لا، ولكن بغضا يالك، ولم يعن به الشيخين...

"یہ جو حکایت ذکر کی گئی ہے، اس میں (ابوبکر و عمر سے) مراد جعفر بن سلیمان کے دو پڑوسی تھے، جن سے وہ تنگ آ چکے تھے۔ ان میں سے ایک کی کنیت ابوبکر اور دوسرے کا نام عمر تھا۔ جعفر بن سلیمان سے ان کے بارے میں (ان کے کسی رشتہ دار کی طرف سے) سوال کیا گیا تو فرمایا: میں ان کو گالیاں تو نہیں دیتا، البتہ تیرے رشتہ داروں کے ساتھ بغض رکھتا ہوں۔ جعفر بن سلیمان نے اس سے سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو مراد نہیں لیا تھا۔۔۔" [1]

ان کے رافضی ہونے کی نفی کرتے ہوئے امام ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وقد روى في فضائل الشيخين أيضا كما ذكرت بعضها.

"اور انہوں نے سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے فضائل میں بھی روایات بیان کی ہیں، جیسا کہ ان میں سے کچھ میں نے ذکر کر دی ہیں۔" [2]

---

[1] الكامل في ضعفاء الرجال لابن عدي: ٢/١٤٦ [2] الكامل: ٢/١٤٩

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے جب کہا گیا کہ سلیمان بن حرب، جعفر بن سلیمان سے حدیث لکھنے سے منع کرتے تھے تو آپ رحمہ اللہ نے فرمایا:

إنما كان يتشيع، وكان يحدث بأحاديث، يعني في فضل علي كرّم الله وجهه، وأهل البصرة يغلون في علي رضي الله عنه ... روى عنه عبدالرحمن بن مهدي وغيره.

"وہ (جعفر بن سلیمان) صرف شیعہ تھے (رافضی نہیں تھے) اور بہت سی احادیث سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں انہوں نے بیان کی تھیں۔ اہل بصرہ (اہل کوفہ کی مخالفت کرتے ہوئے) سیدنا علی رضی اللہ عنہ (سے محبت میں کمی کرنے میں) غلو سے کام لیتے تھے (اور سلیمان بن حرب بھی بصرہ سے تعلق رکھتے تھے، اسی لیے انہوں نے جعفر بن سلیمان پر جرح کر دی تھی)، حالانکہ ان (جعفر بن سلیمان) سے امام عبدالرحمن ابن مہدی رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ نے روایات لی ہیں (جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ رافضی نہیں تھے)۔" [1]

امام ابن عدی رحمہ اللہ نے جو روایات ذکر کی ہیں، ان میں سے ایک درج ذیل ہے:

فتح مکہ سے پہلے کی بات ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کے لیے مکہ میں داخل ہوئے۔ سیدنا عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے آگے چل رہے تھے اور شعر پڑھ رہے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو کہا کہ کیا حرم کے اندر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ شعر پڑھ رہے ہو؟ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خلّ عنه يا عمر! فوالذي نفسي بيده لكلامه أشد عليهم من وقع النبل.

"عمر! اس کو چھوڑ دو، اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اس کی کلام

---

[1] الجرح والتعدیل لابن أبي حاتم: 481/2، وسندہ صحیح

ان (کافروں) پر تیروں کی بوچھاڑ سے بھی سخت ہے۔" ❶

اس صحیح حدیث مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے سچے محب تھے حتیٰ کہ انہوں نے آپ ﷺ کے سامنے شعر پڑھنا بھی آپ ﷺ کی شانِ رسالت کے خلاف سمجھ لیا اور فوراً سختی سے منع کیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی یہ فضیلت جعفر بن سلیمان الضبعی نے ہی بیان کی ہے۔ اگر وہ رافضی ہوتے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت و منقبت اور ان کی محبِ رسول ہونے کی حدیث کبھی بیان نہ کرتے۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ويروى أن جعفرا كان يترفض ... وهذا غير صحيح عنه ...

"یہ بیان کیا گیا ہے کہ جعفر بن سلیمان رافضی تھے۔۔۔ لیکن یہ بات ان کے بارے میں ثابت نہیں ہے۔۔۔" ❷

اب بھی کوئی اگر جعفر بن سلیمان کو سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا دشمن کہے تو یہ اس کی اپنی سمجھ کا قصور ہے ورنہ حقیقتِ حال پوری طرح واضح ہو چکی ہے۔

امام ترمذی پر عمیر کی تنقید

انہی جہالت کے باوجود عمیر صاحب کا یہ قول امام ترمذی رحمہ اللہ کی صریح توہین ہے کہ

"مذکورہ امام ترمذی نے یہ حدیث اپنی کتاب میں ذکر کر کے کس اجر و ثواب کی توقع کی تھی۔ جبکہ موصوف نے خود بتاتے ہیں کہ [illegible] جعفر بن سلیمان الضبعی

---

❶ صحیح ابن حبان [illegible]

❷ میزان الاعتدال [illegible]

ہوئی ہے۔ خود بریدہ کو شک ہے اسے بیان کیا تھا مطرف نے عمران بن حصین سے۔" [1]

ہم اس پر اتنا ہی تبصرہ کریں گے کہ برقی صاحب کی آنکھیں بند ہوتے ہی ان کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ صحیح بخاری پر اعتراضات کر کے اور محدثین کرام کی شان میں گستاخیاں کر کے انہوں نے کس اجر و ثواب کی توقع کی تھی؟

اس ساری بحث سے معلوم ہوا کہ برقی صاحب کا علی بن سوید بن منجوف پر اعتراض کر کے صحیح بخاری کی اس صحیح حدیث کا انکار کرنا ان کی نری جہالت ہے، جسے وہ امام بخاری رحمہ اللہ اور پوری امتِ مسلمہ پر ٹھونس دینا چاہتے ہیں۔

جب دو اور ثقہ راویوں سے بھی یہی حدیث ثابت ہے تو محض اپنی عقل کو معیار بنا کر بیچارے علی بن سوید بن منجوف کو موردِ الزام ٹھہرانا ناحق ظلم ہے۔

یہ تو تھی صحیح بخاری کی اس اتفاقی طور پر صحیح حدیث پر ان کے "اصولی" اعتراض کی اصولی حیثیت۔ آئیے اب ان کے "عقلی" اعتراضات کی عقلی حیثیت معلوم کرتے ہیں!

فصلِ ثانی: عقلی اعتراضات کا جائزہ

مالِ غنیمت میں سیدنا علی کا کوئی حق نہ تھا!

"اوّل یہ کہ اس مالِ غنیمت میں حضرت علی کا کوئی حق نہ تھا، کیونکہ جس جنگ یا جن جنگوں کے نتیجہ میں یہ مال حاصل ہوا تھا، علی ان میں شریک نہ تھے۔ وہ مالِ غنیمت حضرت خالد اور ان کے ساتھی مجاہدین نے حاصل کیا تھا۔ حضرت علی کو خمس میں سے حصہ مل سکتا تھا، مگر نبی کریم ﷺ کے عطا فرمانے کے بعد۔ آپ کی تقسیم سے پہلے علی خمس میں سے کسی چیز کو اپنے

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۰

تصرف میں نہیں لا سکتے تھے۔ اپنے کسی مال میں تقسیم سے قبل اور اپنی ملکیت میں آ جانے سے پہلے تصرف کرنا غلول ہے، جو زبردست کبیرہ گناہ ہے۔ مالِ غنیمت میں یقیناً مجاہدین کا حصہ ہوتا ہے، لیکن تقسیم سے پہلے کوئی مجاہد اس میں سے کوئی چیز، خواہ کیسی ہی حقیر اور معمولی ہو، اپنے استعمال و تصرف میں نہیں لا سکتا۔ جو مجاہد ایسا کرے گا، وہ غلول کا مرتکب اور سزا کا مستحق ہوگا۔ کسی محلے میں عید الفطر کے موقع پر مسلمانوں نے صدقۂ فطر کا غلہ جمع کیا ہو تو کسی بھی فقیر یا مسکین کو جائز نہیں ہے کہ تقسیم سے قبل وہ اس غلے کے ڈھیر میں سے کچھ لے لے۔ جو شخص ایسا کرے گا، وہ غلول کا مرتکب ہوگا۔

مالِ غنیمت کے خمس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ضرورت مند رشتہ داروں کا، یتیموں کا، مسکینوں کا، ضرورت مند مسافروں کا بھی حق رکھا ہے، لیکن آپ کے تقسیم فرمانے سے پہلے کسی یتیم یا مسکین یا مسافر یا آپ کے کسی رشتہ دار کو اس میں سے کچھ لینا جائز نہ تھا۔

اب یہ سمجھیے کہ وہ لونڈی، جس کا اس حدیث میں ذکر ہے، مالِ غنیمت کے ان چار حصوں میں شامل ہو سکتی تھی، جو مجاہدین میں تقسیم ہونے تھے یا مالِ خمس میں سے تھی؟ پہلی صورت مانی جائے تو علی کو اس کے لینے کا حق ہی نہ تھا اور دوسری صورت مانی جائے تو علی کا اسے اپنے تصرف میں لانا اسی وقت جائز ہوتا جب رسول اللہ ﷺ وہ لونڈی انہیں عطا فرما دیتے۔ اس حدیث کو گھڑنے والے نے یہ نہ سوچا کہ وہ کیسے سخت کبیرہ گناہ کی حضرت علی کی طرف نسبت کر رہا ہے۔" ❶

تبصرہ: ① یہ بات اتنی لمبی چوڑی نہیں، جتنی لمبی میرٹھی صاحب نے رنگ آمیزی کرتے ہوئے کر دی ہے، کیونکہ مالِ غنیمت میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا حصہ ہونے کا اس حدیث

---

❶ صحیح بخاری کا مطالعہ: ۲/ ۹۱

میں کوئی ذکر نہیں، بلکہ اس حدیث میں تو صرف یہ ذکر ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے صرف مالِ خمس کی طرف بھیجا تھا، مالِ غنیمت کی طرف نہیں، نیز مالِ خمس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا حصہ ایک لونڈی سے بھی زیادہ تھا، جیسا کہ اس حدیث کے الفاظ ہیں:

بعث النبيّ صلّى الله عليه وسلّم عليًا إلى خالد ليقبض الخمس...

"نبی اکرم ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو سیدنا خالد (بن ولید رضی اللہ عنہ) کی طرف بھیجا تاکہ آپ مالِ خمس کو اپنے قبضہ میں لے لیں ـــــ"

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

فإنّ له في الخمس أكثر من ذلك...

"یقیناً ان (سیدنا علی رضی اللہ عنہ) کے لیے مالِ خمس میں اس (لونڈی) سے بھی زیادہ حصہ ہے ـــــ" (1)

لہٰذا میرٹھی صاحب کا بار بار مالِ غنیمت سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حصہ کی نفی کرنے پر اپنا زور صرف کرنا اور اس پر دیگر تفریعات کرتے ہوئے دو صورتیں بناتے پھرنا لایعنی تطویل کے سوا کچھ بھی نہیں۔

(2) رہی بات مالِ خمس کی تقسیم سے پہلے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ایک لونڈی اپنے لیے منتخب کرنے کی تو یہ کوئی اعتراض والی بات نہیں ہے، کیونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے مالِ خمس تقسیم کرنے کے لیے ہی تو بھیجا تھا، جیسا کہ مسند احمد میں اسی حدیث کے الفاظ ہیں:

بعث رسول الله صلّى الله عليه وسلّم عليًا إلى خالد بن الوليد ليقسم الخمس.

---

(1) صحیح بخاری: 4350

"رسول اللہ ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طرف بھیجا تاکہ آپ مالِ خمس کو تقسیم کریں۔" (1)

جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس تقسیم کا اختیار تھا اور انھوں نے اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے اپنا حصہ ایک لونڈی کی صورت میں مقرر کر لیا تھا تو اعتراض کس بات کا؟

رہی یہ بات کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے دوسرے لوگوں میں مالِ خمس تقسیم کرنے سے پہلے اپنا حصہ کیوں نکال لیا تھا تو اس کا جواب واضح ہے کہ مالِ خمس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا حصہ سب سے پہلے تھا، کیونکہ مالِ خمس کی تقسیم کی جو ترتیب قرآن کریم میں بیان ہوئی ہے، وہ یوں ہے:

﴿ وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ﴾ (2)

"(اے لوگو!) جان لو کہ جو کچھ تم غنیمت میں حاصل کرتے ہو، اس کا پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول، (آپ ﷺ کے) رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔"

جو شخص سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بھیجنے والے فیصلے میں رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ درست تسلیم کرتا ہے، اسے اس حدیث پر اعتراض کا ایک فیصد بھی حق نہیں۔

آپ ﷺ نے وحی الٰہی سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مالِ خمس کی تقسیم میں اپنا نائب بنا دیا تھا، گویا کہ یہ تقسیم بحکمِ الٰہی آپ ﷺ خود ہی فرما رہے تھے، پھر چونکہ اللہ و رسول کے بعد حصہ رسول اللہ ﷺ کے قریبی رشتہ داروں کا تھا اور کون نہیں جانتا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے بہت ہی قریبی رشتہ دار تھے؟ ایک تو آپ رضی اللہ عنہ رسول کریم ﷺ کے چچازاد تھے اور دوسرے آپ ﷺ کی لختِ جگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے خاوند بھی تھے، لہٰذا سیدنا علی رضی اللہ عنہ لونڈی کی صورت میں حصہ لینے کے مکمل مجاز تھے۔

---

(1) مسند الامام احمد: 359/5، وسندہ صحیح (2) الانفال: 41/8

عبدالجلیل بن عطیہ کی روایت میں اس بات کی صراحت ہے کہ جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر اس بات کا اعتراض کیا گیا کہ انہوں نے وہ لونڈی اپنے حصہ میں کیوں لی ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے معترضین سے فرمایا تھا:

أَلَمْ تَرَوْا إِلَى الْوَصِيفَةِ الَّتِي كَانَتْ فِي السَّبْيِ، فَإِنِّي قَسَمْتُ وَخَمَّسْتُ، فَصَارَتْ فِي الْخُمُسِ، ثُمَّ صَارَتْ فِي أَهْلِ بَيْتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ صَارَتْ فِي آلِ عَلِيٍّ وَوَقَعْتُ بِهَا ..

"کیا تم نے اس لونڈی کے بارے میں غور نہیں کیا، جو کہ دیگر قیدی عورتوں میں تھی کہ میں نے مالِ غنیمت کو تقسیم کر کے خمس (پانچواں حصہ) نکالا۔ یہ لونڈی خمس میں آ گئی، پھر رسول اللہ ﷺ کی آل کے حصہ میں آئی، پھر علی (رضی اللہ عنہ) کی آل کے حصہ میں آئی اور میں نے اس سے جماع کر لیا ہے۔"❶

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وقد استشكل ... قسمته لنفسه ... وأما القسمة فجائزة في مثل ذلك ممن هو شريك فيما يقسمه كالإمام إذا قسم بين الرعية وهو منهم، فكذلك من نصبه الإمام قام مقامه ...

"(اس حدیث میں) سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اپنے لیے (لونڈی) تقسیم کرنے پر اشکال پیش کیا گیا ہے ۔۔۔ اس جیسی صورتِ حال میں اس شخص کی اپنے لیے تقسیم جائز ہے، جو تقسیم شدہ مال میں خود بھی شریک ہو جیسا کہ کوئی امام اپنی رعیت میں کوئی مال تقسیم کرے اور وہ خود بھی ان کے ساتھ حصہ دار ہو، اسی طرح اس شخص کا حال ہے، جسے امام اپنا قائم مقام بنا

❶ مسند الامام احمد: ۵/ ۳۵۰، وسندہ حسن

دے۔۔۔۔" ❶

معلوم ہوا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا اپنے لیے ایک لونڈی منتخب کرنا بالکل قانونی عمل تھا۔ اس میں اعتراض والی کوئی بات نہیں ہے۔

اب قارئین خود فیصلہ فرمائیں کہ یہ اعتراض بے عقلی کی علامت ہے یا عقل مندی کی؟

استبرائے رحم سے پہلے لونڈی سے جماع کیوں کیا گیا؟

"دوسری شرعی حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی کو یمن بھیجنے کا واقعہ حجۃ الوداع سے قبل ۱۰ ہجری میں ہوا ہے اور اس سے بہت پہلے آپ نے تمام مسلمانوں کو ہدایت فرمادی تھی کہ جس شخص کے حصے میں گرفتار شدہ قیدیوں میں سے کوئی عورت آئے تو جب تک اسے اس کے یہاں ایک حیض نہ آجائے اس سے صحبت نہ کرے۔ اس کا اصطلاحی نام استبراء ہے۔ حیض آنے سے ثابت ہو جائے گا کہ وہ پہلے سے حاملہ نہیں ہے۔ حاملہ ہوئی تو حیض نہ آئے گا اور اس مدت میں اس کا حمل بھی نمایاں ہو جائے گا۔ حاملہ ثابت ہو تو وضع حمل، پھر نفاس ختم ہونے کے بعد ہی اس سے صحبت کی جا سکے گی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی یقیناً ان احکام شرعی سے واقف تھے۔ پھر یہ کیسے مان لیا جائے کہ حضرت علی نے استبراء کے بغیر اس لونڈی سے صحبت کی ہوگی۔" ❷

① حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وقد استشكل وقوع علي على الجارية بغير استبراء... فمحمول على أنها كانت بكرا غير بالغ، ورأى أن مثلها لا يستبرأ، كما صار إليه غيره

---

❶ فتح الباری لابن حجر: ۸/۶۷۔

❷ صحیح بخاری کا مطالعہ: [illegible]

من الصحابة، ويجوز ان تكون حاضت عقب صيرورتها له، ثم طهرت بعد يوم وليلة، ثم وقع عليها، وليس ما يدفعه...

"سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بغیر استبراء کے لونڈی سے جماع کرنے پر اشکال وارد کیا گیا ہے۔۔۔ اسے اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ وہ لونڈی کنواری تھی اور نابالغ تھی، چنانچہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا خیال یہ تھا کہ ایسی لونڈی کا استبراء نہیں کیا جائے گا (کیونکہ نابالغ ہونے کی صورت میں رحم میں حمل ہونے کا کوئی خدشہ نہیں ہوتا کہ استبرائے رحم ضروری ہو) جیسا کہ یہ مذہب ان کے علاوہ دوسرے اور صحابہ کا بھی ہے۔۔۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ لونڈی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آنے کے بعد حیض میں مبتلا ہوئی ہو اور ایک دن اور ایک رات کے بعد حیض سے پاک ہوئی ہو، پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس سے جماع کر لیا ہو۔ اس احتمال سے کوئی چیز مانع بھی نہیں ہے۔۔۔" [1]

علامہ عینی رحمہ اللہ نے بھی اس اشکال کا یہی جواب ذکر کیا ہے۔ [2]

اب برقی صاحب کے معتقدین کو چاہیے کہ اس اعتراض کو برقرار رکھنے کے لیے اس لونڈی کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آنے سے پہلے شادی شدہ اور بالغ ہونا ثابت کریں، پھر اگر یہ ثابت ہو جائے تو پھر اس بات کی نفی بھی پیش کریں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آ جانے کے بعد اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اس سے جماع کرنے سے پہلے اسے حیض نہ آیا تھا۔

یہ لوگ ان سب باتوں کو تو کجا، ان میں سے کسی بات کو بھی ثابت نہیں کر سکتے، لہٰذا برقی صاحب کا یہ اعتراض انتہائی بے جا ہے۔ اگر وہ صحیح بخاری کی شرح فتح الباری ہی پڑھ لیتے تو یہ

---

[1] فتح الباری لابن حجر: ۸/۶۷

[2] فتح الباری لابن حجر: ۸/۶۷

اعتراض کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرے۔

جب اس لونڈی کے نابالغ اور غیر شادی شدہ ہونے کا احتمال موجود ہے تو پھر یہ اعتراض بالکل ہی ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ ہمارے علم کے مطابق کسی صحیح حدیث میں کنواری اور نابالغہ لونڈی کے لیے استبرائے رحم کا ضروری ہونا ثابت نہیں ہے، بلکہ یہ حکم شادی شدہ اور حاملہ لونڈی کے لیے ہے۔ اس بارے میں وارد مرفوع احادیث درج ذیل ہیں:

۱۔ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

((لا توطأ حامل حتى تضع ، ولا غير ذات حمل حتى تحيض حيضة واحدة))

"حاملہ لونڈی سے اس وقت تک جماع نہ کیا جائے، جب تک وہ بچہ نہ جن لے اور نہ ایک حیض گزارنے سے پہلے غیر حاملہ لونڈی سے جماع کیا جائے۔" ❶

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں کنواری یا نابالغہ کا استبرا ضروری ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس کی سند "ضعیف" ہے۔ حافظ ابن القطان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

شريك بن عبد الله ، فإنه يرويه عن قيس بن وهب عن أبي الوداك ، وشريك مختلف فيه ، وهو مدلس ...

"شریک بن عبد اللہ سے قیس بن وہب سے بیان کرتے ہیں اور وہ ابو الوداک سے، شریک مختلف فیہ (راجح قول کے مطابق حسن الحدیث) راوی ہیں اور وہ مدلس ہیں۔" ❷

میرٹھی صاحب اکثر صحیح بخاری کی صحیح احادیث پر یہ اعتراض کر دیتے ہیں کہ راوی اپنے شیخ

---

❶ مسند الامام احمد: ۸۷/۳، سنن ابی داؤد: ۲۱۵۷

❷ بیان الوهم والإيهام لابن القطان: ۱۲۲/۲

((تضع ، أو حابل (حائل ؟) حتی تستبرئ))

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اوطاس والے دن اس بات سے منع فرمایا تھا کہ حاملہ عورت سے حمل وضع کرنے تک اور غیر حاملہ سے استبراء تک جماع کیا جائے۔" ❶

اس کی سند "مرسل" ہونے کی وجہ سے "ضعیف" ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ نہیں پایا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں بھی کنواری اور نابالغہ کا استبراء ضروری ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

۳۔　اس بارے میں صرف یہ حدیث "صحیح" ہے کہ سیدنا رویفع بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((لا یحلّ لامرئ یؤمن باللّٰہ والیوم الآخر أن یسقي ماءہ زرع غیرہ ، یعني إتیان الحبالی ، ولا یحلّ لامرئ یؤمن باللّٰہ والیوم الآخر أن یقع علی امرأۃ من السبي حتی یستبرئھا ...))

"اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والے کسی مرد کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنا پانی کسی غیر کی کھیتی کو پلائے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم مراد کسی کی حاملہ عورت سے جماع کرنا تھا)۔ اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے والے کسی آدمی کے لیے یہ بھی حلال نہیں کہ قیدی عورتوں میں سے کسی سے جماع کرے، یہاں تک کہ وہ استبراء کر لے ..." ❷

یہ حدیث "صحیح" ہے، لیکن اس میں بھی یہ صراحت نہیں کہ کنواری اور نابالغ عورتیں بھی اسی حکم

---

❶ مصنف ابن ابی شیبۃ ۴/۳۶۹

❷ سنن ابی داؤد: ۲۱۵۸، وسندہ صحیح

میں شامل ہیں۔ نیز ہمارے رجحان کے مطابق کنواری اور خصوصاً نابالغ عورت کا استبرائے رحم کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ ایسی صورت میں حمل کا کوئی شائبہ نہیں ہوسکتا، جبکہ حدیث رسول میں استبرائے رحم کی جو علت بیان کی گئی ہے، وہ یہی ہے کہ یہ شخص کہیں پہلے سے موجود حمل میں حصہ دار نہ ہو جائے اور یوں بچے کا نسب خراب نہ ہو جائے۔

نیز سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کا فتویٰ بھی ہے کہ:

إذا اشتراها عذراء، فإن شاء لم يستبرئها.

''جب کوئی آدمی کنواری لونڈی خریدتا ہے، وہ چاہے تو اس کا استبراء نہ کرے۔'' ❶

تو جب کنواری اور نابالغہ کے بارے میں استبرائے رحم کا حکم رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہی نہیں اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما اس کو ضروری نہیں سمجھتے تو پھر صحیح بخاری پر اعتراض کیا ہے؟

③ اگر یہ حکم شرعی موجود بھی ہو تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ تک اس حکم کا پہنچنا ثابت نہیں۔ میرٹھی صاحب کا کوئی معتقد میرٹھی صاحب کے اس قول کو ثابت کرے کہ:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی یقیناً اس حکم شرعی سے واقف تھے۔'' ❷

حالانکہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ اس کی سند سخت ''ضعیف'' ہے۔ پھر میرٹھی صاحب کو کیسے ''الہام'' ہوا تھا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اس حکم شرعی سے واقف تھے؟

جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو یہ قول معلوم ہونا معلوم نہیں ہے تو پھر یہ اعتراض میرٹھی صاحب کی اپنی جہالت ہے۔

---

❶ مصنف ابن ابی شیبۃ، ... باب الاستبراء و الترغیب فی الإماء ... ۲۲/۷، و سندہ صحیح

❷ صحیح بخاری کا مطالعہ: ۱/۱۹۱

لونڈی سیدہ فاطمہ کے علم میں کیوں نہ آئی؟

"تیسری بات یہ ہے کہ تمام اہل علم اس پر متفق ہیں کہ یمن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ حج کے موقع پر مکہ پہنچے ہیں۔ یمن سے ہی حضرت علی نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق قربانی کے اونٹ خریدے تھے اور بوقت احرام نیت کر لی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے جس قسم کا احرام باندھا ہے، وہی خدایا میرا بھی ہے۔ افراد ہو یا تمتع ہو یا قران ہو، چنانچہ جب علی مکہ پہنچے اور آپ نے پوچھا کہ تم نے کس قسم کا احرام باندھا ہے اور علی نے جواب دیا کہ میں کوئی قسم متعین نہیں کی تھی۔ بس آپ کے احرام جیسا احرام میں نے باندھا ہے۔ فرمایا: چونکہ تم اپنے ساتھ قربانی کے جانور لائے ہو اور میں بھی لایا ہوں۔ بس یہ ہے تم بھی میری طرح اپنے احرام پر برقرار رہو، یہاں تک کہ دسویں ذی الحجہ کو قربانی سے فارغ ہو جاؤ۔ احادیث میں تصریح ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی حج میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک لونڈی اپنے لیے منتخب فرمائی تھی اور اس سے صحبت و جماع کا تعلق بھی قائم کر لیا تھا تو وہ کہاں گئی۔ اگر ہوتی تو علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی وہ بھی ہوتی اور حضرت سیدہ فاطمہ، رسول اللہ ﷺ اور سب لوگوں کے علم میں آ جاتی کہ علی اپنی معشوقہ اور سیدہ فاطمہ کا دل دکھانے کے لیے ایک حسین چھوکری بھی لائے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ تو جب ہوتا کہ واقعی حضرت علی نے لطف صحبت اٹھانے کے لیے کوئی چھوکری منتخب کی ہوتی۔ یہ کوئی واقعی بات ہوتی تو حضرت فاطمہ وغیرہا کے علم میں آ جاتی مگر یہ تو ایک فرضی قصہ ہے، جو کسی بدبخت راوی غالباً علی بن سوید بن منجوف کا گھڑا ہوا ہے۔"[1]

---

[1] صحیح بخاری کا مطالعہ: ۱/ ۹۱/ ۹۲

جواب: ① ہم بیان کر چکے ہیں اٹکل پچو سے کام لیتے ہوئے برقی صاحب کا "عن ابی علی بن سوید بن منجوف" پر الزام دھر کر اس حدیث کو "فرضی" قصہ قرار دینا ان کا ایسا مفروضہ ہے، جو حدیث اور اصول حدیث سے ان کی ناواقفیت پر روشن دلیل ہے، کیونکہ نہ علی بن سوید بن منجوف میں کوئی ایسی جرح موجود ہے، جس سے اس پر یہ الزام دھرا جا سکے اور نہ ہی ان دیگر راویوں میں کوئی ایسی خرابی ہے، جو اس سے متعلق حدیث بیان کرکے اس کی متابعت کر رہے ہیں۔ اگر کسی میں دم خم ہے تو وہ آزمائے اور ہماری سابقہ تحقیق کو چیلنج کرے!

② سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا کسی لونڈی کو منتخب کرنا اور اس سے جماع کرنا اسی طرح جائز کام تھا، جس طرح کوئی آدمی کسی عورت سے نکاح کر لیتا ہے۔ یہ کوئی جرم تو نہیں تھا کہ اس پر کوئی آوازہ کسا جاتا، لہٰذا برقی صاحب کے یہ الفاظ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی صریح گستاخی ہیں کہ:

"حضرت سیدہ فاطمہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب لوگوں کے علم میں آجاتا کہ علی اپنی دلہن سیدہ فاطمہ کا دل دکھانے کے لیے ایک حسین چھوکری بھی لائے ہیں۔"

کیا کوئی "برقی" اپنے والد کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہے:

"میرا والد اپنی بیوی کے لیے ایک حسین چھوکری لایا تھا، جس کے بطن سے میں پیدا ہو گیا تھا؟" إنا للہ وإنا إلیہ راجعون!

ـــــ ذرا اپنی ادا ؤں پہ بھی غور کرو
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

③ برقی صاحب کو نہ معلوم کس نے کہہ دیا تھا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ وہ لونڈی اپنے ساتھ لائے تھے اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اس کا علم نہیں ہوا تھا؟ صحیح بخاری کی اس "صحیح" حدیث میں تو ایسی کوئی بات مذکور نہیں ہے!

کیا لونڈی رکھنا سیدہ فاطمہ کی دل آزاری کا باعث تھا؟

"چوتھی بات یہ ہے کہ صحیحین وغیرہ کی مشہور حدیث ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے پاس کچھ لونڈیاں آئیں۔ حضرت علی ؓ نے سیدہ فاطمہ ؓ کو مشورہ دیا کہ تمہیں گھر کا کام کرنے میں بڑی مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے کہہ کر ایک لونڈی حاصل کر لو۔

حضور ﷺ کو جب ان کی یہ خواہش معلوم ہوئی تو آپ نے دونوں سے مخاطب کر کے فرمایا کہ میں تمہیں خدمت گزار لونڈی سے بہتر چیز نہ بتا دوں! رات کو سوتے وقت ۳۳ بار سبحان اللہ، ۳۳ بار الحمد للہ، اور ۳۴ بار اللہ اکبر کہہ لیا کرو۔

حضرت علی کو لونڈی دینے میں یہ مصلحت بھی تھی کہ علی کی مالی حالت بہتر نہ تھی، مزید ایک عورت کے نان و نفقہ کا بوجھ ان پر بھاری بن جاتا۔ پھر ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد جب مکہ کے دیگر خاندانوں کی طرح قبیلہ بنی مخزوم کے بیشتر افراد بھی مدینہ منتقل ہو گئے، جن میں ابوجہل کی بیٹی اور بیٹا بھی تھے۔ بیٹی نا کتخدا تھی۔ حضرت علی نے اسے پیام نکاح دیا۔ لڑکی والوں نے بھی اس امر میں رسول اللہ ﷺ سے مشورہ لیا اور علی کے پیام سے آگاہ کیا۔ ادھر حضرت سیدہ فاطمہ ؓ نے بھی آپ سے شکایت کی۔ آپ نے برملا نہایت برہمی کے ساتھ اس عقد کی اجازت دینے سے انکار فرما دیا اور فرمایا کہ ابو طالب کا بیٹا ابوجہل کی بیٹی سے نکاح اسی صورت میں کر سکتا ہے کہ میری بیٹی کو طلاق دیدے۔ اس سرزنش کے بعد حضرت علی ؓ نے حضرت فاطمہ ؓ کی زندگی میں نہ کوئی نکاح کیا، نہ کوئی کنیز رکھی۔ حضرت فاطمہ ؓ کی وفات کے بعد آپ نے متعدد عورتوں سے نکاح کیا، متعدد کنیزیں بھی آپ کے محل میں رہیں، جو آپ کی اولاد کی مائیں تھیں۔ لہٰذا یہ قصہ کلیتاً غلط ہے کہ حضرت فاطمہ کی زندگی میں ہی حضرت علی نے مال غنیمت میں سے ایک کنیز اپنے لیے منتخب کر لی

تھی۔" ❶

ازالہ:

① صحیح بخاری و صحیح مسلم کی جس مشہور حدیث کی طرف میرٹھی صاحب نے اشارہ کیا ہے، اس میں خادم کا ذکر ہے، نہ کہ خادمہ کا۔

اگرچہ کلام عرب میں خادم کا اطلاق غلام و لونڈی دونوں پر ہو جاتا ہے ❷ لیکن ہم میرٹھی صاحب کے معتقدین سے یہ سوال کرتے ہیں کہ آخر میرٹھی صاحب کے پاس کون سی دلیل ہے، جس کی بنا پر انہوں نے خادم کا معنی "لونڈی" کیا ہے اور پھر اسے صحیح بخاری پر اعتراض بنانے کی ناکام کوشش کی ہے؟

② پھر اگر اس حدیث میں بغیر دلیل کے خادم کا معنی "لونڈی" کر بھی لیں تو قارئین میرٹھی صاحب کی زبانی رسول اللہ ﷺ کے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو "لونڈی" نہ دینے کی "ایک مصلحت" پڑھ چکے ہیں کہ مالی حالات خراب ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ نے ان کو "لونڈی" نہ دی تھی، جبکہ باقی مصلحتیں میرٹھی صاحب نے ذکر نہیں کیں۔ وہ اگر انہیں بھی ذکر کر دیتے تو یقیناً اچھا ہوتا۔

چلیے اسی مصلحت کو لیتے ہیں! "لونڈی" نہ دینے کی وجہ چونکہ مالی حالات کی ابتری تھی، لہٰذا جب مالی حالات بہتر ہو گئے تو نہ جانے میرٹھی صاحب کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اپنے لیے "لونڈی" منتخب کر لینے پر اعتراض کیوں ہے؟

③ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ويؤخذ من الحديث جواز التسرّي على بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم، بخلاف التزويج عليها لما وقع في حديث المسور في كتاب

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ا/۱۹۴۔۱۹۵

❷ المعجم الوسيط: ۱/۲۲۱، تاج العروس: فصل الخاء، المصباح المنير ۱/۱۶۵

النکاح.

"اس حدیث سے بنت رسول کی موجودگی میں لونڈی رکھنے کا جواز معلوم ہوتا ہے، بر خلاف نکاح کے کہ کتاب النکاح میں سیدنا مسور ؓ کی حدیث میں (اس کی ممانعت کا حکم) وارد ہوا ہے۔" ❶

حافظ ابن حجر ؒ کی یہ بات سو فیصد صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بیٹی فاطمہ ؓ کی موجودگی میں کسی عورت سے شادی کرنا سیدنا علی ؓ کے لیے جائز نہ تھا، لیکن لونڈی رکھنا بالکل جائز تھا، کیونکہ جب سیدنا علی ؓ نے کسی عورت سے شادی کی بات کی تھی تو خود میرٹھی صاحب نے رسول اللہ ﷺ کا بہت برہم ہونا ذکر کیا ہے، بلکہ صحیح بخاری میں رسول اللہ ﷺ کے الفاظ ہیں

((واللّٰه ! لا تجتمع بنت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم وبنت عدوّ اللّٰه عند رجل واحد))

"اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ کی بیٹی اور اللہ کے دشمن (ابوجہل) کی بیٹی ایک آدمی کے نکاح میں جمع نہیں ہو سکتیں۔" ❷

لیکن کیا لونڈی طلب کرنے پر رسول اللہ ﷺ نے اس طرح کی برہمی کا اظہار کیا ہے؟ قطعاً نہیں، بلکہ سیدنا علی و سیدہ فاطمہ ؓ کے لونڈی طلب کرنے پر آپ ﷺ کے الفاظ یہ تھے:

((ألا أدلّكما على خير ممّا سألتماه... فإنّ ذلك خير ممّا سألتماه))

"کیا میں تم دونوں کو تمہاری طلب کردہ چیز (لونڈی) سے بہتر چیز نہ بتا دوں... یقیناً یہ

---

❶ فتح الباری ج ۹ ص ۳۲۸
❷ صحیح بخاری: ۳۷۲۹

تمہارے لیے اس چیز سے بہتر ہے جس کا تم نے مطالبہ کیا ہے۔" ❶

پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ لونڈی رکھنا اگر اسی قسم میں ہوتا تو جب شادی کی بات ہوئی تھی، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا خود نہایت غم زدہ حالت میں شکایت لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی تھیں کہ علی رضی اللہ عنہ میرے ہوتے ہوئے ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں، انہیں روکیے!

لیکن لونڈی حاصل کرنے کے لیے وہ خود چل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئی تھیں، سیدنا علی رضی اللہ عنہ اس وقت ان کے ساتھ نہیں گئے تھے۔

برقی صاحب کی پیش کردہ یہ حدیث تو الٹا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی موجودگی میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے لیے لونڈی رکھنا جائز تھا اور اس سے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی دل آزاری نہیں ہوتی تھی۔

کاش کہ برقی صاحب امت مسلمہ کے اتفاق کو لات مارتے ہوئے صحیح بخاری پر اعتراض کرنے سے پہلے تھوڑا غور و فکر سے کام لے لیتے!

④ برقی صاحب نے بے اس قول پر کوئی دلیل پیش نہیں کی کہ:

"اس سرزنش کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں ۔۔۔ نہ کوئی کنیز رکھی ۔۔۔"

جبکہ صحیح بخاری کی اس حدیث میں کنیز رکھنے کا اثبات ہے جس پر برقی صاحب بلا دلیل بے تکے اعتراضات کر رہے ہیں۔

الحاصل یہ اعتراض محض غلط ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا اس کنیز کو منتخب کرنا سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی دل آزاری کا سبب تھا۔

---

❶ صحیح بخاری: ۳۱۱۳

مالِ خمس میں کسی کا کوئی نامزد حصہ نہ تھا!

"پانچویں بات یہ ہے کہ اس میں مذکور ہے کہ بریدہ کی شکایت کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا: ((فان له في الخمس اكثر من ذلك)) یعنی علی کا خمس میں اس سے بھی زیادہ حق ہے۔

واللہ العظیم! یہ حضور ﷺ پر افتراء ہے۔ نہ آپ نے یہ فرمایا ہے، نہ آپ فرما سکتے تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ﴾ (سورة الانفال)

(اور جان لو کہ جو کچھ مال غنیمت تمہیں حاصل ہو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول کے لیے ہے اور رسول کے رشتہ دار اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لیے)

اس ارشاد میں غور طلب بات ہے کہ یتیموں اور مسکینوں کا صیغہ جمع کے ساتھ ذکر ہے، لیکن رشتہ دار اور مسافر کا صیغہ مفرد کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ ذوی القربی نہیں ہے ذی القربی ہے۔ ابناء السبیل نہیں ہے ابن السبیل ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ خمس میں اللہ تعالیٰ نے کسی ایک یتیم اور کسی ایک مسکین کا نہیں، بلکہ یتیموں اور مسکینوں کا حق رکھا ہے، مگر اس میں مسافروں کا نہیں، بلکہ خاص مسافر کا حق ہے، یعنی اس مسافر کا، جو ضرورت مند ہو۔ اسی طرح اس میں رسول اللہ ﷺ کے سب رشتہ داروں کا حق نہ تھا، بلکہ اسی رشتہ دار کا حق تھا، جو ضرورت مند ہو، خواہ وہ علی رضی اللہ عنہ ہوں یا عقیل ہوں یا اور کوئی صاحب ہوں، خاص حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خمس میں کوئی نامزد حصہ نہ تھا۔ جب حقیقت یہ ہے تو آپ ((فان له في الخمس اكثر من ذلك)) کیسے فرما سکتے تھے؟"

ان روشن و واضح وجوہ کی بنا پر میں اس حدیث کو غلط اور اس قصہ کو باطل سمجھتا ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ علی بن سوید بن منجوف کوئی رافضی اور متعصب شیعہ تھا۔ یہ حدیث اسی انداز سے اس کی ساختہ پرداختہ ہے۔ اس کے علاوہ واضح کندی، عبدالجلیل بن عطیہ اور سعد بن عبیدہ نے بھی عبداللہ بن بریدہ سے اسی مضمون کی روایت کی ہے۔ یہ سب لوگ بھی روافض تھے۔"①

اعتراض ①　برقی صاحب کے اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ سورۃ انفال میں جہاں مالِ خمس کی تقسیم کا ذکر ہے، وہاں رشتہ دار کو جمع نہیں لایا گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر رشتہ دار مالِ خمس کا حق دار نہیں، بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ضرورت مند رشتہ دار اس کا مستحق تھا، لہٰذا مالِ خمس میں کسی کا کوئی مقررہ حصہ نہیں تھا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ ان کا حصہ ایک لونڈی سے زیادہ ہے۔

لیکن برقی صاحب کی یہ بات بالکل بے بنیاد ہے کہ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ضرورت مند رشتہ دار مالِ خمس کے حق دار تھے، کیونکہ صحیح بخاری ہی میں حدیث موجود ہے۔ سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

مشيت أنا وعثمان بن عفان إلى النبيّ صلّى الله عليه وسلّم، فقلنا: أعطيت بني المطلب من خمس خيبر، وتركتنا، ونحن وهم بمنزلة واحدة منك، فقال: ((إنّما بنو هاشم وبنو المطلب شيء واحد))، قال جبير: ولم يقسم النبيّ صلّى الله عليه وسلّم لبني عبد شمس وبني نوفل شيئا.

"میں اور سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی کہ آپ نے بنو المطلب (اور بنو ہاشم) کو خیبر کے مالِ خمس میں سے حصہ دیا ہے اور ہمیں چھوڑ دیا ہے، جبکہ ہم اور وہ (بنو المطلب آپ سے رشتہ داری میں) ایک ہی مرتبہ میں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

① "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۲۷۳-۲۷۴

کتنا ہوتا تھا؟ فرمایا: مال خمس میں سے پانچواں حصہ۔" ❶

یعنی مال خمس میں سے پانچواں حصہ رسول اللہ ﷺ کا تھا۔ جسے قرآن کریم میں اللہ اور اس کے رسول کا حصہ کہا گیا ہے۔ جب یہ مقرر ہو گیا ہے تو باقی چار حصے بالترتیب قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے ہو جائیں گے۔

اسی طرح امام ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

أربعة أخماس لمن حضر البأس، والخمس الباقي لله وللرسول، خمسه يضعه حيث رأى، وخمس لذوي القربى، وخمس لليتامى، وخمس للمساكين، ولابن السبيل خمس

"مال غنیمت کے پانچ حصوں میں سے چار لڑائی میں حاضر ہونے والے مجاہدین کے لیے تھا اور باقی بچنے والے مال (خمس کا) پانچواں حصہ اللہ و رسول کے لیے، وہ جہاں مناسب سمجھیں، وہاں صرف کریں اور پانچواں حصہ قریبی رشتہ داروں کے لیے اور پانچواں حصہ یتیموں کے لیے اور پانچواں حصہ مسکینوں کے لیے اور پانچواں حصہ مسافروں کے لیے۔" ❷

یعنی اگر مال خمس مثال کے طور پر پچاس لاکھ ہو تو دس دس لاکھ کے پانچ حصے ہو جائیں گے، دس لاکھ اللہ و رسول کے لیے، دس لاکھ قریبی رشتہ داروں کے لیے، دس لاکھ یتیموں کے لیے، دس لاکھ مسکینوں کے لیے اور دس لاکھ مسافروں کے لیے۔

پھر قریبی رشتہ داروں کے حصہ میں جو دس لاکھ آیا ہے، سب میں برابر تقسیم ہو جائے گا۔

کیا اب بھی میرزا محمد علی صاحب کے معتقدین کے نزدیک سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا حصہ نامعلوم نہیں ہوا؟

---

❶ تفسیر الطبري: ۱۲/۵۵۲، الرقم: ۱۶۱۰۷، وسندہ صحیح

❷ تفسیر الطبري: ۱۳/۵۵۰، الرقم: ۱۶۱۱۶، وسندہ صحیح

③ رہا میرٹھی صاحب کا یہ کہنا کہ قریبی رشتہ دار کا لفظ قرآن کریم میں واحد استعمال ہوا ہے، لہٰذا اس سے ہر قریبی رشتہ دار مراد نہیں ہو سکتا تو اولاً امام ابن جریج رحمہ اللہ کا مذکورہ فرمان پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ ان کے نزدیک اس آیت میں تمام قریبی رشتہ دار مراد ہیں، اسی لیے انھوں نے یہاں جمع کا لفظ بولا ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ قرآن و حدیث اور عربی لغت کو میرٹھی صاحب سے بہت بڑھ کر جانتے تھے۔

لفظِ ذُو ہمیشہ اسمِ جنس کی طرف مضاف ہوتا ہے

ثانیاً یہ بات میرٹھی صاحب کے عربی لغت و ادب سے ناواقف ہونے کی واضح دلیل ہے، وہ اس طرح کہ اس آیت کریمہ کے الفاظ ذي القربى (رشتہ داری والا) میں لفظ ذو "صاحب" کے معنی میں ہے اور جب ایسا ہو تو یہ ہمیشہ اسم جنس کی طرف مضاف ہوتا ہے، جیسا کہ علم نحو کی معروف و مشہور کتاب شرح ابن عقیل میں لکھا ہے:

واعلم أنّ ذو لا تستعمل إلّا مضافة، ولا تضاف إلى مضمر، بل إلى اسم جنس ظاهر، غير صفة، نحو جاءني ذو مال...

"جان لیں کہ لفظ ذو صرف مضاف ہو کر استعمال ہوتا ہے اور مضاف بھی اسم ضمیر کی طرف نہیں، بلکہ اسم جنس ظاہر کی طرف ہوتا ہے، جو کہ صفت نہ ہو، جیسا کہ جاءني ذو مال (میرے پاس مال والا آیا)...." ①

جب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ لفظ ذو اسم جنس کی طرف مضاف ہوتا ہے تو میرٹھی صاحب کا یہ قول بالکل غلط ہے کہ یہاں رشتہ دار واحد ہے اور اس سے مراد صرف ضرورت مند ہیں، کیونکہ اسم جنس سے مراد اس جنس کے تمام افراد ہوتے ہیں۔

① شرح الألفية لابن عقيل: ۵۴/۱

کسی ایک ثقہ محدث نے ان میں سے کسی ایک کے بارے میں احادیث گھڑنے کا الزام ثابت نہیں کیا۔

اللہ کے لیے انصاف کریں! ان حقائق کو جان لینے کے بعد بھی میرٹھی صاحب کا دم بھرنے والا شخص بھلا انصاف پسند ہو سکتا ہے؟ یقیناً نہیں!

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حق پر قائم رکھے! گمراہی سے بچائے! صرف اسی کا کام ہے!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دسواں باب

سیدنا عمار بن یاسر کے باغی گروہ کے ہاتھوں شہید ہونے کی نبوی پیش گوئی

سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

((تقتلك الفئة الباغية))

"(اے عمار!) تجھے باغی گروہ شہید کرے گا۔" [1]

یہ ایک متواتر، مشہور اور بالکل صحیح حدیث ہے۔

اس حدیث کے بارے میں حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں:

تواترت الآثار عن النبيّ صلّى الله عليه وسلّم أنه قال: ((تقتل عمارا الفئة الباغية)) ، وهذا من إخباره بالغيب وأعلام نبوته صلّى الله عليه وسلّم، وهو من أصح الأحاديث ...

"نبی کریم ﷺ سے یہ روایات متواتر ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: عمار رضی اللہ عنہ کو باغی گروہ شہید کرے گا، یہ حدیث ان باتوں میں سے ہے، جو آپ ﷺ نے غیب (وحیِ الٰہی) کے ذریعے دی ہیں اور یہ آپ ﷺ کی نبوت کی واضح علامات میں سے ہے، نیز یہ صحیح ترین احادیث میں سے ہے۔" [2]

---

[1] صحیح بخاری: ۴۴۷، صحیح مسلم: ۲۹۱۶

[2] الاستیعاب لابن عبدالبر ۳/ ۱۱۴

علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

وفي الباب عن عدة من الصحابة . فهو متواتر ..

"اس بارے میں ایک جماعت سے صحابہ کرام سے روایات موجود ہیں، چنانچہ یہ حدیث متواتر ہے۔" ❶

علامہ مزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وتواترت الروايات عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال لعمار: ((تقتلك الفئة الباغية))، روى ذلك عن عمار بن ياسر، وعثمان بن عفان، وعبد الله بن مسعود وحذيفة بن اليمان وعبد الله بن عباس في آخرين ...

"رسول اللہ ﷺ سے یہ روایات متواتر ہیں کہ آپ ﷺ نے سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تجھے ایک باغی گروہ شہید کرے گا۔ یہ حدیث سیدنا عمار بن یاسر، سیدنا عثمان بن عفان، سیدنا عبداللہ بن مسعود، سیدنا حذیفہ بن الیمان، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔" ❷

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

روى حديث ((تقتل عمارا الفئة الباغية)) جماعة من الصحابة، منهم قتادة بن النعمان كما تقدم، وأم سلمة عند مسلم، وأبو هريرة عند الترمذي، وعبد الله بن عمرو بن العاص عند النسائي، وعثمان بن عفان،

❶ سیر اعلام النبلاء للذہبی: ۱/۴۲۱

❷ تہذیب الکمال للمزی: ۲۱/۲۲۴

وحليفة، وأبو أيوب، وأبو رافع، وخزيمة بن ثابت، ومعاوية، وعمرو بن العاص وأبو اليسر وعمار نفسه، وكلها عند الطبراني وغيره، وغالب طرقها صحيحة أو حسنة، وفيه عن جماعة آخرين يطول عدهم..

''اس حدیث کو صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت نے بیان کیا ہے، جن میں سے قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ ہیں، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، صحیح مسلم میں سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا ہیں، جامع ترمذی میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں، سنن نسائی میں سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ہیں، اسی طرح سیدنا عثمان بن عفان، سیدنا ابو ایوب، سیدنا ابو رافع، سیدنا خزیمہ بن ثابت، سیدنا معاویہ، سیدنا عمرو بن العاص، سیدنا ابو الیسر رضی اللہ عنہم اور خود عمار رضی اللہ عنہ اس کے راوی ہیں۔ یہ سب طبرانی وغیرہ کے ہاں موجود ہیں اور ان کی اکثر سندیں صحیح یا حسن درجہ کی ہیں۔ اس بارے میں کئی دوسرے صحابہ کرام سے بھی روایات مروی ہیں، ان کی گنتی کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔'' ❶

حافظ ابن الملقن رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وقال ابن دحية في كتابه [التنوير]: هو حديث لا مطعن في صحته..

''ابن دحیہ نے اپنی کتاب التنویر میں فرمایا ہے کہ اس حدیث کی صحت میں کوئی بھی خرابی نہیں ہے۔'' ❷

لیکن شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب نے اس متواتر صحیح حدیث کا انکار کرتے ہوئے کہا ہے:

''یہ جھوٹی حدیث کا [illegible] بعد میں آنے والے بہت سے لوگوں نے [illegible] ایک صحیح و برحق حدیث کی طرح [illegible] اور امام بخاری رحمہ اللہ نے

❶ فتح الباري لابن حجر [illegible]

❷ [illegible] لابن الملقن [illegible]

اسے صحیح قرار دے کر صحیح بخاری میں مجدد سے بھری۔۔۔" ❶

حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس حدیث کے اقراری تھے، بلکہ وہ صحابہ کرام بھی اس کے انکاری نہ تھے، جن پر اس حدیث کی وجہ سے اعتراض آتا ہے، چنانچہ:

حافظ ابن الملقن رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قال ابن دحية في كتابه [مرج البحرين] : وكيف يكون في هذا الحديث اختلاف ، وقد رأينا معاوية نفسه حين لم يقدر على إنكاره ، قال : إنّما قتله من أخرجه ، ولو كان حديثا فيه شكّ لردّه معاوية وأنكره

"ابن دحیہ نے اپنی کتاب "مرج البحرین" میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں کیسے اختلاف ہو سکتا ہے؟ ہم نے خود معاویہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے کہ جب وہ اس حدیث کا انکار نہ کر سکے تو فرمایا: ان (عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ) کو قتل تو اس نے کیا ہے، جو ان کو ساتھ لے کر آئے ہیں۔ اگر یہ کوئی ایسی حدیث ہوتی، جس میں کوئی شک و شبہ ہوتا تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اس کو رد کر دیتے اور اس کا انکار کر دیتے۔۔۔" ❷

یہ بات بالکل درست ہے، چنانچہ محمد بن ابی بکر بن حزم رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

لمّا قتل عمّار بن ياسر دخل عمرو بن حزم على عمرو بن العاص ، فقال : قتل عمّار وقد قال رسول الله صلّى الله عليه وسلّم : ((تقتله الفئة الباغية)) ، فقام عمرو بن العاص فزعا يرجّع ، حتّى دخل على معاوية ، فقال له معاوية : ما شأنك ؟ قال : قتل عمّار ! فقال معاوية : قد قتل عمّار ،

---

❶ صحیح بخاری کا مطالعہ: ۱/۲۰۳

❷ التوضیح لابن الملقن: ۲۰/۸۶۸

فمه ذا؟ قال عمرو : سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول : ((تقتله الفئة الباغية)) . . .

"جب سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے تو عمرو بن حزم سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا، سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے ہیں، حالانکہ ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ انہیں باغی گروہ قتل کرے گا۔ سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ گھبراہٹ سے إنا لله وإنا إليه راجعون پڑھتے ہوئے آئے، یہاں تک سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا، کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے کہا، عمار رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے ہیں! سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا، عمار رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے ہیں تو کیا ہے؟ عمرو رضی اللہ عنہ کہنے لگے، میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ انہیں ایک باغی گروہ شہید کرے گا۔۔۔"❶

اسی طرح جب دو آدمی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا سر مبارک لے کر آئے اور ہر ایک یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے آپ کو شہید کیا ہے تو سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

ليطب به أحدكما نفسا لصاحبه، فإني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول : ((تقتله الفئة الباغية)) . . .

"تم میں سے ایک اپنے ساتھی کے لیے اس کو پسند کرے (اپنے بجائے اسی کے نام لگا دے)، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ان (سیدنا عمار رضی اللہ عنہ) کو باغی گروہ قتل کرے گا۔۔۔"❷

---

❶ مسند الإمام أحمد : ١٩٩/٤، مصنف عبد الرزاق : ٢٤٠/١١، وسنده صحيح

❷ مسند الإمام أحمد : ٢٠٦/٢، وسنده صحيح

اس پر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس حدیث پر کوئی اعتراض یا اس کا انکار نہیں کیا، ورنہ اس حدیث کی وجہ سے سب سے پہلی زد انہی پر آتی تھی لیکن انہوں نے تاویل کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس سے بری سمجھا انکار نہیں کیا۔

جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس حدیث کے اقراری ہیں تو پھر چودہ سو سال کے بعد پیر جی صاحب کی اس بات کا کوئی اعتبار نہیں کہ یہ اپنی طرف سے گھڑ لی گئی ہے۔

اب ہم قارئین کرام کو یہ بتانا چاہیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مخالفین کو باغی قرار دینے سے سیدنا معاویہ اور ان کے دوسرے ساتھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تکفیر و تنقیص لازم نہیں آتی، کیونکہ وہ سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مجتہد تھے اور اپنے اجتہاد کے مطابق سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کا مطالبہ کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے تھے لہٰذا یہ ان کی اجتہادی خطا تھی جس سے ان پر کسی قسم کی کوئی جرح لازم نہیں آتی، جیسا کہ محدثین کرام اور سلف امت نے اس کی صراحت کر دی ہے۔

حافظ نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

هذا الحديث حجة ظاهرة في أن عليا رضي الله عنه كان محقا مصيبا، والطائفة الأخرى بغاة، لكنهم مجتهدون، فلا إثم عليهم لذلك...

"یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ حق بجانب اور درستی پر تھے اور دوسرا گروہ باغی تھا لیکن وہ مجتہد تھے لہٰذا اس کا ان پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔" [1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اسی حدیث کے تحت سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنے خیال کے مطابق حق پر تھے:

[1] شرح مسلم للنووي: ١٨/٤٠

وهم مجتهدون، لا لوم عليهم في اتباع ظنونهم ... لكنهم معذورون للتأويل الذي ظهر لهم.

"یہ صحابہ کرام مجتہد تھے، انھوں نے اپنے اجتہاد کی پیروی کی تھی، ان پر اس بات میں کوئی ملامت نہیں ۔۔۔ بلکہ وہ اس تاویل کی وجہ سے معذور تھے جو ان کے ذہن میں آئی تھی۔" ❶

لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، علمائے امت اور پوری امتِ مسلمہ کی مخالفت کرتے ہوئے اس حدیث کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گستاخی قرار دے کر اس کا انکار کرنا کوئی عقل مندی نہیں ہے۔

آئیے اس حدیث پر کیے گئے میرٹھی صاحب کے اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں۔

عکرمہ کی بیان کردہ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث

❀ مسجد نبوی کی تعمیر کچی اینٹوں سے ہوئی تھی یا پکی اینٹوں سے؟

"لیکن یہ حدیث ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ نہیں ہو سکتی۔ ابوسعید خدری خوب جانتے تھے کہ مسجد نبوی کی تعمیر پتھروں سے ہوئی تھی نہ کہ کچی اینٹوں سے۔ عربی زبان میں لَبِنَة کچی اینٹ کو کہتے ہیں اور جب اسے آگ میں پکایا جائے تو اسے آجُر کہا جاتا ہے۔ مسجد نبوی کی تعمیر کے لیے صحابہ کرام پتھر لائے تھے۔ قریب کی پہاڑیوں سے پتھر لانے کی زحمت انھوں نے اٹھائی تھی۔ اس کے لیے کچی اینٹیں لانے کا ذکر بے معنی ہے۔ مسجد نبوی کی تعمیر اور آغاز کا حضرت انس رضی اللہ عنہ نے وضاحت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ جس میں ہے:

وجعلوا ينقلون الصخر، وهم يرتجزون، والنبي صلى الله عليه وسلم معهم، وهو يقول: «اللهم لا خير إلا خير الآخرة، فاغفر للأنصار

---

❶ فتح الباری لابن حجر: ۱/ ۵۴۲

والمهاجرة .» (صحیح بخاری ج ۱ ص [illegible] طبع ہند) ❶

تحقیق: ① اگر میرٹھی صاحب کو اس حدیث کے تسلیم کرنے سے بھی اعتراض مانع ہے کہ دوسری احادیث میں کچی اینٹوں کا ذکر ہے اور یہاں بھی اینٹوں کا اٹھانا ان کے معتقدین اسے صحیح بخاری کا قصور نہ سمجھیں۔ یقین جانیے کہ یہ میرٹھی صاحب کے مطالعہ کی کمی کا شاخسانہ ہے۔

اگرچہ لَبِنَة کا لغوی معنی کچی اینٹ ہی ہے لیکن بسا اوقات کبھی کبھی پتھر اور پکی اینٹ کے لیے بھی استعمال ہو جاتا ہے، جیسا کہ لغت عرب کی مشہور و معروف اور معتبر کتاب تاج العروس میں ہے:

ويقال في الحجر أو اللَّبِن إذا بني به : ضع اللَّبِنة غير هذه الوضعة..

"پتھر یا کچی اینٹ کے ساتھ جب عمارت بنائی جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس لَبِنَة کو اس کی جگہ کے سوا کسی اور جگہ رکھ دے۔" ❷

نیز مشہور و معروف اور صحیح حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((إنّ مثلي ومثل الأنبياء من قبلي كمثل رجل بنى بيتا ، فأحسنه وأجمله ، إلّا موضع لبنة من زاوية ، فجعل النّاس يطوفون به ويعجبون له ، ويقولون : هلّا وضعت هذه اللَّبنة . قال : فأنا اللَّبِنة ، وأنا خاتم النّبيّين))

"بے شک میری اور مجھ سے پہلے انبیائے کرام کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی نے گھر بنایا، اسے خوب سنوارا اور آراستہ کیا سوائے ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ کے۔ لوگ آ کر اس

❶ صحیح بخاری مع فتح الباری [illegible]

❷ تاج العروس [illegible]

کے گرد گھومنے لگے اور اس (کی خوبصورتی) سے تعجب کرنے لگے اور کہنے لگے: یہ اینٹ کیوں نہ لگا دی گئی؟" آپ ﷺ نے فرمایا: وہ لبنۃ (اینٹ) میں ہی ہوں، میں ہی خاتم النبیین ہوں۔" ❶

اب قارئین کرام ہی بتائیں کہ کیا ایک خوبصورت اور بہترین آراستہ پیراستہ محل پکی اینٹوں سے بنتا ہے یا کچی اینٹوں سے؟ اور پھر اس سے آگے یہ بتائیں کہ آپ ﷺ کی ختم نبوت کی مثال پکی اینٹ سے ہونی چاہیے یا کچی اینٹ سے؟

یقیناً یہاں پکی اینٹ ہی مراد ہے، جیسا کہ لغت عرب کی معروف کتاب کے حوالے سے بھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ پتھر پر بھی یہ لفظ بول دیا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ جب کوئی لفظی و معنوی قرینہ ہو تو کلام عرب میں یہ لفظ بسا اوقات پکی اینٹ پر بھی بولا جاتا ہے۔

اتنی سی بات میرٹھی صاحب کی سمجھ میں نہیں آئی اور لغت عرب کا اتنا مطالعہ ان کی قسمت میں نہیں ہو سکا اور وہ صحیح بخاری پر اعتراضات کرنے لگ گئے ہیں۔ اب تو ان کے معتقدین کو چاہیے کہ وہ حق کا ساتھ دینا شروع کر دیں!

② قارئین کرام یہ بات بھی ذہن نشین رکھیں کہ صحیح بخاری کی حدیث پر میرٹھی صاحب کا مرکزی اعتراض یہی تھا، جس کا بفضل اللہ کافی و شافی جواب ہم نے دے دیا ہے چنانچہ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ یہ حدیث تو بلا شبہ ثابت ہو گئی ہے۔ اب اگر کسی اور صحابی سے یہ حدیث ثابت نہ بھی ہو تو صحیح بخاری پر کوئی اعتراض نہیں رہے گا۔

اب باقی صحابہ کی اس معنی والی احادیث پر کیے گئے اعتراضات کا جواب ہم میرٹھی صاحب کی علمی و تحقیقی حیثیت مزید واضح کرنے کی غرض سے دے رہے ہیں۔

---

❶ صحیح بخاری: ۳۵۳۵، صحیح مسلم: ۲۲۸۶

عبداللہ بن ابی حبیب جو آزاد کردہ غلام عبداللہ بن نافع و نافع و صفیہ وابو کثیر اور سلیمان بن یسار، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ، ہند بنت حارث فراسیہ، صفیہ بنت شیبہ، ابو عثمان نہدی، حمید و ابو سلمہ پسران عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ، سعید بن مسیب، ابو وائل شقیق بن سلمہ، صفیہ بنت محصن، شعبی، عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما، عبدالرحمن بن حارث اور ان کے دو فرزند عکرمہ وابو بکر، عثمان بن عبداللہ بن موہب، عروہ بن زبیر، کریب مولائے ابن عباس، قبیصہ بن ذویب، نافع مولائے ابن عمر، مالک بن مالک وغیرہم۔

لیکن ان میں سے کسی نے بھی حضرت سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث نہیں سنی۔ کسی نے بھی سنی ہوتی تو ضرور وہ اس کی ضرور روایت کرتا۔

اور حسن بصری رحمہ اللہ سے بھی بہت سے لوگ مستفید و مستفیض ہوئے ہیں، لیکن خالد حذاء کے علاوہ کسی شخص نے حسن یا اس کے بھائی سعید سے اس کی روایت نہیں کی۔ حسن یا سعید نے یہ حدیث بیان کی ہوتی تبھی تو کوئی اس کی روایت کرتا۔

خالد حذاء کو کسی نامعلوم شخص نے حسن اور سعید کی طرف منسوب کر کے یہ حدیث سنا دی ہوگی۔ خالد نے اس شخص کا نام ذکر نہیں کیا اور حسن و سعید کی طرف منسوب کر کے اس کی روایت کر دی۔ پس خالد حذاء نے حضرت ابو سعید خدری کی طرف منسوب کر کے اور ام المومنین حضرت ام سلمہ کی طرف منسوب کر کے حضرت عمار کے متعلق یہ حدیث ذکر کی تھی۔۔۔" [1]

① شاید میرٹھی صاحب کو "مرسل" کی تعریف بھی نہیں آتی!

"مرسل" اس حدیث کو کہتے ہیں، جس کی سند کے آخر سے راوی گر جائے، یعنی کوئی تابعی

---

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ" (ا/۱۰۵-۱۰۷)

ڈائریکٹ نبی اکرم ﷺ سے روایت بیان کرے۔

بسا اوقات سند میں کسی بھی جگہ کسی راوی کے گرے ہونے کی وجہ سے بھی سند کو "مرسل" کہہ دیا جاتا ہے، لیکن کسی روایت کو "مرسل" قرار دینا کوئی عقلی ڈھکوسلا نہیں کہ جب کوئی چاہے رچا بیٹھے، جیسا کہ یہاں میرٹھی صاحب نے رچانے کی کوشش کی ہے کہ بغیر کسی دلیل کے صحیح بخاری کے خلاف اپنا مطلب حاصل کرنے کے لیے کہہ دیا ہے کہ:

"خالد نے براہ راست حسن سے یہ حدیث نہیں سنی، یہ حسن کے بھائی سعید سے۔"

حالانکہ دو پیچھے راوی جن کا آپس میں لقاء و سماع ثابت ہو یا بعض اوقات صرف امکان ہو، ہو، اگر ان میں سے پہلا "مدلس" نہ ہو تو روایت "متصل" ہی ہوتی ہے۔ ❶

یہ روایت بھی بلکل "صحیح" ہے، کیونکہ خالد الحذاء کا "مدلس" ہونا ثابت نہیں ہے۔

ہاں! اگر ان میں سے پچھلے راوی کے وہ حدیث دوسرے راوی سے نہ سننے کی کوئی دلیل آجائے تو وہ روایت "منقطع" ہوگی۔ محض ظن کیے جانے سے یہ حاصل نہیں ہوگا۔

② بالفرض یہ بات بھی مان لی جائے کہ یہ خالد الحذاء کی "مرسل" ہے تو بھی اسے خالد نے بیان نہیں کیا کہ اس وجہ سے "ضعیف" کہی جائے، بلکہ خالد کے علاوہ اور بہت سے راویوں نے اس حدیث کو اور سندوں سے بیان کیا ہے، جیسا کہ خود میرٹھی صاحب کو اس کا اعتراف ہے، نیز اس کا ذکر آئندہ بھی ہو رہا ہے، لہٰذا اس اعتراض کی کوئی وقعت نہیں۔

③ کسی صحابی سے روایت کرنے میں کسی تابعی کا منفرد ہو جانا یا سند کے کسی حصے میں بھی کسی استاذ سے روایت کرنے میں ایک شاگرد کا منفرد ہونا نہ اصول حدیث کے لحاظ سے کوئی خرابی ہے نہ ہی عقل کے۔ اس کا انکار کرنی ہے، اصطلاح حدیث میں ایسی حدیث کو "غریب" کہتے ہیں۔

---

❶ دیکھیے: مقدمہ صحیح مسلم

ثقہ کا تفرد یعنی کسی حدیث کا "غریب" ہونا کوئی خرابی نہیں

اصولِ حدیث کا مسلّم قاعدہ ہے، بلکہ اس پر امت کا اجماع و اتفاق ہے کہ کسی حدیث کا "غریب" ہونا کوئی خرابی نہیں، کیونکہ صحیح بخاری کی پہلی حدیث:

((إنما الأعمال بالنيات))

"یقیناً اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔"

اور آخری حدیث۔

((كلمتان حبيبتان إلى الرحمن، خفيفتان على اللسان، ثقيلتان في الميزان، سبحان الله وبحمده، سبحان الله العظيم))

"دو کلمے رحمٰن کو بہت محبوب ہیں، زبان پر بہت خفیف و آسان ہیں اور میزان میں بہت بھاری ہوں گے۔ وہ دو کلمے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ ہیں۔"

یہ دونوں حدیثیں ہی "غریب" ہیں، پھر بھی امتِ مسلمہ نے صحیح بخاری کی ان دونوں حدیثوں کی صحت پر اتفاق و اجماع کیا ہوا ہے۔ خود میرٹھی صاحب کے نزدیک وہ دونوں صحیح ہیں، کیونکہ وہ ان پر کوئی اعتراض نہیں کر پائے، ورنہ وہ انہیں ذکر کرکے ضرور ان پر اعتراض کرتے، پھر ان کی "تحقیق و تنقید" کا بھی یہی تقاضا تھا۔

⑦ اور تو اور خود میرٹھی صاحب نے اس اعتراض سے ایک صفحہ پہلے صحیح بخاری کی زیرِ بحث حدیث پر اعتراض کرنے کے لیے صحیح بخاری ہی کی ایک حدیث اپنی دلیل کے طور پر ذکر کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"۔۔۔ مسجدِ نبوی کی تعمیر پتھروں سے ہوئی تھی نہ کہ کچی اینٹوں سے ۔۔۔ مسجدِ نبوی کی تعمیر کے لیے صحابہ کرام پتھر لائے تھے۔ قریب کی پہاڑیوں سے پتھر لانے کی زحمت انہوں نے

اتفاقی تھی۔ اس لیے بحث میں لانے کا ذکر بے معنی ہے۔ مسجد نبوی کی تعمیر اور اس کے آغاز کا حضرت انس رضی اللہ عنہ نے وضاحت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے جس میں ہے: وجعلوا ینقلون الصخر (وہ پتھر لانا شروع ہوئے) (صحیح بخاری ج ۱ ص ۶۱، طبع ہند)" ❶

اب ذرا برقی صاحب کے معتقدین ٹھنڈے دماغ کے ساتھ غور کریں کہ یہ حدیث جسے برقی صاحب نے اپنی دلیل بنایا ہے اور زیر بحث حدیث کو غلط ثابت کر کے اسے صحیح قرار دینے کی کوشش کی ہے، یہ حدیث خود "غریب" ہے، کیونکہ اسے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے صرف ابو التیاح یزید بن حمید الضبعی نے بیان کیا ہے۔

کیا اب اگر کوئی شخص برقی صاحب کی روش پر چلتے ہوئے انہی کی طرح یہی ...... گردان دہرائے اور کہے کہ:

"پھر ذرا سوچیے تو سہی کہ سیدنا انس بن مالک کے علم میں یہ حدیث آئی ہوتی کہ نبی ﷺ نے پتھروں سے مسجد نبوی کی تعمیر کی تھی تو یقیناً وہ اس تعمیر کے بعد متعدد اشخاص سے اس کا ذکر فرماتے۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ ۹۳ ہجری میں فوت ہوئے ہیں۔ ۹۰ سال سے زائد اس مدت دراز میں بس ابو التیاح الضبعی، جن کا نام یزید بن حمید ہے، کا سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اس کی روایت کرنا کوئی سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے علمی استفادہ کرنے اور حدیثیں سننے والوں میں درج ذیل حضرات ہیں۔

آپ کے چار بیٹے عبیداللہ بن انس بن مالک، موسیٰ بن انس بن مالک، نضر بن انس بن مالک، ابوبکر بن انس بن مالک، آپ کے پوتے ثمامہ بن عبداللہ بن انس بن مالک

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/۱۰۳-۱۰۵

حفص بن عبید اللہ بن انس بن مالک وعبید اللہ بن ابی بکر بن انس بن مالک وہشام بن زید
بن انس بن مالک وابو بکر بن عبید اللہ بن انس بن مالک وابو بکر بن جعفر بن انس بن مالک ،
آپ کے چار بھتیجے حفص بن اخی انس وعبد اللہ بن عبد اللہ بن ابی طلحہ وعمرو بن عبد اللہ بن ابی
طلحہ ویعقوب بن عبد اللہ بن ابی طلحہ ۔ آپ کے نواسے ثمامہ بن زید ۔ اس کے علاوہ
ابان بن صالح ، ابان بن ابی عیاش ، ابراہیم بن میسرہ ، ازہر بن راشد ، اسحاق بن عبد اللہ
ابن ابی طلحہ ، ابو امامہ اسعد بن سہل بن حنیف ، اسماعیل بن عبد الرحمن السدی ، اسماعیل بن محمد
ابن سعد بن ابی وقاص ، اشعث بن عبد اللہ بن جابر الحدانی ، ایمن الخوارزمی ، انس بن سیرین ،
بدیل بن میسرہ العقیلی ، برید بن ابی مریم السلولی ، بشر ، بشیر بن یسار ، بکر بن عبد اللہ المزنی ،
بکیر بن الاخنس ، بکیر بن وہب الجزری ، بلال بن مرداس الفزاری ، بیان بن بشر ، توبہ
العنبری ، ثابت البنانی ، الجارود بن ابی سبرہ ، الجعد ابو عثمان ، جعفر بن عبد اللہ بن الحکم
الانصاری ، الحارث بن النعمان اللیثی ، حبیب بن ابی ثابت ، حبیب بن ابی حبیب ، الحجاج
ابن حسان القیسی ، الحسن البصری ، حصین بن عبد الرحمن الاشہلی ، حمزہ الضبی ، حمید الطویل ، حمید
ابن ہلال العدوی ، حنظلہ سدوسی ، ابو خلدہ خالد بن دینار ، خالد بن الفزر ، خیثمہ بن ابی خیثمہ ،
راشد بن سعد المقرائی ، الربیع بن انس البکری ، ربیعہ بن ابی عبد الرحمن ، رزیق الالہانی ،
ابو العالیہ رفیع الریاحی ، الزبیر بن عدی ، ابو یحییٰ زربی المؤذن ، زیاد نمیری ، زید بن اسلم ، زید
ابن الحواری العمی ، سالم بن ابی الجعد ، سالم بن عبد الرحمن ، سعد بن سعید انصاری ، سعد بن
سنان ، ابو مالک سعد بن طارق الاشجعی ، سعید بن ابی بردہ بن ابی موسیٰ الاشعری ، سعید بن جبیر ،
سعید بن خالد القارظی ، سعید بن ابی سعید المقبری ، ابو سعد سعید بن المرزبان ، سعید بن مسیب ،
ابو مسلمہ سعید بن یزید ، سلم علوی ، سلمہ بن وردان اللیثی ، سلیمان بن ابی سلیمان ، سلیمان بن
طرخان تیمی ، سلیمان بن مہران الاعمش ، سماک بن حرب ، سمیط سدوسی ، سنان بن ربیعہ

الباہلی، حبیب بن ابی، امامہ بن سہل بن حنیف، شعیب بن بشر بجلی، شمیل بن عزرہ، شریک بن عبداللہ بن ابی نمر، شعیب بن الحباب، ابو واقد صالح بن محمد بن زائدہ، صفوان بن سلیم، ضحاک بن حزام، ضمرہ بن سعید، طلحہ بن مصرف، ابو سفیان طلحہ بن نافع، طلق بن حبیب، عاصم بن سلیمان الاحول، عاصم بن عمر بن قتادہ، عامر الشعبی، عباد بن ابی علی، عبداللہ بن ابی بکر بن محمد ابن عمرو بن حزم، ابو الولید عبداللہ بن حارث بصری، ابو الزناد عبداللہ بن ذکوان، ابو قلابہ عبداللہ بن زید الجرمی، عبداللہ بن عبداللہ بن جابر الانصاری، ابو طوالہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن، عبداللہ بن عبدالرحمٰن الرومی، عبداللہ بن الفضل الہاشمی، عبداللہ بن محمد بن عقیل بن ابی طالب، عبداللہ بن مسلم بن شہاب الزہری (یہ بھی صرف ان لوگوں کے ناموں کا تیسرا حصہ ہیں، جنہوں نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے استفادہ کیا ہے، باقی نام طوالت کی وجہ سے ذکر نہیں کیے جا رہے ورنہ تین صفحات اور بھی کالے کیے جا سکتے ہیں، جس شخص کو تفصیل مطلوب ہو وہ تہذیب الکمال کی طرف رجوع کرے)۔۔۔

لیکن ان میں سے کسی نے بھی سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نہیں سنی۔ کسی نے سنی ہوتی تو ضرور وہ اس کی ضرور روایت کرتا۔۔۔"

میرٹھی صاحب کے معتقدین ہی انصاف سے کام لیتے ہوئے بتائیں کہ بھلا اتنی لمبی چوڑی بے ذکر وہ تحریر سے ایسا جاہل آدمی اپنا مطلب برآری کر سکتا ہے؟ اور کیا اس کو پڑھ کر میرٹھی صاحب مسجد نبوی کی تعمیر میں پتھر استعمال ہونے والی حدیث کا بھی انکار کر دیں گے اور اپنی دی ہوئی دلیل کو تھوک چاٹتے ہوئے واپس لے لیں گے؟

ابونضرہ کی بیان کردہ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث

سند و متن کا "اختلاف"!

"اور خالد حذاء کے علاوہ ابونضرہ یعنی منذر بن مالک قیسی نے بھی عمار کے متعلق ابوسعید خدری سے یہ حدیث روایت کی ہے۔ ابونضرہ سے ابومسلمہ اور داؤد بن ابی ہند نے۔ ابومسلمہ سعید بن یزید بن مسلمہ طائی کی حیثیت ہے۔ ابومسلمہ کی روایت یہ ہے۔۔۔ داؤد کی روایت یہ ہے۔۔۔ ابونضرہ سے یہ حدیث ابومسلمہ اور داؤد بن ابی ہند نے روایت کی ہے۔ دونوں کی روایت یکساں ہونی چاہیے، لیکن دونوں کی روایت میں اسناد کا بھی اختلاف ہے اور متن کا بھی تحت اختلاف ہے۔ اسناد کا اختلاف یہ ہے کہ ابومسلمہ کی روایت کے مطابق حضرت ابوسعید خدری نے یہ حدیث حضرت ابوقتادہ سے سنی تھی اور داؤد کی روایت یہ بتاتی ہے کہ ابوسعید نے یہ حدیث اپنے ساتھیوں سے سنی تھی۔ ان ساتھیوں میں سے ابوسعید نے کسی کا نام نہیں لیا۔

اور متن کا اختلاف یہ ہے کہ ابومسلمہ کی روایت کے مطابق غزوۂ خندق واقع ۵ ہجری کے موقع پر جب دیگر مومنین کے ساتھ عمار بن یاسر بھی خندق کھود رہے تھے، تب رسول اللہ ﷺ نے ان سے یہ بات فرمائی تھی اور داؤد کی روایت کے مطابق ۱ ہجری میں تعمیر مسجد کے لیے بھی اینٹیں ڈھو ڈھو کر لانے کے وقت آپ ﷺ نے عمار سے یہ پیش گوئی فرمائی تھی۔ اس ناقابل حل اختلاف سے قطع نظر ابونضرہ کی روایت بتاتی ہے کہ ابوسعید نے براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے عمار کے متعلق یہ بات نہیں سنی تھی۔ ابونضرہ کے دونوں تلمیذ اسے بیان کرنے میں متفق ہیں، ابومسلمہ بھی اور داؤد بن ابی ہند بھی۔ ابونضرہ کی روایت بتاتی ہے کہ ابوسعید خدری کو عمار کے متعلق یہ حدیث حضرت ابوقتادہ سے معلوم ہوئی تھی اور ابوقتادہ

نے رسول اللہ ﷺ سے سنی تھی، لیکن نقل اسے یاد نہیں کرتی کہ ابوقتادہ نے یہ حدیث ذکر کی ہو، کیونکہ ابوقتادہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھی اور حامی تھے۔ ان کی بیٹی حضرت حسن کے نکاح میں تھیں۔ ابوقتادہ کی وفات ۵۵ ہجری میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوئی ہے اور عمار بن یاسر ۳۷ ہجری میں قتل ہوئے تھے۔ پس اگر ابوقتادہ نے عمار کے متعلق حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ((تقتلك الفئة الباغية)) سنا ہوتا تو ابوقتادہ عمار وعلی کے طرفدار ہونے کی وجہ سے اسے برملا بیان کرتے اور عام لوگوں کو اس سے آگاہ فرماتے۔ یہ کوئی راز کی بات نہ تھی کہ بس ابوسعید خدری کو ہی موصوف نے یہ راز کی بات بتا دی تھی۔

حق یہ ہے کہ نہ حضور اکرم ﷺ کا عمار بن یاسر کے متعلق یہ فرمانا ثابت ہے نہ ابوسعید خدری یا ابوقتادہ انصاری یا حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اسے بیان کیا تھا۔

عکرمہ وابن عمر نے نہ معلوم کس سے یہ بے بنیاد بات سن لی تھی۔ دونوں رافضی تو نہ تھے، لیکن دونوں علی رضی اللہ عنہ کے مخالف تھے۔" ❶

ازالہ ① ایک روایت میں سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا سیدنا ابوقتادہ کا نام لینا اور دوسری سند میں یہ کہنا کہ میرے ساتھیوں میں سے کسی نے مجھے یہ حدیث بیان کی ہے، اس میں کوئی اختلاف کی بات نہیں۔ نہ جانے میرٹھی صاحب کو کیا ہو گیا تھا کہ ان کے نزدیک اجمال وتفصیل بھی اختلاف بن گیا تھا؟

نیز سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اگر دوسری روایت میں سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور ساتھی، جو کہ یقیناً صحابی ہوں گے، ان سے روایت کر رہے ہوں گے تو پھر بھی یہ کوئی قباحت نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے یہ حدیث دو صحابہ سے سنی ہے اور دونوں نے

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/ ۱۲۵، ۱۲۶

رسول اکرم ﷺ سے سن کر بیان کی تھی۔ اس میں بھلا اعتراض کی کیا بات ہے؟

④ رہا متن کا اختلاف کہ بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق غزوۂ خندق کے موقع پر رسول کریم ﷺ نے یہ ارشاد گرامی جاری کیا اور داؤد بن ابی ہند کی روایت کے مطابق یہ واقعہ مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت کا ہے۔۔۔ تو یہ اختلاف میرٹھی صاحب کا اپنا پیدا کیا ہوا ہے، کسی حدیث میں بھی غزوۂ خندق یا یوم خندق کے الفاظ نہیں ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ میرٹھی صاحب کا ''خندق'' کا معنی کرنے میں غلطی لگی ہے۔ اگر اس کے ساتھ غزوہ یا یوم کے الفاظ ہوتے یا کوئی معنوی قرینہ ہوتا تو معنی یہی ہوتے۔ لیکن ویسے ہر جگہ ''خندق'' کا معنی غزوۂ خندق والی کھودی گئی خندق کرنا ظلم کی بات ہے، کیونکہ اس کا لغوی معنی تو گڑھا ہوتا ہے جیسے کہ عربی لغت میں ہے

حفیر حول المکان ...

''کسی جگہ کے ارد گرد کھودا گیا گڑھا خندق کہلاتا ہے۔'' ❶

ممکن ہے کہ مسجد نبوی کے ہی ارد گرد کسی کام کے لیے گڑھا کھودا جا رہا ہو۔

پھر اگر میرٹھی صاحب کے معتقدین اصرار کریں کہ یہاں بغیر کسی دلیل کے غزوۂ خندق والی خندق ہی مراد لی ہے تو بھی اعتراض والی کوئی بات نہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ ایک چیز کوئی اگر دو یا زائد دفعہ مختلف جگہوں پر دہرا دیں تو اس میں کوئی خرابی نہیں ہوتی۔

مثال کے طور پر رسول کریم ﷺ نے مختلف صحابہ کرام کو جنت کی بشارت دی ہے اور کئی صحابہ کرام کو کئی بار یہ بشارت مختلف جگہوں پر ملی ہے اور مختلف صحابہ نے اس بشارت کو بیان کیا ہے، لیکن اس سے جنت کی بشارت میں کوئی سقم پیدا نہیں ہوا۔

---

❶ المعجم الوسیط: ١/٢٥٥

(۳) ...... رہا یہ کہ "یہ بتانا چاہئے کہ سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کو اگر یہ حدیث معلوم ہوتی تو وہ اسے بہت زیادہ بیان کرتے" تو یہ محض میرٹھی صاحب کی اٹکل ہے۔

وہ یہ بتانا بھی بھول گئے کہ «إنما الأعمال بالنيات» والی حدیث خود رسول اللہ ﷺ نے کتنی دفعہ بیان کی ہوگی، لیکن صرف سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہی رسول اکرم ﷺ سے اس حدیث کو بیان کرتے ہیں، پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بھی یقیناً یہ حدیث معلوم تھی اور آپ رضی اللہ عنہ نے اسے بیان بھی کیا ہے اور خوب کیا ہوگا، لیکن ان سے بیان کرنے والے صرف ایک ہی شاگرد علقمہ بن وقاص ہمارے سامنے آئے ہیں۔ پھر ان سے آگے بھی صرف ایک ہی شاگرد محمد بن ابراہیم تیمی اسے بیان کرتے ہیں اور ان سے آگے پھر ایک ہی شاگرد یحییٰ بن سعید انصاری بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان سے بیان کرنے والے بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔

لیکن اس سب کچھ کے باوجود کسی مسلمان نے اس حدیث پر یہ اعتراض نہیں کیا کہ ہماری عقل باور نہیں کر سکتی کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے بیان کیا ہو، ورنہ کیا وجہ ہے کہ آپ ﷺ سے صرف عمر بن خطاب ہی بیان کرتے ہیں؟ نہ ہی یہ اعتراض آگے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے شاگرد پر ہی کسی نے کیا ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ سب اعتراضات بے اصل ہیں اور انکارِ حدیث کے بہانے ہیں، ورنہ امتِ مسلمہ نے صحیح بخاری کی صحت پر یونہی ہی اجماع نہیں کر لیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گیارہواں باب

کفار سے مقابلے میں تخفیف والی آیت کریمہ کی تفسیر میں عکرمہ کی بیان کردہ حدیث ابن عباس

چودہ سو سال سے صحابہ، تابعین اور بعد میں آنے والے مفسرین مذکورہ بالا آیت کریمہ کی تفسیر یہی کرتے آئے ہیں کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ بتایا تھا کہ اگر دس کافروں کے مقابلے میں تمہارا ایک فرد بھی ہو تو وہ ان سے مقابلہ کرے، یعنی تمہاری تعداد اگر بیس ہے تو دو سو سے مقابلہ کرو، اور اگر تم ایک سو کی تعداد میں ہو تو ایک ہزار کافروں سے مقابلہ کرو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی کمزوری کی وجہ سے اس حکم میں تخفیف کر دی اور فرمایا کہ اب دو کافروں کے مقابلے میں ایک مسلمان ڈٹ کر مقابلہ کرے، یعنی اگر سو مسلمان ہوں تو دو سو کافروں کا مقابلہ کریں گے اور اگر ایک ہزار ہوں تو دو ہزار سے ۔۔۔ چنانچہ:

صحابی رسول سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

لما نزلت: ﴿إن يكن منكم عشرون صابرون يغلبوا مائتين﴾ [الأنفال: ٨/٦٥] شق ذلك على المسلمين حين فرض عليهم أن لا يفر واحد من عشرة، فجاء التخفيف، فقال: ﴿الآن خفف الله عنكم وعلم أن فيكم ضعفا فإن يكن منكم مائة صابرة يغلبوا مائتين﴾ [الأنفال: ٨/٦٦]، قال: فلما خفف الله عنهم من العدة نقص من الصبر بقدر ما خفف عنهم.

"جب یہ آیت نازل ہوئی کہ ﴿إن يكن منكم عشرون صابرون يغلبوا مائتين﴾ [الأنفال: ٨/٦٥] (اگر تم میں سے بیس صبر والے ہوں تو وہ دو سو کافروں پر غالب

آ گئیں) تو یہ بات مسلمانوں پر گراں گزری، جبکہ ان پر یہ فرض کر دیا گیا تھا کہ ان میں سے ایک مسلمان دس کافروں سے نہیں بھاگے گا۔ پھر تخفیف آئی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۚ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ﴾ (الانفال:٦٦) (اب اللہ تعالیٰ نے تم پر تخفیف کر دی ہے اور تم میں کمزوری کو ظاہر کر دیا ہے، اب اگر تم میں سے سو صبر کرنے والے ہوں تو وہ دو سو کافروں پر غالب آئیں) سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب (مقابلے والے کافروں کی) گنتی کم کی گئی تو اسی کے بقدر صبر بھی کم ہو گیا۔“ [1]

یہ ہے صحیح بخاری کی بیان کردہ تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ اور مسلمان مفسرین کرام اسی حدیث کو بنیاد بنا کر اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے رہے ہیں۔ کسی ایک ثقہ محدث نے بھی آج تک اس حدیث کا انکار نہیں کیا، بلکہ سب یک زبان اسی حدیث کے مطابق تفسیر کرتے آئے ہیں، جیسا کہ:

جلیل القدر تابعی امام عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

عبداللہ بن ابی نجیح (م ۱۳۱ھ) کہتے ہیں:

كان فرض عليهم إذا لقي عشرون مئتين ألا يفروا، فإنهم إن لم يفروا غلبوا. ثم خفف الله عنهم... فيقول: لا ينبغي أن يفر ألف من ألفين، فإنهم إن صبروا لهم غلبوهم.

”پہلے مسلمانوں پر ضروری تھا کہ ان میں سے بیس آدمی جب دو سو سے لڑائی کریں تو راہِ فرار اختیار نہ کریں، کیونکہ اگر وہ ان سے نہ بھاگیں گے تو غالب آ جائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے تخفیف فرما دی۔۔۔ فرمایا کہ ایک ہزار مسلمان دو ہزار کافروں سے نہ بھاگیں،

[1] صحيح بخاري: ٤٦٥٣، ٤٦٥٢

کیونکہ اگر وہ ان کے سامنے ڈٹ جائیں گے تو ان پر غالب آجائیں گے۔" ❶

امام تفسیر اسماعیل بن عبدالرحمٰن سدی رحمہ اللہ (م ۱۲۷ھ) فرماتے ہیں:

يقول: يقاتلوا مائتين، فكانوا أضعف من ذلك، فنسخها الله عنهم، فخفّف ... فجعل أوّل مرّة الرّجل لعشرة، ثمّ جعل الرّجل لاثنين.

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ (بیس مسلمان) دو سو کافروں سے لڑائی کریں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ حکم منسوخ کر دیا اور تخفیف فرما دی، چنانچہ پہلے ایک مسلمان مرد دس کافروں کے مقابلے میں کھڑا کیا، پھر (منسوخ کر کے) ایک آدمی کو دو کافروں کے مقابلے میں کھڑا کیا۔" ❷

امام طبری رحمہ اللہ (م ۳۱۰ھ) فرماتے ہیں:

ثمّ خفّف تعالى ذكره عن المؤمنين، إذ علم ضعفهم ... يعني أن لا يلي الواحد منهم على قتال العشرة من عدوّهم ضعفًا ..

"پھر جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی کمزوری ظاہر کر دی تو ان سے تخفیف کر دی۔۔۔ یعنی (کمزوری یہ تھی کہ) ایک مسلمان کے دس دشمنوں سے لڑائی کرنے میں کمزوری تھی۔"

نیز فرماتے ہیں:

وبنحو ما قلنا في ذلك، قال أهل التأويل ...

"جس طرح ہم نے کہا ہے، اسی طرح مفسرین (صحابہ و تابعین) نے فرمایا ہے۔۔۔" ❸

چنانچہ تمام مسلمانوں کے نزدیک اس فرمانِ باری تعالیٰ کی یہی تفسیر ہے۔

---

❶ تفسیر الطبری: ۱٤/۵۰، وسندہٗ صحیح

❷ تفسیر الطبری: ۱٤/۵۵-۵٦، وسندہٗ حسن

❸ تفسیر الطبری: ۱٤/٦۱

لیکن چودہ سو سال بعد شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب نے نیا انکشاف کرتے ہوئے اور سب سلف صالحین اور ائمہ دین ومحدثین کو بدعقیدہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ روایت شروع سے لے کر آخر تک عکرمہ کی بڑی نازیبا غلط بیانی ہے۔۔۔ اور اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ غلط عقیدہ یہود وروافض کا ہے، جسے اصطلاح میں عقیدۂ بداء کہتے ہیں۔ اہلِ اسلام اس عقیدے سے بیزار و بری ہیں۔۔۔" ❶

آیئے اب ان کے اس صحیح حدیث پر اعتراضات کا منصفانہ جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کے اتفاقی فیصلے کے خلاف ان کی اس واہی تباہی کی کیا وقعت ہے؟

میرٹھی اعتراضات اور ان کا منصفانہ جائزہ

قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں کہ میرٹھی صاحب اس حدیث پر کوئی اصولی اعتراض نہیں کر پائے، بلکہ انھوں نے محض عقل پرستی کی بھینٹ چڑھتے ہوئے ایک بالکل ثقہ ومعتبر راوی عکرمہ پر الزام دھر دیا ہے اور پھر کچھ بے جا قسم کے اعتراضات کیے ہیں۔ ان کا تجزیہ ملاحظہ فرمائیں:

فصلِ اوّل: فنی اعتراضات کا جائزہ

❀ اس آیت کے نزول کے وقت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی عدم موجودگی!

"یہ روایت شروع سے آخر تک عکرمہ کی بڑی نازیبا غلط بیانی ہے اس لیے کہ سورۂ انفال کے نزول کے زمانے میں حضرت عبداللہ بن عباس مدینے میں نہ تھے۔ وہ تو چھ سال کی عمر کے بچے تھے اور اپنے والدین کے ساتھ مکے میں ہی تھے۔ غزوۂ بدر کے چھ سال بعد ۸ ہجری میں

---

❶ صحیح بخاری کا مطالعہ: ۱۲۶ _ ۲۱۵

مکہ مکرمہ فتح ہوا تھا۔ اس کے بعد اپنے والدین کے ساتھ مکہ سے مدینہ میں منتقل ہوئے تھے۔ پس ابن عباس کو کیسے معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ کا ارشاد ﴿إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ﴾ نازل ہوا تو مومنین پر شاق گزرا، اور دوسری آیت ﴿فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ﴾ نے نازل ہو کر انہیں تسکین بخشی؟ حالانکہ کوئی نقلی یا معنوی دلیل موجود نہیں ہے، جو بتاتی ہے کہ ان دونوں آیتوں کے درمیان نزول کے لحاظ سے کچھ دنوں کا فصل رہا ہے۔۔۔“ ❶

تبصرہ: آیئے جس وجہ سے برقی صاحب نے اس حدیث کو بکرمہ کی ”بڑی نازیبا غلط بیانی“ قرار دیا ہے، اس کا تفصیلی جائزہ لیں کہ کہیں یہ خود برقی صاحب کی اپنی ”بڑی نازیبا“ نمائش تو نہیں! ہاں! یقیناً ایسا ہی ہے، کیونکہ:

① اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جتنی بھی احادیث بیان کی ہیں ساری کی ساری خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سننے یا دیکھنے کی بنا پر بیان نہیں کیں، بلکہ کچھ احادیث انہوں نے دوسروں سے سن کر بیان کی ہوتی ہیں، لیکن ایسی احادیث میں اصولی اعتبار سے کوئی خرابی نہیں ہوتی۔

کیونکہ صحابہ کرام جب ایسی حدیث بیان کریں جو انہوں نے ڈائریکٹ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی نہ ہو تو وہ لازماً کسی دوسرے صحابی سے سن کر بیان کر رہے ہوتے ہیں اور ایسے اصطلاح محدثین میں ”مرسل صحابی“ کہتے ہیں اور یہ عام ”مرسل“ حدیث کی طرح ”ضعیف“ نہیں، بلکہ محدثین کے نزدیک مقبول ہوتی ہے، حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ (577-643ھ) فرماتے ہیں:

ثُمَّ إِنَّا لَا نَعُدُّ فِي أَنْوَاعِ الْمُرْسَلِ وَنَحْوِهِ مَا يُسَمَّى فِي أُصُولِ الْفِقْهِ مُرْسَلَ

❶ ”صحیح بخاری کا مطالعہ“: 1/124

الصّحابي، مثل ما يرويه ابن عباس وغيره من أحداث الصّحابة عن رسول الله صلّى الله عليه وسلّم ولم يسمعوه منه، لأنّ ذلك في حكم الموصول المسند، لأنّ روايتهم عن الصّحابة، والجهالة بالصّحابيّ غير قادحة، لأنّ الصّحابة كلّهم عدول..

''پھر یہ بھی یاد رہے کہ جس حدیث کو اصولِ فقہ میں مرسل صحابی کا نام دیا جاتا ہے، ہم (محدثین) اسے مرسل وغیرہ کی اقسام میں شمار نہیں کرتے، جیسا کہ وہ احادیث جن کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ان جیسے دوسرے کم سن صحابہ رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے ہیں، حالانکہ انہوں نے وہ احادیث آپ ﷺ سے نہیں سنی ہوتیں۔ (ہم ان کو ضعیف قرار نہیں دیتے) کیونکہ یہ موصول اور مسند حدیث کے حکم میں ہوتی ہیں، وجہ یہ ہے کہ کم سن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (دیگر کبار) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہی روایت کرتے ہیں اور صحابی کا معلوم نہ ہونا (حدیث کی صحت میں) عیب نہیں، اس لیے کہ سارے صحابہ عادل ہیں۔'' [1]

حافظ نووی رحمہ اللہ (م ۶۷۶ھ) لکھتے ہیں:

انّ مرسل الصّحابيّ حجّة عند جميع العلماء...

''بلاشبہ مرسل صحابی سب علمائے کرام کے نزدیک حجت ہے۔'' [2]

نیز لکھتے ہیں:

انّ مرسل الصّحابيّ اذا لم يعرف المحذوف يكون حجّة...

''یقیناً جب محذوف راوی معلوم نہ ہو سکے تو (بھی) مرسل صحابی حجت ہوتی ہے۔'' [3]

[1] مقدمة ابن الصلاح، ص ۳۱/۱ [2] شرح صحیح مسلم: ۱۹۷/۲

[3] شرح صحیح مسلم ۱۹۸/۱

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

انّ الجمھور حجة حجة.

"بے شک جمہور علماء کرام نے تو اسے (مرسل صحابی کو) حجت مانا ہے۔" ❶

معلوم ہوا کہ میرٹھی صاحب کا یہ اعتراض اصطلاحات محدثین سے ناواقفیت کا کرشمہ ہے اور ان کا صحیح بخاری پر یہ اعتراض بجائے عکرمہ رحمہ اللہ کے خود ان کی "بے پناہ" "نہایت نازیبا" "غلط فہمی" بن کر رہ گیا ہے۔

② عکرمہ رحمہ اللہ کے علاوہ ایک اور راوی نے بھی یہ حدیث بالکل اسی طرح سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کی ہے

وہ راوی عمرو بن دینار ہیں، جو کہ بہت بڑے امام و محدث ہیں۔ ان کی روایت صحیح بخاری میں ہی موجود ہے۔ دوسرے کی بات یہ ہے کہ میرٹھی صاحب نے جو عکرمہ کی روایت پیش کی ہے، اس سے متصل پہلے عمرو بن دینار رحمہ اللہ کی روایت بھی موجود تھی، لیکن نہ جانے کیوں ان کو وہ نظر نہ آسکی اور انہوں نے بلا دلیل عکرمہ رحمہ اللہ پر غلط بیانی کا الزام تھوپ دیا ہے؟

اب اللہ کے لیے میرٹھی صاحب کے معتقدین ہی انصاف سے بتائیں کہ ان کے صاحب کا عکرمہ رحمہ اللہ پر غلط بیانی کا نہایت نازیبا الزام کیا درست تھا؟ عکرمہ رحمہ اللہ کو تو انہوں نے جو کہنا تھا کہہ دیا، کیا امام عمرو بن دینار پر بھی وہ یہی الزام دھر پائیں گے؟

اس طرح تو ہماری دنیا ہی غلط بیانی ہو جائے گی اور صرف وہ میرٹھی صاحب ہی صاف کردہ جائیں گے، جن کی علمی و منطقی قابلیت کا اندازہ قارئین کرام کرتے ہی آ رہے ہیں۔

③ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما مفسر قرآن ہیں اور تفسیر انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

❶ النکت علی کتاب ابن الصلاح: ۵۸۵/۲

حاصل ہوئی ہے؟ کیا یہ بات بھی بیان کرنے والی ہے کہ آپ ﷺ نے ان آیات کی تفسیر بتاتے وقت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کو یہ بات بتادی ہو؟

③ رہا برق صاحب کا یہ قول کہ:

''کوئی لفظی یا معنوی دلیل موجود نہیں، جو یہ بتائے کہ ان دونوں آیتوں کے درمیان نزول کے لحاظ سے چند دنوں کا فصل رہا ہے۔''

تو یہ بالکل بے جا ہے، کیونکہ ہم نے پچھلے اعتراض کے ضمن میں محدثین و مفسرین کے جو اقوال پیش کیے ہیں، ان میں موجود دلائل سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ پہلی آیت منسوخ اور دوسری ناسخ ہے۔

ہم تمام مفسرین کے اقوال پیش کر کے بات کو طول نہیں دینا چاہتے لیکن اگر اب بھی کسی شخص کو کوئی دلیل نظر نہیں آئی تو ہم امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ کا ایک قول نقل کر دیتے ہیں کہ:

فلم يكن التخفيف إلا بعد التثقيل، وإذا لم يكن التشديد قد كان له متقدمًا، لم يكن للترخيص وجه، إذ كان المفهوم من الترخيص إنما هو بعد التشديد، وإذ كان ذلك كذلك، فمعلوم أن حكم قوله: ﴿الْآنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا﴾ ناسخ لحكم قوله: ﴿إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾...

''تخفیف ہمیشہ تثقیل (کسی بوجھل حکم کے لاگو ہونے) کے بعد آیا ہوتی ہے۔ جب کہ اس سے پہلے تشدید نہ تھی تو رخصت و تخفیف کی کوئی معقولیت نہیں، کیونکہ ترخیص و تخفیف کا مفہوم ہمیشہ تشدید کے بعد ہوتا ہے۔ جب معاملہ ایسے ہے تو معلوم ہو گیا کہ فرمان باری تعالیٰ: ﴿الْآنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا﴾ اس فرمان باری تعالیٰ کو منسوخ

کرنے والا ہے: ﴿ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا ﴾۔۔۔" ❶

چنانچہ کوئی سلیم العقل شخص ہو تو اسے لفظی و معنوی دونوں طرح کی دلیلیں نظر آرہی ہیں، ورنہ "میں نہ مانوں" کا تو کوئی علاج کسی کے پاس نہیں۔ صاحب بیرکی صاحب کا کوئی معتقد ہی بتائے کہ کسی کام میں تخفیف کب ہوتی ہے، اس سے بھاری کام کے آنے سے پہلے یا بعد میں؟

فصلِ ثانی: عقلی اعتراضات کا جائزہ

❁ اس آیت میں کوئی حکم ہی نہیں کہ منسوخ ہو!

"جن لوگوں نے پہلی آیت کو منسوخ اور دوسری کو ناسخ بتایا ہے اور کہا ہے کہ پہلے ﴿ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ﴾ حکم تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر کے حکم ﴿ فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ﴾ نازل فرمایا یعنی پہلے دس یا دس سے کم کافروں کے مقابلے میں کسی مسلمان کا بھاگ جانا ناجائز تھا، پھر یہ حکم ہوا کہ ایک مسلمان دو کافروں کے مقابلے سے نہ بھاگے۔ تین یا اس سے زائد ہوں تو ان کے مقابلے سے کسی مسلمان کا بھاگ جانا ناجائز نہیں ہے۔

لیکن یہ قول قطعاً غلط ہے۔ نہ پہلی آیت میں کوئی حکم مذکور ہے، نہ دوسری میں۔ نہ دوسری آیت ناسخ ہے، نہ پہلی منسوخ، کیونکہ نسخ احکام میں ہی چلتا ہے۔ لوگوں کو اس غلط فہمی میں صحیح بخاری میں درج شدہ عکرمہ کی بیان کی ہوئی حدیث نے ڈالا ہے، جس کی اس نے عبداللہ بن عباس سے روایت کی ہے۔۔۔" ❷

---

❶ تفسیر الطبری: ۱۱/۵۷ ❷ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۱۳

(ن) میرٹھی صاحب کو ان آیات میں کوئی حکم نظر نہیں آیا تو یہ کسی اور کا نہیں، ان کا اپنا قصور ہے، اور وہ قصور ہے بھی خالص علمی قسم کا، کیونکہ ان کو علم بلاغت سے مس بھی نہیں، جو کہ کسی بھی زبان بالخصوص عربی لغت کو سمجھنے کے لیے ازحد ضروری ہے۔

آٹھویں صدی کے ماہر بلاغت علامہ جلال الدین قزوینی (م ۷۳۹ھ) لکھتے ہیں:

ثمّ الخبر قد يقع موقع الإنشاء للتفاؤل أو لإظهار الحرص في وقوعه...

"پھر (یہ بھی یاد رہے کہ) کبھی کبھی تفاؤل (اچھی فال لینے) کے لیے یا اس کام میں واقع ہونے کی حرص کو ظاہر کرنے کے لیے خبر بھی انشاء (حکم وغیرہ) کی جگہ پر استعمال ہو جاتی ہے۔۔۔" ❶

نیز یہی بات آٹھویں صدی کے سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی (م ۷۹۲ھ) نے بھی اسی طرح لکھی ہے۔ ❷

کیا اب بھی میرٹھی صاحب کے معتقدین کو اپنے صاحب کی علم بلاغت اور لغت عرب سے ناواقفیت کا یقین نہیں ہو گیا اور انہیں معلوم نہیں ہو گیا کہ بسا اوقات قرآن پڑھے جانے کے وقت کلام عرب میں خبر دے کر بھی حکم مراد لیا جاتا ہے؟

افسوس تو اس بات کا ہے کہ میرٹھی صاحب نے تفسیری روایات پر کلام کرنے سے پہلے مشہور و معروف تفاسیر کا بھی مطالعہ نہیں کیا۔ اگر ایسا کر لیتے تو شاید اس اعتراض کی نوبت ان کو نہ آتی، کیونکہ مشہور مفسر امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ (م ۳۱۰ھ) آج سے قریباً ۱۰ صدیاں پہلے اس آیت کے تحت لکھ گئے ہیں:

❶ الایضاح فی علوم البلاغۃ: ص ۱۲۴

❷ مختصر المعانی: ص ۱۳۵

وهذه الآية وإن كان ظاهرها الخبر، فإن معناها الأمر، يدل على ذلك قوله ﴿ ٱلۡـَٔـٰنَ خَفَّفَ ٱللَّهُ عَنكُمۡ ﴾، فلم يكن التخفيف إلا بعد التثقيل...

''یہ آیت اگرچہ ظاہراً خبر ہے لیکن اس کا معنیٰ امر (حکم) ہے، اس پر دلیل یہ فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿ ٱلۡـَٔـٰنَ خَفَّفَ ٱللَّهُ عَنكُمۡ ﴾ (اب اللہ تعالیٰ نے تم پر تخفیف کی ہے)، کیونکہ تخفیف ہمیشہ تثقیل (کسی کام کے بوجھل ہونے) کے بعد ہی ہوتی ہے۔۔۔'' ❶

مشہور مفسر علامہ بغوی رحمہ اللہ (۵۱۶ھ) لکھتے ہیں:

هذا خبر بمعنى الأمر...

''یہ خبر ہے لیکن امر (حکم) کے معنیٰ میں ہے۔۔۔'' ❷

معروف لغوی و مفسر علامہ خازن (م ۷۴۱ھ) لکھتے ہیں:

وظاهر لفظ الآية خبر ومعناه الأمر... ويدل على أن المراد بهذا الخبر الأمر قوله: ﴿ ٱلۡـَٔـٰنَ خَفَّفَ ٱللَّهُ عَنكُمۡ ﴾.

''اس آیت کے ظاہری الفاظ خبر ہیں لیکن معنیٰ امر (حکم) کا ہے۔۔۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ اس خبر سے حکم مراد ہے، یہ فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿ ٱلۡـَٔـٰنَ خَفَّفَ ٱللَّهُ عَنكُمۡ ﴾ (اب اللہ تعالیٰ نے تم پر تخفیف کر دی ہے) اور تخفیف صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب پہلے والی بھاری حکم فرض کیا ہوا ہو۔۔۔'' ❸

---

❶ تفسیر مظہری: ۴/۱۲۶_۱۲۷

❷ معالم التنزیل للبغوی: ۲/۲۶۵

❸ لباب التأویل فی معانی التنزیل للخازن: ۲/۲۹۴

آپ علمائے بلاغت کی زبانی پڑھ چکے ہیں کہ جب کسی چیز پر دلالت بڑھانا مقصود ہو تو اس وقت خبر، انشاء (حکم) کے معنی میں ہوتی ہے۔ اسی اصول کو بیان کرتے ہوئے مشہور مفسر علامہ فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ) اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

﴿وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ وذلك ترغيب في الثبات على الجهاد، فثبت أن المراد من هذا الكلام هو الأمر، وإن كان وارداً بلفظ الخبر.

"﴿وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) یہ (فرمانِ باری تعالیٰ) جہاد میں استقامت اختیار کرنے کی ترغیب کے لیے ہے، لہٰذا ثابت ہوگیا کہ اس کلام سے مراد حکم ہے، اگرچہ یہ خبر کے لفظ کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔" [1]

نیز مفسر ابن عادل (م ۸۸۰ھ) لکھتے ہیں:

هذا خبر والمراد به الأمر، كقوله تعالى: ﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ (البقرة: ۲۳۳)، والمعنى: ﴿اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ﴾ فليصبروا وليجتهدوا في القتال، حتى ﴿يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ﴾، ويدل على أن المراد الأمر وجوه. وثانيها: قوله تعالى: ﴿اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ﴾ نسخ، والنسخ لا يليق إلا بالأمر، وثالثها: قوله تعالى: ﴿وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾، وذلك ترغيب في الثبات على الجهاد.

"یہ الفاظ خبر کے ہیں، لیکن اس سے مراد حکم ہے، جیسا کہ اس فرمانِ باری تعالیٰ میں ہے: ﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ (البقرة: ۲۳۳) [مائیں اپنی اولادوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔] یہاں بھی يُرْضِعْنَ مضارع کا صیغہ ہے، جو کہ

---

[1] التفسير الكبير للرازي ۱۵/۱۵۲

خبر پر دلالت کرتا ہے، لیکن مراد حکم ہے [ ] اس فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ﴾ کا معنی یہ ہے کہ وہ (مسلمان) صبر کریں اور لڑائی میں مزید محنت و کوشش کریں یہاں تک کہ دو سو پر غالب آ جائیں۔ اس بات کی دلیلیں کہ اس آیت میں خبر سے مراد امر ہے، کئی ہیں۔۔۔ ان میں سے دوسری یہ ہے کہ فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنْكُمْ﴾ نسخ ہے اور نسخ صرف حکم میں ہی ہو سکتا ہے۔ تیسری دلیل یہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے کہ ﴿وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ (اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)۔ یہ جہاد میں ثابت قدمی پر ترغیب ہے۔ (جب یہ ترغیب ہے تو ترغیب کی موجودگی میں بھی خبر، حکم کے معنی میں ہو جاتی ہے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے)۔" ❶

ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں، ورنہ مفسرین اور ماہرینِ لغت و ادب کے اور بھی بہت سے حوالے پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن یہ ہم اصل موضوع سے کہیں دور لے جائے گا۔

دیکھا قارئین کرام آپ نے کہ کتنی صراحت سے یہ بات بیان ہوئی ہے۔ لغت و ادب کے جن ماہرین نے یہ قاعدہ و قانون بیان کیا ہے کہ نسخ حکم میں ہوتا ہے خبر میں نہیں، انھی ماہرینِ لغت و ادب نے یہ بھی بتایا ہے کہ بسا اوقات قرائن کی وجہ سے خبر بھی حکم کے معنی میں ہوتی ہے، لیکن برا ہو اس انکارِ حدیث کا کہ اس نے آنکھوں پر کیسی پٹی چڑھا دی ہے۔ ائمۂ امت کی تحقیقات اور محدثین کرام کی تحقیق بھی ان کو ہیچ لگتی ہے۔

لہٰذا ان کا صحیح بخاری پر اعتراض کرنے کا سبب محدثین و مؤلف صحیح بخاری پر "غلط فہمی" کا الزام دھرنا، ان کی ذہنی کم فہمی کی بین دلیل بن گیا ہے۔ گویا برقی صاحب کا پہلا اعتراض صحیح بخاری اور محدثین پر نہیں، بلکہ خود اپنی عقل پر ہے۔

❶ [illegible]

مسلمانوں کی قوتِ صبر میں تخفیف خلافِ واقعہ ہے!

"اور یہ جو حدیث میں راوی یعنی عکرمہ یا ابن عباس کا قول مذکور ہے کہ اللہ نے جس قدر مومنین سے تعداد میں تخفیف فرمائی، اسی قدر ان کی قوتِ صبر شعاری تو یہ بات نہ صرف بے دلیل ہے، بلکہ خلافِ واقع ہونے کی وجہ سے قطعاً غلط ہے، کیونکہ جیسا کہ معلوم ہے کہ جنگِ موتہ کے سوا کسی بھی جنگ میں حضور اکرم ﷺ کے عہد میں مسلمانوں کا دگنے زائد کفار سے مقابلہ نہیں ہوا، لیکن حضرت ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے عہد میں اہلِ اسلام کا ہر معرکہ میں تقریباً دس گنے زائد کفار سے مقابلہ ہوا ہے اور یہ حضرت عبداللہ بن عباس کے سامنے کی بات ہے۔ بعض معرکوں میں وہ خود بھی شریک رہے ہیں، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ابن عباس نے یہ خلافِ واقع اور قطعاً غلط بات کہی ہو؟" ❶

جواب

① جب میرٹھی صاحب اس کی سند پر کوئی اعتراض نہیں کر سکے تو صرف اپنے عقلی اشکال کی وجہ سے اس کا انکار کرنا محض تعصب ہے۔

② سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول بالکل صحیح ہے۔ نہ جانے میرٹھی صاحب کو اس میں کیا غلطی نظر آئی ہے۔ ان کا کوئی معتقد ہی بتائے کہ کیا صبر کے کم ہونے سے مراد یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقابلہ دس گنا کفار سے ہوا ہے اور وہ بھاگ گئے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر یہ بات ویسے ہی بے محل اور بے فائدہ ہے۔

③ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اس حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ مسلمانوں کا مقابلہ ہمیشہ دس گنا کافروں سے ہوگا، بلکہ مطلب یہ تھا کہ اگر کسی موقع پر دس گنا کفار سے مقابلہ کرنا پڑے تو وہ بھاگیں گے نہیں، مثلاً کسی معرکے میں اچانک کسی جگہ دس مسلمانوں کے

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/۱۳۲

سامنے سو کافر آجاتے ہیں تو وہ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کریں، یہ مراد نہیں تھی کہ شروع جنگ میں جو حق ہوئی اس میں تعداد کا یہ تناسب ہوگا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کا یہ مطلب ہے۔

یہی بات میرٹھی صاحب کی سمجھ میں نہیں آئی اور غلط فہمی کا شکار ہو کر وہ امت مسلمہ کے اتفاقی فیصلے صحیح بخاری پر اعتراض کرنے پر اتر آئے ہیں۔

کیا نسخ سے عقیدۂ بدا ثابت ہوتا ہے!

"علاوہ بریں ایک عظیم خرابی عکرمہ کی اس روایت میں یہ ہے کہ اس کے مضمون کے مطابق جب اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں مسلمانوں کو دس گنے زائد کفار سے جنگ کرنے اور ان کے مقابلہ پر ڈٹے رہنے کا حکم دیا تو معاذ اللہ اس وقت اسے معلوم نہ تھا کہ مومنین اس قابل نہیں ہیں اور ان میں کمزوری ہے، پھر جب اللہ نے جان لیا کہ اہل اسلام اپنی کمزوری کی وجہ سے اس حکم کے متحمل نہیں ہو سکتے تب تخفیف فرمائی اور دس گنے کی بجائے دو گنے زائد کفار سے ہی مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔

اور اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ غلط عقیدہ یہود و مجوس کا ہے، جسے اصطلاح میں عقیدۂ بداء کہتے ہیں۔ اہل اسلام اس عقیدے سے بیزار ہیں۔ ہمارا رب علیم کی ذات ممکن نہیں ہے جو بے جانے بوجھے کوئی حکم صادر فرمادے، پھر پچھتائے۔ دنیوی حکمرانوں پر بھی عقلاً لازم ہے کہ کسی حکم کو صادر کرنے سے پہلے ممکنات کا اچھی طرح جائزہ لے لے۔ سبحانہ و تعالیٰ عن ذلک علوا کبیرا۔ ان وجوہ کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن عباس کی طرف اس کی نسبت قطعاً غلط ہے اور یہ سب روایت کا قصور ہے...." ❶

❶ دیکھیے قرآنی مطالعہ، ص ۱۲۵

جواب ① یہ ہے آخری زور، جو میرٹھی صاحب نے صحیح بخاری کی اس صحیح حدیث کے خلاف لگایا ہے، لیکن قارئین کرام اور دیں میرٹھی صاحب کی اس "تذبذب بیانی" کی کہ وہ صحیح بخاری اور پوری امت مسلمہ کو بدعقیدہ قرار دے گئے ہیں۔

ہم ان کے فیض یافتگان سے ہی مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ صحیح بخاری کی مذکورہ حدیث میں سے کوئی ایسا لفظ ہمیں دکھا دیں، جس کا معنیٰ یہ ہو کہ (معاذ اللہ!) پہلے اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم نہیں تھا، بعد میں ہوا۔

یہ اعتراض دراصل قرآن کریم پر ہوا ہے کہ اسی کی آیت میں وہ الفاظ ہیں، جو صحیح بخاری کی حدیث میں مندرج ہیں۔ کیا قرآن کریم کی ان آیات میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما یا ان کے شاگرد رشید عکرمہ رحمہ اللہ نے کوئی لفظ بڑھایا ہے، جس کی وجہ سے میرٹھی صاحب نے اس میں غلط عقیدے کا اثبات کرنے کی کوشش کی ہے۔

جب صحیح بخاری میں وہی الفاظ ہیں، جو قرآن کریم میں ہیں تو قصور میرٹھی صاحب کا اپنا ہے، صحیح بخاری کا نہیں۔

② خود میرٹھی صاحب صحیح بخاری پر اعتراض کرتے کرتے عقیدۂ بداء کے قائل ہو گئے ہیں، کیونکہ انہوں نے اس آیت کریمہ کا یہ ترجمہ کیا ہے:

"سردست اللہ نے تم سے بار ہلکا کیا اور جانا ہے کہ تم میں کچھ کمزوری ہے۔" ❶

ان دو میرٹھی صاحب سے پوچھیں کہ عقیدۂ بداء تو یہی ہے کہ سردست اللہ تعالیٰ نے جانا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ سے جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم کو سردست (حالیہ) قرار دینا ہی تو عقیدۂ بداء ہی تو ہے۔

اسے ہی کہتے ہیں کہ

❶ صحیح بخاری کا مطالعہ: 2/ ...

انجام تم کو دینے تھے وہ سامنے نکل آیا۔

③ محدثین اور صحیح بخاری کو ماننے والے مؤمنین یہ عقیدہ نہیں رکھتے، بلکہ وہ واضح طور پر اس طرح کے الفاظ کا معنی "علم ظہوری" کرتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کے جان لینے سے مراد ظاہر ہونا ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ سے ہر چیز کو جانتا ہے۔

اس کی تفصیل تمام معتبر تفاسیر میں دیکھی جا سکتی ہے، جسے ذکر کرنا محض تطویل ہوگی۔

صرف اسی آیت کے بارے میں ایک قول ملاحظہ فرمائیں، علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

وقال الطيبي: المعنى الآن خفف الله عنكم لما ظهر متعلق علمه، أي كثرتكم التي هو موجب ضعفكم بعد ظهور قلتكم وقوتكم..

"فرمان باری تعالیٰ ﴿ الآن خفف الله عنكم ﴾ کا معنی یہ ہے کہ (اب تخفیف اس لیے ہوئی ہے کہ) اللہ تعالیٰ کے علم سے تعلق رکھنے والی چیز ظاہر ہو گئی ہے، وہ یہ کہ تم تعداد کی کمی کے باوجود قوت رکھتے تھے، اس کے بعد تمہاری وہ کثرت، جو کہ تمہاری کمزوری کا باعث بنی ہے (وہ اب دنیا کے سامنے ظاہر ہو گئی ہے)۔۔۔" ❶

نیز اس جیسے مقامات قرآنی کے بارہ میں قاعدہ وقانون ذکر کرتے ہوئے نامور عرب عالم، شیخ علامہ محمد بن صالح بن محمد العثیمین رحمہ اللہ (م ۱۴۲۱ھ) لکھتے ہیں:

واعلم أن هذه العبارة، يراد بها شيئان: الأول: علم رؤية وظهور ومشاهدة، أي لنرى، ومعلوم أن علم ما سيكون ليس كعلم ما كان، لأن علم الله بالشيء قبل وقوعه علم بأنه سيقع، ولكن بعد وقوعه علم بأنه وقع، والثاني: أن العلم الذي يترتب عليه الجزاء هو المراد، أي لنعلم

❶ روح المعانی: ۱۰/۳۱

علمًا يترتب عليه والجزاء، وذلك كقوله تعالى: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنكُمْ وَالصَّابِرِينَ﴾ (محمد: ٣١) قبل أن يبتليا قد علم من هو المطيع ومن هو العاصي، ولكن هذا لا يترتب عليه، لا الجزاء ولا الثواب، فمعنى لنعلم ظهورًا ومشاهدة، وليس علم الظهور والمشاهدة كعلم ما سيكون ...

أما تحقق وقوع المعلوم بالنسبة لله، فلا فرق بين ما علم أنه يقع، وما علم أنه وقع، كل سواء، وأما بالنسبة لنا صحيح أننا نعلم ما سيقع في خبر الصادق، لكن ليس علمنا بذلك كعلمنا به إذا شاهدناه بأعيننا، ولذلك جاء في الحديث الصحيح: (ليس الخبر كالمعاينة)

"جان لینا چاہیے کہ اس عبارت سے دو چیزیں مراد ہوتی ہیں۔

ایک تو علم رؤیت و ظہور و مشاہدہ یعنی (تاکہ ہم جان لیں سے مراد ہوتا ہے کہ) ہم دیکھ لیں۔ یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ عنقریب وقوع پذیر ہونے والی چیز کا علم، اس علم جیسا نہیں ہوتا جو واقع ہو چکی ہو، کیونکہ عنقریب ہونے والی چیز کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو یہ علم ہوتا ہے کہ وہ واقع ہونے والی ہے، لیکن اس کے واقع ہونے کے بعد اس کا علم یہ ہوتا ہے کہ وہ واقع ہو گئی ہے۔

دوسری مراد وہ علم ہوتا ہے جس کے نتیجے میں جزا (و سزا) لاگو ہوتی ہے۔ وہاں (تاکہ ہم جان لیں کی) مراد ہوتی کہ تاکہ ہم ایسا علم (ظہوری) حاصل کر لیں، جس پر جزا (و سزا) لاگو ہوتی ہے۔ درج ذیل فرمانِ باری تعالیٰ اسی کی مثال ہے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنكُمْ وَالصَّابِرِينَ﴾ (محمد: ٣١)

(اور ضرور ہم تم کو آزمائیں گے تاکہ تم میں سے جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو

جان لیں) حالانکہ ہمیں آزمانے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ ہم میں سے کون مطیع وفرمانبردار ہے اور کون عاصی و نافرمان، لیکن اس علم باری تعالیٰ پر جزا و ثواب لاگو نہیں ہوتا۔ چنانچہ معنی یہ ہو گیا کہ ہم علم ظہوری و علم مشاہدہ حاصل کر لیں۔ علم ظہور و مشاہدہ عنقریب واقع ہونے والی چیز کے علم کی طرح نہیں ہوتا، جس کا عنقریب واقع ہونا علم میں آ گیا ہے۔ رہا اس کے واقع ہونے کا یقین اللہ تعالیٰ کی نسبت تو عنقریب ہونے والی اور واقع ہوئی چیز کے علم میں کوئی فرق نہیں۔ اس کے نزدیک سب کا علم برابر ہے، لیکن ہماری نسبت یہ بات درست ہے کہ ہم صادق (اللہ تعالیٰ) کے خبر دینے پر جان تو لیتے ہیں کہ یہ کام ہونے والا ہے، لیکن ہمارا وہ علم اس علم کی طرح نہیں ہوتا، جب ہم اسے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ اسی لیے صحیح حدیث ❶ میں آیا ہے کہ (سنی ہوئی) خبر، مشاہدہ کی ہوئی چیز کی طرح نہیں ہو سکتی۔" ❷

جب صحیح بخاری کو ماننے والے عقیدہ بداء کے انکاری ہیں اور اسے گمراہی سمجھتے ہیں، نیز کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس علم سے مراد "علم ظہوری" ہوتا ہے تو واضح ہے کہ صحیح بخاری اس عقیدے سے پاک ہے۔ یہ محض میرٹھی صاحب کی عقل کا دھوکا ہے کہ انہوں نے تمام مسلمانوں کو اپنے آپ پر قیاس کرنا شروع کر دیا ہے۔

(۳) یہ اعتراض کر کے میرٹھی صاحب نے علم ناسخ و منسوخ کا انکار کیا ہے، کیونکہ ہر ناسخ و منسوخ آیت میں میرٹھی صاحب یہی لکھیں گے کہ۔

❶ مسند الإمام أحمد [illegible] ابن حبان [illegible] والحاكم في المستدرك [illegible] صحيح على شرط الشيخين ووافقه الذهبي

❷ تفسیر القرآن العظیم، تفسیر سورۃ [illegible]

"اس کے مطابق جب اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں مسلمانوں کو .... کا حکم دیا تو معاذ اللہ! اس وقت اُسے معلوم نہ تھا کہ .... پھر جب اللہ نے جان لیا کہ .... تب .... کا حکم دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ غلط عقیدہ یہود و روافض کا ہے، جسے اصطلاح میں عقیدۂ بداء کہتے ہیں۔ اہل اسلام اس عقیدے سے بیزار ہیں۔ ہمارا رب علیم ایسی ذات نہیں، جو بے جانے بوجھے کوئی حکم صادر فرمائے، پھر پچھتائے۔ دنیوی حکمران پر بھی عقلاً لازم ہے کہ کسی حکم کو صادر کرنے سے پہلے حالات کا اچھی طرح جائزہ لے لے۔"

لیکن ان کی کرامت کی طرح رنگ بدلنا دیکھیں کہ خود انہوں نے نسخ کا اقرار کیا ہے اور لکھا ہے کہ نسخ احکام میں ہی چلتا ہے لیکن دوسری طرف تو محدثین کرام نے ملاحظہ فرمایا ہے کہ انہوں نے سرے سے ہی نسخ کا انکار کر دیا ہے۔

اب میرٹھی صاحب کی عادت کا اندازہ ان کے معتقدین ہی کر لیں کہ اس علم کا انکار تو منکرین اسلام نے اسلام کے خلاف یہی اعتراض کرتے ہوئے لیا ہے، مگر میرٹھی صاحب اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود چودہ سو سال سے مسلمانوں کے اس متفقہ فیصلے کو لات مارتے ہوئے اس کا انکار کرنے پر اتر آئے ہیں۔

ان سے پہلے کسی معتبر مسلمان نے علم ناسخ و منسوخ پر یہ اعتراض نہیں کیا، بلکہ تابعین کرام کے دور سے لے کر مسلمان اس علم پر مستقل کتابیں تصنیف کرتے چلے آرہے ہیں۔ کچھ کتابوں کے نام یہاں ذکر کیے جاتے ہیں:

① الناسخ والمنسوخ للإمام قتادة بن دعامة السدوسي (۶۰-۱۱۵ھ)

② الناسخ والمنسوخ للإمام القاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ)

③ الناسخ والمنسوخ لابن النحاس النحوي (م ۳۳۸ھ)

- الناسخ والمنسوخ في القرآن لابن السلامة المقري (م ۴۱۰ھ)
- الناسخ والمنسوخ لابن حزم الأندلسي (م ۴۵۶ھ)
- المصفى من علم الناسخ والمنسوخ لابن الجوزي (م ۵۹۷ھ)

یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے، ورنہ اس موضوع پر سلف و خلف نے بہت سی کتب تصنیف کی ہیں۔

کیا ان سب کے بارے میں میرٹھی صاحب کا یہی خیال ہے کہ وہ سب عقیدۂ بداء کے حامل تھے۔ پھر ان علمائے کرام نے بھی یہ باتیں خود نہیں کہیں، بلکہ انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے بیان کی ہیں، لیکن میرٹھی صاحب کے فتویٰ کے مطابق اس سے عقیدۂ بداء ظاہر ہوتا ہے۔ نعوذ باللہ من هذه الهفوات!

اب قارئین کرام خود ہی میرٹھی صاحب کی طرف سے اس مسئلہ کے متعلق صحیح بخاری پر اعتراضات کی علمی وقعت کا اندازہ کر لیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بارھواں باب

قحط کے موقع پر سیدنا عمر کے سیدنا عباس کے وسیلہ سے بارش کی دعا مانگنے کی حدیث

صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب قحط سالی ہوتی، یعنی بارش کی ضرورت کے وقت بارش نہ ہوتی تو آپ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا سیدنا عباس رضی اللہ عنہ سے بارش کی دعا کرواتے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عن انس بن مالک: أنّ عمر بن الخطاب رضي الله عنه كان إذا قحطوا استسقى بالعبّاس بن عبد المطّلب رضي الله عنه، فقال: اللّهمّ إنّا كنّا نتوسّل إليك بنبيّنا، فتسقينا، وإنّا نتوسّل إليك بعمّ نبيّنا، فاسقنا، قال: فيسقون

"سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب لوگوں پر قحط سالی آتی تو سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، سیدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے ساتھ بارش طلبی کی دعا کرتے اور یوں عرض کرتے: اے اللہ! پہلے ہم تیرے نبی (کی دعا) کے ساتھ تیری طرف وسیلہ پکڑتے تھے اور تو ہمیں بارش عنایت فرماتا تھا اور اب ہم تیری طرف تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا (کی دعا) کو وسیلہ پکڑتے ہیں، لہٰذا تو ہمیں بارش عطا فرما۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ان کو بارش عطا کی جاتی تھی۔" ❶

❶ صحیح بخاری: ۱۰۱۰، ۳۷۱۰

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک سے لے کر آج تک کسی مسلمان نے اس کا انکار کرنے کی جرأت نہیں کی، بلکہ مسلمان بعد میں بھی اس پر عمل کرتے ہوئے اپنے اپنے دور میں نیک لوگوں سے دعا کرواتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے بارش طلب کرتے تھے، جیسا کہ ہم بیان کریں گے۔

لیکن میرٹھی صاحب نے امت مسلمہ کے اتفاق کو چھوڑتے ہوئے اور محض اپنے آپ کو ہی عقل کل سمجھتے ہوئے اس حدیث کا انکار کر دیا ہے۔ آیئے دیکھیں کہ میرٹھی صاحب کے پاس اس حدیث کے انکار کے لیے کیا دلائل ہیں اور ان دلائل کی علمی حیثیت و وقعت کیا ہے؟

فصل اول: فنی اعتراضات کا جائزہ

امام بخاری کے تفرد اور اس حدیث میں "ارسال" کا دعویٰ!

"یہ حدیث امام بخاری کے افراد میں سے ہے، نہ مسلم نے، نہ ابو داود، نسائی و ترمذی و ابن ماجہ نے اس کی تخریج نہیں کی۔ ہاں سنن بیہقی میں مذکور ہے کہ ابوسعید ابن الاعرابی نے بھی بخاری کے شیخ حسن بن محمد بن صباح زعفرانی سے اس کی روایت کی ہے، مگر اسناد میں حضرت انس کا ذکر نہیں ہے اور یہ بتایا کہ ثمامہ نے بیان کیا کہ حضرت عمر کا یہ عمل تھا۔۔۔

پس بخاری کی روایت میں یہ حدیث متصل ہے اور ابوسعید کی روایت میں مرسل ہے۔ یوں سمجھئے کہ جب حسن بن محمد نے بخاری کو یہ حدیث سنائی تھی تو یہ بتایا تھا کہ یہ حدیث حضرت انس کی بیان کردہ ہے اور جب ابوسعید ابن الاعرابی کو سنائی تھی تو یہ بتایا تھا کہ ثمامہ نے حضرت عمر کا زمانہ نہیں پایا۔ پس اس حدیث کا متصل اور حضرت انس کی بیان فرمودہ احادیث میں سے ہونا محل نظر ہے۔" [1]

---

[1] صحیح بخاری کا مطالعہ: ۱/۱۲۱

① [illegible] کی حدیث کو صحاحِ ستہ کے مصنفین میں سے صرف امام بخاری رحمہ اللہ کا روایت کرنا کوئی عیب والی بات نہیں ہے۔

پھر یہ حدیث امام بخاری رحمہ اللہ کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی اپنی کتب میں بیان کی ہے،

مثلاً امام بخاری رحمہ اللہ کے ہم عصر ثقہ امام یعقوب بن سفیان الفسوی رحمہ اللہ (م ۲۷۷ھ) نے بھی اپنی کتاب میں ذکر کی ہے۔ ❶

ایک اور سند سے امام احمد بن عمرو الشیبانی رحمہ اللہ (۲۰۶ھ - ۲۸۷ھ) نے بھی بیان کی ہے۔ ❷

نیز امام بخاری کے بعد الگ سند سے امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ (۲۲۳ھ - ۳۱۱ھ) نے بھی یہ حدیث اپنی کتاب میں بیان کی ہے۔ ❸

اور ایک علیحدہ سند سے امام ابن حبان رحمہ اللہ (م ۳۵۴ھ) نے بھی یہی حدیث ذکر کی ہے۔ ❹

ایک اور سند سے امام طبرانی رحمہ اللہ (۲۶۰ھ - ۳۶۰ھ) نے بھی یہی حدیث اپنی کتابوں میں نقل کی ہے۔ ❺

معلوم ہوا کہ صرف امام بخاری رحمہ اللہ ہی نے بیان نہیں کی، بلکہ اور سندوں سے دیگر محدثین نے بھی بیان کی ہے۔

---

❶ المعرفة والتاريخ للفسوي: ۲۶۲/۱ وسنده صحيح

❷ الآحاد والمثاني لابن أبي عاصم الشيباني: ۲۷۰/۱ ح [illegible] وسنده صحيح

❸ صحيح ابن خزيمة: [illegible] وسنده صحيح

❹ صحيح ابن حبان: [illegible] وسنده صحيح

❺ المعجم الكبير للطبراني: ۲۲۲/۱ ح [illegible] والمعجم الأوسط له: [illegible] ح [illegible] وسنده صحيح

② قارئین کرام سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میرٹھی صاحب کے اس اعتراض کا حاصل کیا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اس کی ایک سند "متصل" اور دوسری "مرسل" ہے۔ یعنی ایک سند میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ کا نام ہے اور دوسری میں نہیں۔

لیکن یہ بات میرٹھی صاحب کی کم علمی کا منہ بولتا ثبوت ہے، کیونکہ

③ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ کاش کہ میرٹھی صاحب اپنے مطلب کی بات پڑھتے وقت اس کا بھی مطالعہ کر لیتے!

امام بیہقی رحمہ اللہ "مرسل" سند کے بارے میں فرماتے ہیں:

رواه البخاري في الصحيح عن الحسن بن محمد الزعفراني، وقال: عن أنس بن مالك من غير شك، وكأن ذكر أنس سقط من كتاب شيخنا أبي محمد رحمه الله.

"اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں حسن بن محمد زعفرانی سے روایت کیا ہے اور بغیر شک کے انس رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے۔ گویا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کا ذکر ہمارے شیخ ابو محمد رحمہ اللہ کی کتاب سے گر گیا ہے۔" ❶

یعنی میرٹھی صاحب کا حسن بن محمد زعفرانی کے بارے میں "مرسل" بیان کرنے کا الزام بالکل غلط ہے، کیونکہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کا ذکر رہ جانا امام بیہقی رحمہ اللہ کے شیخ ابو محمد سے ہوا ہے نہ کہ حسن بن محمد زعفرانی سے۔

④ پھر اس حدیث کی کئی اور سندیں ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اگر حقائق سے آنکھیں بند کر کے حسن بن محمد زعفرانی کا قصور بالفرض تسلیم کر بھی لیں تو باقی راویوں کی روایت کو دیکھ کر فیصلہ

---

❶ السنن الكبرى للبيهقي: 3/352

کیا جا سکتا ہے کہ حقیقت کیا ہے، "مرسل" یا "متصل"، چنانچہ اس کا مختصر تذکرہ درج ذیل ہے۔

محمد بن عبداللہ الانصاری سے یہ حدیث درج ذیل ثقہ راویوں نے بیان کی ہے۔ ان سب کا بیان با حوالہ گزر چکا ہے۔

①	صحیح بخاری میں	حسن بن محمد زعفرانی
②	صحیح ابن خزیمہ میں	محمد بن یحییٰ ذہلی
③	الآحاد والمثانی اور صحیح ابن حبان میں	ابو موسیٰ محمد بن المثنیٰ
④	المعجم طبرانی کی کبیر اور اوسط میں	ابو مسلم الکشی
⑤	الآحاد والمثانی میں	ابو الربیع
⑥	المعرفۃ والتاریخ میں	یعقوب بن سفیان الفسوی

اللہ نہ کرے! اب اگر حسن بن محمد زعفرانی کو نا کردہ غلطی کا ملزم ٹھہرا بھی دیا جائے تو باقی پانچ ثقہ راوی "متصل" بیان کرتے ہوئے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا واسطہ ذکر کر رہے ہیں، لہٰذا ان کے قول سے وہ شبہ ختم ہو جائے گا اور متعین ہو جائے گا کہ حسن بن محمد زعفرانی نے جو سند امام بخاری رحمہ اللہ کو بتائی تھی وہی صحیح اور راجح ہے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس طرف بھی اشارہ فرمایا تھا وہ لکھتے ہیں:

وقد رواه يعقوب بن سفيان وغيره عن الأنصاري موصولا.

"اس حدیث کو امام یعقوب بن سفیان (فسوی رحمہ اللہ) اور دیگر محدثین نے محمد بن عبداللہ انصاری سے موصول (سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے واسطے کے ساتھ) بیان کیا ہے۔" ❶

لیکن برا ہو حدیث کے خلاف اس تعصب کا کہ اس نے آنکھوں پر پٹی چڑھا دی ہے یا پھر

❶ السنن الکبریٰ للبیہقی: ۳/۳۵۲

جانتے بوجھتے ایسی باتوں پر مجبور کر دیا ہے۔

④ پھر اگر حسن بن محمد زعفرانی کے علاوہ کوئی اور راوی محمد بن عبداللہ انصاری سے اس حدیث کو بیان نہ کرتا اور حسن بن محمد سے بیان کرتے وقت امام بخاری رحمہ اللہ اس حدیث کو "متصل" اور ابوسعید ابن الاعرابی رحمہ اللہ اسے "مرسل" بیان کرتے تو بھی صحیح بخاری کی اس حدیث میں کوئی خرابی لازم نہ آتی، کیونکہ خطیب بغدادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

قال الجمهور من الفقهاء واصحاب الحديث : زيادة الثقة مقبولة إذا انفرد بها ...

"فقہائے کرام اور محدثین میں سے اکثر و جمہور کا کہنا ہے کہ ثقہ راوی جب کسی زیادت کے ساتھ منفرد ہو تو وہ زیادت مقبول ہوگی ..." ❶

صحیح قول کے مطابق "مرسل" کے مقابلے میں "موصول" بیان کرنا بھی ایک زیادت ہے، یعنی اگر ابوسعید ابن الاعرابی اس حدیث کو حسن بن محمد زعفرانی سے سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے واسطے کے بغیر اور امام بخاری رحمہ اللہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے واسطے کے ساتھ بیان کرتے تو ثقہ کی زیادت کی قبولیت کے قاعدہ و قانون سے امام بخاری رحمہ اللہ کی یہ زیادت مقبول ہی ہوتی تھی۔

ان سب دلائل و شواہد کی موجودگی میں بھی برقی صاحب کا صحیح بخاری پر یہ اعتراض خود ان کی علمیت و قابلیت کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔

یہ حدیث "غریب" ہے!

"اور اس کے غریب ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں۔ حسن بن محمد زعفرانی ہی اس کا راوی ہے۔ حسن بن محمد کی وفات امام بخاری کے بعد ۲۵۹ ہجری میں ہوئی ہے اور محمد بن

---

❶ الكفاية في علم الرواية للخطيب : ص ٤٢٤

عبداللہ بن مثنیٰ کا انتقال ۲۱۵ ہجری میں ہوا ہے۔ وہ خلیفہ ہارون الرشید رحمۃ اللہ کی طرف سے بصرہ کے قاضی رہے ہیں۔ محمد بن عبداللہ کے علاوہ اور کسی بھی شخص نے عبداللہ بن مثنیٰ سے یہ حدیث روایت نہیں کی۔ خلفائے بنی امیہ کے عہد میں اس حدیث کا کسی کو علم نہ ہوا۔ عباسی دور میں ہی منظر عام پر آئی تھی تو کیا یہ کوئی راز کی بات تھی، جس کے اظہار کے لیے راویان حدیث عباسی سلطنت کے عہد کے منتظر تھے اور خلفائے بنی امیہ کے عہد میں اسے فاش کرنے میں کوئی خطرہ محسوس کرتے تھے!؟" ❶

ازالہ: ① میرٹھی صاحب کا یہ کہنا کہ "حسن بن محمد زعفرانی ہی اس کا راوی ہے" علم حدیث سے ناواقفیت ہے، کیونکہ ہم پیچھے ثابت کر چکے ہیں کہ حسن بن محمد زعفرانی کے علاوہ پانچ اور راویوں نے بھی اس حدیث کو محمد بن عبداللہ بن مثنیٰ الانصاری سے بیان کیا ہے۔ یہ ہے میرٹھی صاحب کی علمی قابلیت، اور وہ اعتراضات کرتے ہیں امت مسلمہ کے اتفاقی فیصلے صحیح بخاری پر!

② کسی حدیث کا "غریب" ہونا، یعنی ایک یا کئی طبقات میں اسے ایک ہی راوی کا روایت کرنا کوئی عیب نہیں ہے، بلکہ ہم بارہا یہ بیان کر چکے ہیں کہ کسی روایت کے "غریب" ہونے سے اس کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اگر کسی روایت کے "غریب" ہونے سے اس میں کوئی نقص لازم آتا ہے تو میرٹھی صاحب کا کوئی معتقد ہمت کر کے اس کی وضاحت کرے۔

③ حدیث: ((إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ))

بھی "غریب" ہے، کیونکہ اسے بیان کرنے میں سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ منفرد ہیں، ان

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" (۱/۱۱۷۔۱۱۸)

کے علاوہ کسی اور صحابی نے یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے بیان نہیں کی۔ پھر سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کو صرف علقمہ بن وقاص رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ پھر ان سے صرف محمد بن ابراہیم تیمی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے اور ان سے اس حدیث کو صرف یحییٰ بن سعید الانصاری رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ کیا ان کے بارے میں بھی یہ رُکی صاحب کا یہی تبصرہ ہوگا؟

دراصل یہ ایک چور دروازہ ہے، جسے کھول کر وہ حدیث کا انکار کرنا چاہتے ہیں۔

مسئلہ توسل!

"چیزے نہ قرآن کریم کی کسی آیت میں یہ مذکور ہے، نہ کسی صحیح حدیث میں کہ نبی اکرم ﷺ کے وسیلے سے کسی غرض کے لیے حق تعالیٰ سے دعا کرنا آپ کی زندگی میں تو جائز ہے اور آپ کی وفات کے بعد جائز نہیں ہے۔

اگر اہل ایمان حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں آپ کے توسل کے ساتھ دعائیں کیا کرتے تھے تو آپ کی وفات کے بعد آپ کے توسل کے ساتھ دعا کرنے سے کیا مانع تھا؟ آپ کا توسل چھوڑ کر حضرت عمر کو حضرت عباس کا توسل اختیار کرنے کی کیا حاجت تھی؟۔

بعض اہل علم نے یوں بات بنائی ہے کہ حضرت عمر کے قول "کنا نتوسل الیک بنبینا" کا مطلب یہ ہے کہ جب عہد نبوی میں ہمیں ایسی حاجت پیش آتی تھی تو ہم نبی ﷺ سے درخواست کرتے تھے کہ ہمارے لیے بارش کی دعا فرمائیں۔ اور "وانا نتوسل الیک بعم نبینا، فاسقنا" کا مطلب یہ ہے کہ اب نبی کریم ﷺ تو ہمارے درمیان میں نہیں رہے۔ آپ کے چچا ہیں تو ہم آپ کے چچا سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے لیے بارش کی دعا فرمائیں لیکن آگے "فاسقنا" اس تاویل کے خلاف ہے۔

یوں بھی عربی زبان میں توسل بمعنی طلبِ دُعا نہیں آتا۔ کلامِ عرب سے اس معنی کی تائید نہیں ملے گی۔"❶

جواب: ① آپ ﷺ کے توسل سے دُعا کرنے کا معنی ہی یہ ہے کہ آپ ﷺ سے دُعا کروائی جاتی تھی، پھر اللہ تعالیٰ کو اس دُعا کا حوالہ دیا جاتا کہ اے اللہ! تیرا نبی ہمارے حق میں تجھ سے دُعا فرما رہا ہے، لہٰذا اپنے نبی کی دُعا ہمارے بارے میں قبول فرما کر ہماری حاجت روائی فرما دے!

رہا میرٹھی صاحب کا یہ کہنا کہ بعض اہلِ علم نے یوں بات بنائی ہے تو ہم ان کے معتقدین سے سوال کرتے ہیں کہ وہ ان "بعض اہلِ علم" کے علاوہ باقی "جمہور اہلِ علم" کا یہ قول دکھا دیں کہ وہ اس سے ذات کا توسل ثابت کرتے ہوں، ورنہ صرف فتح الباری ہی پڑھنے سے وضاحت ہو جاتی ہے کہ علمائے کرام و محدثین اس سے دُعا ہی سمجھتے آئے ہیں، جیسا کہ ہم ابھی ذکر کرنے والے ہیں۔

کسی ایک ثقہ محدث یا معتبر عالم سے یہ بات ثابت نہیں کہ وہ اس حدیث سے نبی اکرم ﷺ اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی ذات کا وسیلہ ثابت کرتا ہو۔

② فاسقنا کے لفظ کو میرٹھی صاحب نے اس تاویل کے خلاف نہ جانے کیوں قرار دیا ہے؟ ورنہ بات سیدھی سی ہے کہ اس حدیث کا معنی کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی لفظ تو محذوف ماننا ہی پڑے گا۔ دو ہی تو صورتیں ہیں:

١. وانّا نتوسّل إليك بـ جاه عمّ نبيّنا ...

(اے اللہ! ہم تیری طرف اپنے نبی کے چچا کی ذات کا وسیلہ پکڑتے ہیں) یا پھر

٢. وانّا نتوسّل إليك بـ دعاء عمّ نبيّنا ...

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ١/١٨٠.

(اے اللہ! ہم تیری طرف اپنے نبی کے چچا کی دعا کا وسیلہ پکڑتے ہیں)

اب ان دونوں میں سے جس صورت کی تائید سلف صالحین سے ہوتی ہے، وہی متعین ہوگی۔ آیئے صحابہ و تابعین کے دور میں چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ ایسے موقع پر نیک لوگوں کا وسیلہ کیسے پکڑتے تھے، چنانچہ:

صحابیٔ رسول سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں بارش کے لیے ایک بہت ہی نیک صحابیٔ رسول سیدنا یزید بن الاسود رضی اللہ عنہ کا وسیلہ پکڑا تھا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

إنّ النّاس قحطوا بدمشق، فخرج معاوية يستسقي بيزيد بن الأسود...

"دمشق میں لوگ قحط زدہ ہو گئے تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ یزید بن الاسود رضی اللہ عنہ کے وسیلے سے بارش طلب کرنے کے لیے نکلے۔۔۔" [1]

اب میر محمدی صاحب اور ان کی سوچ و فکر رکھنے والے لوگ غور کریں کہ یہ بالکل وہی الفاظ ہیں، جو صحیح بخاری کی حدیث میں ہیں کہ اس میں استسقى بالعبّاس بن عبد المطّلب کے لفظ ہیں اور اس میں يستسقي بيزيد بن الأسود کے الفاظ ہیں۔

لیکن دیکھیں کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو سیدنا یزید بن الاسود رضی اللہ عنہ کا واسطہ دیا تھا، اس سے کیا مراد تھی۔ آیئے دوسری روایت میں اس کی وضاحت ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

إنّ السّماء قحطت، فخرج معاوية بن أبي سفيان وأهل دمشق يستسقون، فلمّا قعد معاوية على المنبر، قال: أين يزيد بن الأسود الجرشيّ؟ فناداه النّاس، فأقبل يتخطّى النّاس، فأمره معاوية، فصعد

[1] تاريخ أبي زرعة الدمشقي، المنتخب من تاريخ، تاريخ دمشق: 65/111، 112، وسنده صحيح

المنبر، فقعد عند رجليه، فقال معاوية: اللّٰهمّ إنّا نستشفع إليك اليوم بخيرنا وأفضلنا، اللّٰهمّ إنّا نستشفع إليك اليوم بيزيد بن الأسود الجرشي، يا يزيد! ارفع يديك إلى الله، فرفع يزيد يديه ورفع النّاس أيديهم، فما كان أوشك أن ثارت سحابة في الغرب، كأنّها ترس، وهبّت لها ريح، فسُقينا، حتّى كاد النّاس أن لا يبلغوا منازلهم.

"قحط سالی ہوگئی تو سیدنا معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ اور دمشق کے لوگ بارش طلب کرنے کے لیے نکلے، جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ منبر پر بیٹھ گئے تو فرمایا: یزید بن الاسود الجرشی کہاں ہیں؟ لوگوں نے ان کو آواز دی، وہ لوگوں کو پھلانگتے ہوئے آئے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو حکم دیا، وہ منبر پر چڑھ گئے اور آپ رضی اللہ عنہ کے قدموں کے پاس بیٹھ گئے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے دعا کی: اے اللہ! ہم تیری طرف اپنے میں سے سب سے بہتر اور افضل شخص کی سفارش لے کر آئے ہیں، اے اللہ! ہم تیری طرف یزید بن الاسود الجرشی کی سفارش لے کر آئے ہیں، (پھر فرمایا) اے یزید! اللہ تعالیٰ کی طرف ہاتھ اٹھائیے (اور دعا فرمائیے)، یزید رضی اللہ عنہ نے ہاتھ اٹھائے، لوگوں نے بھی ہاتھ اٹھائے۔ جلد ہی افق کی مغربی جانب میں ایک ڈھال نما بادل کا ٹکڑا نمودار ہوا اور ہوا چلی، بارش شروع ہوگئی حتی کہ قریب تھا کہ لوگ اپنے گھروں تک بھی نہ پہنچ پاتے۔" ❶

٭ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس اثر کی سند کو "صحیح" قرار دیا ہے۔ ❷

---

❶ المعرفة والتاريخ ليعقوب بن سفيان الفسوي: ۲/ ۳۸۱، تاريخ دمشق: ۶۵/ ۱۱۲، وسنده صحيح

❷ الإصابة لابن حجر العسقلاني: ۶/ ۶۹۷

نیز ان کے بعد ضحاک بن قیس نے بھی اسی صحابیٔ رسول کی دُعا کا وسیلہ پکڑا تھا، اس روایت کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

انّ الضحاک بن قیس خرج یستسقی، فقال لیزید بن الأسود: قم یا بکاء!

"ضحاک بن قیس بارش طلب کرنے کے لیے (کھلے میدان میں) نکلے تو یزید بن اسود رضی اللہ عنہ سے عرض کی، اے بہت (اللہ کے سامنے) زیادہ رونے والے! کھڑے ہو جایئے (اور بارش کے لیے دُعا کروایئے)۔" [1]

قارئین کرام ہی بتائیں کہ کیا صحابیٔ رسول سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور تابعی ضحاک بن قیس رحمہ اللہ کو اس وسیلے کے مفہوم کا زیادہ علم تھا یا اس دور کے کسی شخص کو؟ پھر کسی ایک بھی صحابی یا تابعی یا ثقہ محدث سے ذات کے وسیلے کا جواز ثابت بھی نہیں ہے۔

کیا اب بھی کوئی عقل مند شخص اس وسیلے سے مراد ذات کا وسیلہ لے گا؟

(۳) اتنی بات تو ہر ذی شعور کی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اگر صحابہ کرام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کا وسیلہ دیتے تھے تو وہ آپ کی وفات کے بعد بھی دیا جا سکتا تھا، پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کیوں سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی ذات کا وسیلہ پکڑنے پر مجبور ہوئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے مقابلے میں سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی ذات بھلا کیا حیثیت رکھتی ہے؟ وہ نبی اور یہ امتی! نبی کی ذات کو چھوڑ کر امتی کی ذات کا وسیلہ دینا تو نبی کی توہین اور گستاخی ہے، اس لیے ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی ذات کا وسیلہ دیا ہوگا۔

---

[1] المعرفۃ والتاریخ: ۲/ ۲۲۰، تاریخ ابی زرعۃ الدمشقی، الجامع من التاریخ، تاریخ دمشق: ۶۵/ ۱۱۲، وسندہ صحیح ایضاً

ہاں! اگر یہ سمجھیں تو کوئی خرابی لازم نہیں آتی کہ پہلے صحابہ کرام اللہ تعالیٰ کو رسول اللہ ﷺ کی دُعا کا وسیلہ دیتے تھے، پھر جب رسول اللہ ﷺ ان کے درمیان نہ رہے اور ان سے وہ دُعا نہ کروا سکتے تھے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں سیدنا عباس رضی اللہ عنہما ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے سب سے قریب تھے، پھر وہ نبی اکرم ﷺ کے چچا ہونے کے ناطے بھی ان کو سب سے محبوب تھے۔ لہٰذا انہوں نے اُن سے دُعا کروائی اور اللہ تعالیٰ کو اس کا حوالہ دیا۔

④ رہا میرٹھی صاحب کا یہ کہنا کہ عربی لغت اس معنی کی تائید نہیں کرتی تو ان کے معتقدین سے سوال ہے کہ کیا حدیث رسول ﷺ عربی لغت میں نہیں ہے؟ یقیناً لغت عرب کو صحابہ و تابعین میرٹھی صاحب کے اساتذہ سے بھی بہت بہتر سمجھتے تھے۔ ان سے ہم نے اس کا معنی دُعا کا وسیلہ ثابت کر دیا ہے۔ والحمد للہ!

فصل ثالث: تاریخی اعتراضات کا جائزہ

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں کئی بار قحط "صحیح تاریخ" کی روشنی میں!

"پھر یہ حدیث بتاتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں عامۃ الناس کو کئی بار خشکی و قحط سالی کی آفت پیش آئی تھی، حالانکہ صحیح تاریخ کی رو سے حضرت عمر کے مبارک عہد میں خشک سالی کا حادثہ ایک بار بھی پیش نہیں آیا۔"❶

تجزیہ: ① یہ ہے میرٹھی صاحب کی علمی تحقیق کہ اُدھر صحیح بخاری کی حدیث پر وہ کوئی اصولی اعتراض نہیں کر پائے اور اِدھر انہوں نے اپنی بے سروپا باتوں کو "صحیح تاریخ" کہلوانا ہے۔ نہ معلوم میرٹھی صاحب نے اس "صحیح تاریخ" کو چھپا کر کیوں رکھا

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ": 118/1

ہے، حوالہ کیوں ذکر نہ کر دیا تاکہ امت مسلمہ کے نزدیک اتفاقی طور پر صحیح حدیث کے مقابلے میں ان کی اس "صحیح تاریخ" کی صحت کا بھی اندازہ کر لیا جاتا؟

میرٹھی صاحب کا کوئی خیر خواہ یا ان کا کوئی فیض یافتہ جلد ہمت کر کے اس کا حوالہ دے!

④ میرٹھی صاحب کو یقیناً قحط کا معنی و مفہوم سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اگر وقت پر بارش نہ ہو تو اسے عرب لوگ قحط سے تعبیر کرتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو لغتِ عرب کی معتبر کتب اُٹھا کر دیکھا جا سکتا ہے۔

میرٹھی صاحب نے شاید یہ سمجھا ہے کہ شاید پورا سال بارش نہ ہو اور کھانے پینے کا سب راشن ختم ہو جائے، بہت سے لوگ بھوکے مر جائیں تو پھر ہی قحط کا لفظ بولا جا سکتا ہے، حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس وقت پر بارش نہ ہو تو اسے بھی قحط کہا جاتا ہے۔ ہاں! اگر سال وغیرہ کا کوئی لفظ قحط کے ساتھ استعمال ہو تو پھر خشک سالی کا معنی لیا جائے گا۔

جب بھی بارش بوقتِ ضرورت نہ ہوتی، سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، سیدنا عباس رضی اللہ عنہ سے دُعا کی درخواست کرتے اور پھر خود بھی اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی دُعا کا حوالہ دیتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ بارش نازل کر دیتا۔

خشک سالی کی نوبت پیش تو تب آتی، جب دُعا قبول نہ ہوتی اور پورا سال یوں ہی گزر جاتا۔

⑤ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں قحط ہو سکتا ہے تو پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ مبارک میں بالاولیٰ ہو سکتا ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ:

شكا الناس إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم قحوط المطر ... ثم قال: إنكم شكوتم جدب دياركم واستخار المطر عن إبان زمانه عنكم...

"لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو بارش کے قحط (نہ ہونے) کی شکایت کی۔۔۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم نے اپنے علاقوں کی خشکی اور بارش کے اپنے زمانے سے موخر ہونے کی شکایت کی ہے۔۔۔" ❶

اس حدیث سے بھی قحط کا صحیح معنی سمجھ میں آ رہا ہے کہ بارش کا اپنے وقت سے لیٹ ہونا بھی قحط کہلاتا ہے اور اس کا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں کئی بار پیش آنا کسی طرح بھی محال نہیں ہے۔ بھلا اس قسم کے بے سروپا اعتراضات سے صحیح بخاری کی قدر و قیمت اور صحت میں کیا فرق پڑتا ہے؟

اب تو ہر منصف مزاج شخص کو میرٹھی صاحب سے برائت کا اعلان کر کے حق پرستی کا حق ادا کر دینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صراط مستقیم پر گامزن کرے اور اس پر استقامت دے!

❶ سنن ابی داؤد: ۱۱۷۳، وسندہٗ حسن، وصححہ ابن حبان: ۲۸۶۰، والحاکم علی شرط الشیخین: ۱۲۲۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تیرھواں باب

تیمم سے متعلق حدیث عمار بن یاسر

محترم قارئین! صحیح بخاری میں ایک واقعہ موجود ہے، سیدنا عبدالرحمن بن ابزی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

جاء رجل إلى عمر بن الخطاب، فقال: إني أجنبت، فلم أصب الماء، فقال عمار بن ياسر لعمر بن الخطاب: أما تذكر أنا كنا في سفر أنا وأنت، فأما أنت فلم تصل، وأما أنا فتمعكت، فصليت، فذكرت للنبي صلى الله عليه وسلم، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: ((إنما كان يكفيك هكذا))، فضرب النبي صلى الله عليه وسلم بكفيه الأرض ونفخ فيهما، ثم مسح بهما وجهه وكفيه.

"سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کرنے لگا، میں جنبی ہو گیا ہوں، لیکن مجھے پانی نہیں مل رہا (ایسی صورت میں کیا کروں؟) آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، جب تک پانی نہ ملے تو نماز نہیں پڑھے گا) سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا، کیا آپ کو یاد نہیں کہ میں اور آپ سفر میں تھے (جنبی ہونے پر اور پانی نہ مل سکنے پر) آپ نے تو نماز نہیں پڑھی تھی، لیکن میں (مٹی میں) لوٹ پوٹ ہوا تھا، پھر نماز پڑھ لی تھی۔ پھر میں نے یہ واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، تجھے اس طرح کرنا کافی تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو زمین پر مارا، ان میں پھونکا، پھر ان کو اپنے چہرے اور دونوں

ہتھیلیوں (کی باہر والی جانب) پر پھیر لیا۔" ❶

خود میرٹھی صاحب کو اعتراف ہے کہ اس حدیث کو بیان کرنے میں امام بخاری رحمہ اللہ اکیلے نہیں ہیں، بلکہ صحاح ستہ کی دیگر کتب میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ ان کے علاوہ دیگر محدثین نے بھی اپنی اپنی کتب میں اس حدیث کو جگہ دی ہے اور اس سے کئی مسائل استنباط کیے ہیں۔

لیکن شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب نے اپنی عادت کے مطابق اس حدیث کا بھی بغیر کسی معقول وجہ کے انکار کر دیا ہے۔ وہ سب محدثین کو "بے عقل" کہتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لیکن میرے نزدیک شروع سے آخر تک یہ افسانہ محض بے اصل افسانہ ہی ہے۔ کاش محدثین نے اسے نقل کرنے اور کتبِ حدیث میں درج فرمانے میں کچھ عقل سے کام لیا ہوتا۔۔۔" ❷

اپنے علاوہ سب کو بے عقل کوئی عقل مند نہیں کہہ سکتا، خصوصاً اپنے اسلاف کے بارے میں ایسے الفاظ کا استعمال کسی عام بے وقوف سے بھی ممکن نہیں۔ آیئے سب محدثین کو عقل سے کام لینے کا مشورہ دینے والے میرٹھی صاحب کی اپنی عقلی حیثیت کا بھی اندازہ کریں۔

فصلِ اوّل: فنی اعتراضات کا جائزہ

سعید بن عبدالرحمٰن کا "عنعنہ"!

"ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ اس حدیث کی روایات میں سے کسی بھی روایت کی اسناد میں یہ مذکور نہیں ہے کہ سعید بن عبدالرحمٰن نے بتایا ہو کہ میں نے یہ حدیث اپنے باپ سے سنی یا

---

❶ صحیح بخاری: ۳۳۸، صحیح مسلم: ۱۱۲

❷ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۳۱

مجھے میرے باپ نے یہ حدیث بتائی یعنی اس نے حدثنی ابی یا انبانی ابی نہیں کہا۔ ان لفظوں میں کوئی لفظ کہا ہوتا تو پتا چلتا کہ سعید کو یہ حدیث براہ راست وبلا واسطہ اپنے باپ سے معلوم ہوئی تھی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہر روایت کی اسناد میں عنعنہ ہے یعنی لفظ عن کے ساتھ سعید بن عبد الرحمن عن ابیہ ہے۔ پس ہوسکتا ہے کہ سعید نے یہ قصہ کسی شخص سے سنا ہو اور اس نے بتایا ہو کہ مجھے یہ قصہ تمہارے والد عبدالرحمن بن ابزیٰ سے معلوم ہوا تھا۔ سعید نے اس شخص پر اعتماد کرکے اس کا نام لیے اور ذکر کیے بغیر اس کی روایت کردی ہو۔۔۔" ❶

① سمعت یا اخبرنی یا انبانی کے الفاظ کی شرط صرف "مدلس" راویوں کے لیے لگائی جاتی ہے کہ جب تک وہ ان الفاظ کے ساتھ حدیث بیان نہ کریں، ان کی حدیث قبول نہیں ہوتی، جبکہ سعید بن عبدالرحمن قطعاً "مدلس" نہیں ہیں۔

غیر مدلس راویوں کا عنعنہ مضر نہیں ہوتا

حافظ عراقی رحمہ اللہ نظم کی صورت میں اصولِ حدیث ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وصححوا وصل معنعن سلم   من دلسة راويه ، واللقا علم
وبعضهم حكى بذا إجماعا   ومسلم لم يشترط اجتماعا

"محدثین نے ایسی عنعنہ والی سند کے متصل ہونے کو صحیح قرار دیا ہے، جو اپنے راویوں کی تدلیس سے سلامت ہو اور راویوں کی آپس میں ملاقات معلوم ہو۔ بعض محدثین کرام نے تو اس پر اجماع واتفاق نقل کیا ہے اور امام مسلم رحمہ اللہ نے ملاقات کے ثبوت کی شرط نہیں

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۴۴۔۱۴۵

لگائی (بلکہ ان کے نزدیک معاصرت یعنی امکانِ لقاء کافی ہے)۔" [1]

دیکھیں قارئین کہ محدثین جس بات کو اتفاقی طور پر صحت کی شرط نہیں بتاتے، میرٹھی صاحب اس کو شرط قرار دینے کے در پے ہیں کہ غیر مدلس راوی بھی عن سے روایت کرے تو قبول نہیں ہوگی، حالانکہ یہ نہایت ہی آوارہ بات ہے۔ اس طرح تو پورے ذخیرۂ حدیث میں سے چند احادیث بچیں گی، باقی سب ناقابلِ قبول ہو جائیں گی اور یہی خواہش ہے ان لوگوں کی کہ کسی طرح ان احادیث سے ان کی جان چھوٹے اور وہ اپنی من مانی کے لیے آزاد ہوں۔

میرٹھی صاحب کو چاہیے تو یہ کہ پہلے اصولِ حدیث پر دسترس حاصل کرتے، پھر صحیح بخاری پر اعتراضات کرنے کا سوچتے!

(۲) قارئین کرام یہ بھی ذہن نشین رکھیں کہ یہاں تو میرٹھی صاحب نے اس حدیث کے گھڑنے کا الزام کسی نامعلوم شخص کو دیا ہے، لیکن "عقل سے کام" لیتے ہوئے اسی حدیث پر اعتراضات کے ضمن میں اسے سعید بن عبدالرحمن بن ابزی کی "فضول گوئی" قرار دیا ہے۔ [2]

یہ ہے محدثین پر عقل سے کام نہ لینے کا الزام دینے والے میرٹھی صاحب کا اپنا عقلی تخبط!

فصلِ ثانی: عقلی اعتراضات کا جائزہ

کیا قرآنِ کریم میں جنبی کے لیے تیمم کا صریح حکم موجود ہے؟

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ حافظِ قرآن تھے۔ حضور اکرم ﷺ کی زندگی ہی میں حفظِ قرآنِ مجید کی دولت سے مالا مال ہو چکے تھے۔ قرآن مجید میں دو جگہ ارشاد ہوا ہے: ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ

[1] المنية المرعى: فصل الصحة، رقم الشعر: ۱۳۶-۱۳۷

[2] "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/۲۳۳

فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ ﴾ یہ ارشاد سورۃ النساء میں بھی ہے۔ اس کے بعد سورۃ المائدہ میں بھی۔ سورۃ المائدہ میں اس کے بعد منہ کا اضافہ ہے۔

اس ارشاد میں تصریح ہے کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم وضو کا بھی بدل ہے اور غسل جنابت کا بھی۔ یہ ارشاد جب اولاً نازل ہوا تھا اور حضور اکرم ﷺ نے تمام حاضر صحابہ کرام کو سنایا تھا تبھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسے سنا اور سمجھا اور دل نشین کر لیا تھا۔ پھر صحیح بخاری کتاب التیمم میں ہے کہ ایک سفر میں، جس میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی آپ کے ساتھ تھے، آپ نے حاضرین کو نماز فجر پڑھائی، فارغ ہونے پر ایک صاحب کو الگ تھلگ بیٹھے ہوئے دیکھا۔ فرمایا: ما منعك أن تصلي معنا؟ ہمارے ساتھ نماز پڑھنے سے کس چیز نے روکا؟ عرض کیا، اصابتني جنابة، ولا ماء مجھے احتلام کی وجہ سے غسل کی ضرورت پیش آ گئی اور پانی ہے نہیں کہ غسل کر سکتا۔ فرمایا: عليك بالصعيد، فإنه يكفيك یعنی مٹی سے تیمم کر لو۔ پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمم کافی ہے۔ یہ حدیث عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

پھر جنگ یمامہ کے بعد خلافت صدیقی میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی نگرانی و اہتمام کے تحت پورا قرآن کریم ایک مصحف میں لکھا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہایت توجہ کے ساتھ اس کی ایک ایک آیت سنی اور اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنی مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت کی ہوگی، جس میں بصراحت مذکور ہے کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں وہ شخص بھی تیمم کرے، جسے وضو کی حاجت ہو اور وہ شخص بھی جسے غسل کی حاجت ہو۔۔۔ تو کیا ایسے ظاہر و واضح حکم قطعی سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ غافل ہو سکتے تھے۔ وہ عمر جو الناطق بالحق والصواب تھے، جن کی رائے وحی قرآن کے مطابق ہوا کرتی تھی۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت عمر نے اس شخص کو

جس نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ غسل کی ضرورت ہو اور پانی نہ ملے اور نماز کا وقت آجائے تو کیا کروں، یہ جواب دیا ہو کہ پانی پانے کا انتظار کرو اور غسل کے بغیر نماز نہ پڑھو۔" ❶

① میرٹھی صاحب کے اس اعتراض کا سبب ان کے مطالعہ کی کمی ہے، کیونکہ ان کے بقول قرآن کریم میں صراحتاً پانی نہ ملنے کی صورت میں جنابت سے تیمم کے کافی ہونے کا ذکر ہے، لیکن یہ بات بالکل غلط ہے۔ میرٹھی صاحب کا کوئی معتقد اٹھے اور اپنے صاحب کی عزت بچانے کے لیے قرآن کریم کی وہ آیت ہمیں دکھادے، جس میں صراحتاً یہ ذکر ہو کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں جنابت سے بھی تیمم کافی ہو جاتا ہے!

رہی میرٹھی صاحب کی ذکر کردہ آیت کریمہ، جس سے انہوں نے صراحتاً ثابت کرنے کی کوشش کی ہے تو بڑے ادب سے عرض ہے کہ وہ قطعاً صریح نہیں ہے۔ اگر یہ صریح ہوتی تو اس کی تفسیر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دو مختلف اقوال کیوں ہوتے؟

فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ ﴾ سے جنبی کے لیے تیمم کی اجازت مراد نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

الملامسة ما دون الجماع .

"ملامسہ سے مراد جماع کے علاوہ (شہوت سے چھونا اور بوس و کنار) ہے۔" ❷

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی بھی یہی تفسیر ہے کہ عورت کو بوسہ دینے سے وضو کو لازم قرار دیتے تھے اور فرماتے تھے:

هي من اللماس .

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۲۱-۱۲۲

❷ تفسیر الطبری: ۸/۳۹۳، وسندہٗ صحیح

"یہ (بوسہ) ملامسہ میں سے ہے۔" ❶

اسی طرح تابعین میں سے عامر شعبی، ابراہیم نخعی، عبیدہ، محمد بن سیرین وغیرہم رحمہم اللہ سے بھی باسند صحیح یہی ثابت ہے کہ وہ ملامسہ کو جماع کے علاوہ چھونے پر محمول کرتے تھے۔ ❷

اس تفسیر کے مطابق ملامسہ سے مراد بوس و کنار ہے اور ان صحابہ کرام کے نزدیک اس فرمان باری تعالیٰ کی بنا پر بوس و کنار سے وضو لازم ہے۔ اگر پانی نہ ملے تو اسی طرح تیمم کریں گے جس طرح عام وضو کی جگہ پر کیا جاتا ہے۔

البتہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

اللمس والمس والمباشرة الجماع، ولكن الله يكني بما شاء.

"لمس، مس اور مباشرت سب سے مراد جماع ہے، لیکن اللہ تعالیٰ جس چیز کے ساتھ کنایہ کرنا چاہتا ہے، کرتا ہے۔" ❸

معلوم ہوا کہ اس آیت کی تفسیر میں صحابہ کرام کے اقوال مختلف تھے۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے جماع پر نہیں، بلکہ بوس و کنار وغیرہ پر محمول کیا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک بھی یقیناً ملامسہ سے مراد بوس و کنار تھا، ورنہ قرآن کریم کی مذکورہ آیت کے ہوتے ہوئے وہ قطعاً اس آدمی کو نماز پڑھنے سے منع نہ کرتے۔

حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وقد كان عمر بن الخطاب وعبد الله بن مسعود يقولان: الجنب لا

---

❶ تفسير الطبري: 8/394، وسنده صحيح

❷ ديكهيں: تفسير الطبري: 8/393، 396، [illegible]

❸ تفسير الطبري: 8/389، وسنده صحيح

يطهر: إلا الماء، ولا يستبيح بالتيمم صلاة ... وكانا يذهبان إلى أن الملامسة ما دون الجماع ...

''سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ جنبی کو صرف پانی ہی پاک کر سکتا ہے، تیمم کے ساتھ وہ نماز نہیں پڑھ سکتا ۔۔۔ ان دونوں کا مذہب یہ تھا کہ ملامست سے مراد جماع کے علاوہ (چھونا) ہے ۔۔۔'' [1]

جبکہ صحابہ کرام میں سے صرف سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر جماع سے کی ہے۔ ہمارے علم کے مطابق سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور صحابی سے یہ تفسیر ثابت نہیں ہے۔

پھر یہ بات بھی میرٹھی صاحب اور ان کے معتقدین پر ضرب کاری ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اگرچہ ملامسہ سے مراد جماع لیا ہے، لیکن انہوں نے بھی ملامسہ کو کنایہ قرار دیا ہے، جو کہ صراحت کی ضد ہے۔

کاش کہ میرٹھی صاحب صحیح بخاری پر اعتراضات کرنے سے پہلے کچھ لغت و ادبِ عربی میں مہارت حاصل کر لیتے!

پھر جو علمائے کرام اس بارے میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول (ملامسہ سے مراد جماع ہے) کو راجح قرار دیتے ہیں اور دوسرے صحابہ کے قول (کہ ملامسہ جماع کے علاوہ بوس و کنار وغیرہ کو کہتے ہیں) کو مرجوح کہتے ہیں، جیسے کہ امام طبری رحمہ اللہ بھی اسی نقطۂ نظر کے حامل ہیں، وہ اس ''ضعیف'' حدیث کو دلیل بناتے ہیں:

إن النبي صلى الله عليه وسلم قبل بعض نسائه، ثم خرج إلى الصلاة ،

---

[1] التمهيد لابن عبد البر: ۱۹/ ۲۷۰

(خلاصہ یہ کہ) اس بارے میں نبی اکرم ﷺ سے کوئی چیز ثابت نہیں۔" ❶

ہماری تحقیق کے مطابق اس حدیث پر امام ترمذی رحمہ اللہ کا فیصلہ برحق ہے کہ واقعی اس حدیث کی کوئی "صحیح" یا "حسن" سند موجود نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب!

نیز امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام اوزاعی، امام اسحاق بن راہویہ وغیرہ کا بھی یہی موقف ہے کہ بوسہ دینے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ❷

اس سے بھی سیدنا عبداللہ بن مسعود، سیدنا عبداللہ بن عمر وغیرہما رضی اللہ عنہم کے اس تفسیری موقف کی تائید ہوتی ہے۔

یہ مسئلہ تو اجتہادی ہے، لیکن اس تفصیل سے یہ بات بہرحال ثابت ہو گئی ہے کہ آیتِ قرآنی میں موجود لفظ ﴿لامستم﴾ جماع کے معنی میں صریح نہیں ہے اور برقی صاحب کا اسے جنابت سے تیمم کے بارے میں صریح کہنا خود غلط ہو گیا۔

اور جب یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ قرآن کریم میں صراحتاً کہیں بھی جنابت سے تیمم کرنے کا ذکر نہیں ہے تو برقی صاحب کا یہ اعتراض سرے سے ہی باطل ہو گیا ہے۔

ہماری یہ بات درست ہے کہ یقیناً سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس آیت میں لامستم سے مراد بوس و کنار وغیرہ ہی لیتے تھے، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان کے بیٹے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی تفسیر بھی یہی تھی اور یہی وجہ ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس آیتِ قرآنی کا حوالہ نہیں دیا، بلکہ نماز سے رکنے کا فتویٰ دیا تھا۔

④ صحیح بخاری کی جو حدیث برقی صاحب نے پیش کی ہے کہ سفر میں سیدنا ابوبکر

---

❶ جامع ترمذی، تحت حدیث: ۸۶

❷ جامع ترمذی، تحت حدیث: ۸۶

عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اور پانی نہ ملنے پر آپ ﷺ نے ایک شخص کو جنابت سے تیمم کے قائل ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ اس حدیث میں قطعاً یہ صراحت نہیں ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ رسول اکرم ﷺ کے اس فرمانِ مبارک کو سن رہے تھے۔

جب یہ کسی بھی روایت میں نہیں ہے تو صحیح بخاری پر اعتراض کیسا؟

⑦ میرٹھی صاحب کی انصاف پسندی بھی ملاحظہ فرمائے جائیں کہ اپنی تالیف میں انہوں نے سیدنا عمر کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی رائے وحیِ قرآن کے مطابق ہوا کرتی تھی، لیکن اسی کتاب میں انہوں نے صحیح بخاری میں اس مضمون کی حدیث کو کسی نامعلوم شخص کی گھڑنت قرار دے کر رد کر دیا ہے۔ ❶

کیا انصاف پسندی اسی کا نام ہے؟

یہ تھا میرٹھی صاحب کا صحیح بخاری کی اس صحیح حدیث پر سب سے بڑا اعتراض، جس کا حشر قارئین ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے "صریح" آیتِ کریمہ کیوں نہ پڑھی؟

"کیا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو آیتِ تیمم یاد نہ تھی؟ اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو غلط فتویٰ دے دیا تھا تو عمار حضرت عمر کو آیتِ تیمم یاد دلا دیتے۔ دوسرا طویل قصہ بیان کرنے کی حاجت نہ تھی۔" ❷

ازالہ: ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ آیتِ تیمم جنابت سے تیمم کرنے کے بارے میں صریح نہیں ہے کیونکہ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ملامسہ سے جماع مراد نہیں لیتے، بلکہ

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/ ۱۹۷

❷ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/ ۲۲۲

بوس وکنار سے اس کی تفسیر کرتے ہیں۔ یقیناً سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بھی انہی میں سے تھے، ورنہ وہ ضرور اس آیت کا حوالہ دے دیتے۔

بالفرض اگر یہ گمان کر بھی لیا جائے کہ سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ ملامسہ سے مراد جماع لیتے تھے تو بھی انہوں نے اس لیے آیت تیمم کو پیش نہیں کیا کہ وہ صریح نہیں تھی، جبکہ یہ بالکل صحیح واقعہ اس معاملے میں بالکل صریح تھا۔

لہٰذا اس صورت حال میں میرٹھی صاحب کا یہ "اول جلول" اعتراض ان کی اپنی کم فہمی ہے، صحیح بخاری اور محدثین کرام کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔

کیا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ آپ بیتی بھول سکتے تھے؟

"اس حدیث میں مذکور ہے کہ عمار نے وہ قصہ بیان کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو وہ قصہ یاد نہ آیا اور عمار سے کہا اتق اللہ یا عمار! یقیناً حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے عقلاً اور کمزور یادداشت والے نہ تھے کہ اس قصہ کو بھول جاتے اور یاددلانے پر بھی انہیں وہ یاد نہ آتا۔ حضرت عمر کا اسے یاد نہ کرنا یہی معنی رکھتا ہے کہ وہ قصہ سرے سے پیش ہی نہ آیا تھا اور نہ حضرت عمار کے متعلق یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ان ہوا قصہ بیان کیا ہو اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر دروغ بافی کے مرتکب ہوئے ہوں۔ یہ تو راوی سعد بن عبدالرحمٰن کی فضول گوئی ہے اور بس۔" ❶

میرٹھی صاحب کے نزدیک سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کئی سال پہلے پیش آنے والے واقعہ کو بھول نہیں سکتے تھے، لیکن حقیقت میں یہ میرٹھی صاحب کی عقلی درماندگی کا منہ بولتا ثبوت ہے، ورنہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھول سکتے ہیں اور اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/۱۲۲-۱۲۳

میرٹھی صاحب شاید سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ وہ کسی بات کو بھول نہیں سکتے تھے! کسی معتبر دلیل کے مل جانے پر صحابہ کرام کا بھولنا ثابت ہو جاتا ہے۔

اس طرح کے فضول اعتراض سے صحیح بخاری کی صحت پر تو کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ میرٹھی صاحب کی اپنی "عقلی صحت" ضرور مشکوک ہوگئی ہے۔

② ہم ذکر کر چکے ہیں کہ میرٹھی صاحب کا قلم ان کا ساتھ نہیں دے رہا۔ وہ کبھی اسے کسی نامعلوم شخص کی کارروائی قرار دیتے ہیں اور کبھی سعید بن عبدالرحمٰن کی "فضول گوئی" کہہ دیتے ہیں۔ حالانکہ سعید بن عبدالرحمٰن بن ابزیٰ بالاتفاق "ثقہ وصدوق" راوی ہیں۔ ان کے بارے میں کسی ثقہ محدث نے کوئی ادنیٰ سی بھی جرح نہیں کی۔

لہٰذا یہ محض میرٹھی صاحب کی اپنی "فضول گوئی" ہے کہ ایک بالکل بے گناہ شخص کو ایک بالکل غلط الزام دے رہے ہیں۔

سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کا مٹی میں لوٹ پوٹ ہونا ممکن نہیں!

"اس قصہ سے مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت عمار اس بات سے واقف تھے کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم وضو کا بدل ہے۔ سوال یہ ہے کہ عمار کو اس کا علم کیسے ہوا تھا؟ اس کا جواب یہی ہے کہ جب آیتِ تیمم نازل ہوئی تھی اور حضور اکرم ﷺ نے حاضرین صحابہ کو سنائی تھی تو ان میں عمار بھی تھے۔ حضور ﷺ نے سب کو آیت بھی پڑھ کر سنائی، پھر انہیں عملاً تیمم کر کے بھی دکھایا، اسی کے مطابق سب نے تیمم کیا اور نمازِ فجر ادا کی اور اسی آیت میں صراحتاً مذکور ہے کہ کسی غسلِ جنابت کی ضرورت پیش آگئی اور پانی دستیاب نہ ہو تو وہ بھی تیمم کرے اور یہ کہ تیمم پاک مٹی پر مارے ہوئے ہاتھوں کو چہرے اور ہاتھوں پر پھیرنا ہے۔

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جنابت کے تیمم کے لیے حضرت عمار نے جانور کی طرح مٹی میں لوٹ

لگائی ہو؟" [1]

جواب: واقعی سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اس بات سے واقف تھے کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم وضو کا بدل ہے، کیونکہ قرآن کریم میں مذکور تھا، لیکن ہم بیان کر چکے ہیں کہ قرآن کریم میں یہ مذکور نہیں تھا کہ آدمی جنبی ہو جائے، پھر پانی نہ ملے تو وہ تیمم کر لے، نہ ہی کوئی "میرٹھی" ایسی کوئی آیت ہمیں دکھا سکتا ہے بلکہ آیت تیمم میں لامستم کا معنی سوائے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے باقی صحابہ کرام کے نزدیک جماع تھا کہ اس سے جنابت کی صورت میں بھی تیمم کا اثبات ہوتا۔ ان کے نزدیک اس سے مراد بوس و کنار وغیرہ تھا اور راجح قول بھی یہی ہے، جیسا کہ ہم وضاحت سے ذکر کر چکے ہیں۔

لہٰذا جب قرآن کریم میں جنابت سے تیمم کا ذکر تھا ہی نہیں تو سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کیسے سمجھ سکتے تھے؟ اگر میرٹھی صاحب کے کسی معتقد میں کوئی دم خم ہے تو وہ اسے ہوئے کا رلا کر کوئی ایک ایسی آیت قرآنی دکھائے جس میں "صراحتاً" جنابت سے تیمم کا ذکر ہو!

ہاں! قرآن کریم میں وضو کے عوض میں تیمم کا ذکر تھا، اسی پر قیاس کرتے ہوئے سیدنا عمار رضی اللہ عنہ نے یہ سمجھا کہ جب پانی نہ ملنے کی صورت میں وضو کرنا ہو تو چہرے اور ہاتھوں پر مٹی سے مسح کرتے ہیں، لیکن غسل میں چونکہ سارے جسم پر پانی بہایا جاتا ہے لہٰذا شاید مٹی بھی پورے جسم پر لگانی پڑے، اس لیے انہوں نے مٹی اپنے پورے جسم پر لگانے کے لیے مٹی میں لوٹ لگائی۔

اتنی سی بات میرٹھی صاحب کی سمجھ میں نہیں آسکی اور انہوں نے صحیح بخاری پر اعتراضات شروع کر دیے تھے۔

---

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ" ا/۱۲۳

عمار رضی اللہ عنہ نے یہ قصہ کسی کو کیوں نہیں بتایا؟

"اس میں مذکور ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس قصہ میں عمار کی تصدیق نہیں کی اور اتق اللہ یا عمار! فرمایا تو عمار نے عرض کیا:

إن شئت یا أمیر المؤمنین! لم أحدث بہا أحدا لما جعل اللہ لک علیّ من حق. یعنی آپ چاہیں تو میں یہ قصہ کسی سے بیان نہ کروں گا، کیونکہ آپ کی اطاعت مجھ پر لازم ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، بل نولیک ما تولیت. یعنی میں تمہیں منع نہیں کرتا۔ تم اپنی ذمہ داری پر اسے بیان کر سکتے ہو۔

تو کیا حضرت عمار نے پھر کسی کو یہ قصہ بتایا؟ جواب یہ ہے کہ قطعاً نہیں۔ کسی سے ذکر فرماتے تو وہ اس کی روایت کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمار نے یہ اَن ہوا قصہ کبھی بھی بیان نہیں کیا۔ صرف عبدالرحمٰن بن ابزی کے بیٹے سعید نے ہی یہ قصہ روایت کیا ہے اور بتایا ہے کہ میرے والد عبدالرحمٰن بن ابزی بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس میں تھے، جس میں عمار نے حضرت عمر کو یہ قصہ یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔

اب ظاہر ہے کہ یہ واقعہ ہوا ہوتا تو عمار سے متعدد شخصوں نے اسے سنا ہوتا۔ جب انہوں نے بیان ہی نہیں کیا تو کسی کے سننے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ان واضح وظاہر وجوہ کی بنا پر میں تیمم کے متعلق حضرت عمار کی طرف منسوب اس حدیث اور قصہ کو جو عبدالرحمٰن بن ابزی سے مروی ہے، بے اصل و باطل سمجھتا ہوں۔" [1]

(1) جب سعید بن عبدالرحمٰن بالاتفاق "ثقہ وصدوق" راوی ہیں اور ان پر ادنیٰ سا کلمۂ جرح بھی ثابت نہیں ہے تو سیدنا عمار سے بیان کرنے میں اس کا

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/۱۲۵

منفرد ہونا بالکل مضر نہیں۔

خبر واحد یقیناً حجت ہے

یہ بات ہم گزشتہ صفحات میں دو، دو بار تفصیل یا بالاختصار بیان کر چکے ہیں کہ کسی حدیث کی سند کے کسی طبقہ میں اگر ایک ہی راوی ہو تو اسے اصطلاحاً "غریب" کہتے ہیں اور ثقہ محدثین میں سے کسی نے بھی "غریب" حدیث کو رد نہیں کیا بلکہ اس کو قبول کرنے پر سب کا اتفاق ہے۔

خود رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام سے بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ انہوں نے کئی مرتبہ ایک ہی معتبر شخص کی بیان کردہ بات کا اعتبار کیا ہے۔ اسے اصطلاح میں "خبر واحد" کہتے ہیں۔ اس کی حجیت پر محدثین کرام نے بہت کچھ لکھا ہے اور قرآن و سنت کی نصوص سے اس مسئلہ کو اظہر من الشمس کر دیا ہے۔ اگر میرٹھی صاحب صحیح بخاری ہی مکمل طور پر پڑھ لیتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اس موضوع پر ایک مستقل باب قائم کیا ہے اور قرآن و سنت کے دلائل کے انبار لگا دیے ہیں۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے لہٰذا شائقین صحیح بخاری کے درج ذیل باب کا مطالعہ فرمائیں۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي إِجَازَةِ خَبَرِ الْوَاحِدِ الصَّدُوقِ فِي الْأَذَانِ وَالصَّلَاةِ وَالْفَرَائِضِ وَالْأَحْكَامِ.

"اذان، نماز، فرائض اور احکام میں ایک ہی سچے آدمی کی خبر کے کافی ہونے کے دلائل کا بیان۔"

ان شاء اللہ! تسلی ہو جائے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے یہ مکالمہ کہیں چھپ چھپا کر نہیں ہوا تھا، بلکہ سر عام یہ بات چیت ہوئی اور سب لوگوں کے علم میں یہ بات آ گئی تھی۔ لوگ خود

ہی اس کو ایک دوسرے سے ذکر کرتے تھے۔ یہ واقعہ اتنا زبان زدِ عام تھا کہ سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو خود کسی کو بتانے کی ضرورت نہ پڑی۔

جب صورت حال یہ ہے تو پھر میرٹھی صاحب کے اس اعتراض سے صحیح بخاری کی صحت پر ذرا برابر بھی فرق نہیں پڑے گا۔

مسند احمد میں ناجیہ عنزی کی ضعیف روایت اور صحیح بخاری پر اعتراض!

"اور سنیے! ناجیہ بن خفاف عنزی نے اس قصہ کی روایت خود عمار بن یاسر سے کی ہے، مگر اس نے حضرت عمر کی بجائے حضرت عبداللہ بن مسعود کا نام لیا ہے۔ اس کی تخریج امام احمد نے کی ہے۔۔۔

وہ سعید بن عبدالرحمٰن کی فضول گوئی تھی اور یہ ناجیہ عنزی کی غپ شپ ہے۔ نہ وہ درست ہے، نہ یہ صحیح ہے۔" [1]

میرٹھی صاحب کی پیش کردہ روایت "ضعیف" ہے، کیونکہ:

۱۔ ناجیہ عنزی "مجہول" راوی ہے۔ اس کی توثیق نہیں مل سکی۔

۲۔ ابواسحاق السبیعی آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے۔ ان سے ابوبکر بن عیاش کا اختلاط سے پہلے بیان کرنا ثابت نہیں۔

۳۔ ابواسحاق "مدلس" ہیں اور یہاں سماع کی صراحت نہیں کی۔

بھلا مسند احمد کی ایک "ضعیف" روایت کا صحیح بخاری کی بالاتفاق صحیح احادیث سے کیا مقابلہ اور اس بنا پر صحیح بخاری پر اعتراض کی بھلا کیا وقعت ہے؟

معلوم ہوا کہ یہ حدیث بالکل صحیح ہے اور اس پر کوئی قابلِ التفات اعتراض نہیں۔

---

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/ ۱۲۵۔۱۲۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

چودھواں باب

تیمم میں ایک ضرب ہے یا دو؟

اور ہاتھوں کا پہنچوں تک مسح کیا جائے یا کہنیوں تک؟

شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب نے اس عنوان کے تحت کسی نئی حدیث پر اعتراض نہیں کیا، بلکہ گزشتہ حدیث، جس کے صحت پر ہم مفصل ومدلل بحث کر چکے ہیں، اسی پر اپنی "عقلی" طبع آزمائی کی ہے۔ اس صحیح حدیث میں تیمم کا نبوی طریقہ یوں ہے کہ:

((فضرب النبیّ صلّی اللّٰه علیه وسلّم بکفّیه الأرض ، ونفخ فیهما ، ثمّ مسح بهما وجهه وکفّیه))

"نبی اکرم ﷺ نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو زمین پر مارا اور ان میں پھونکا، پھر ان دونوں کے ساتھ اپنے چہرہ مبارک اور دونوں ہتھیلیوں (کی بیرونی جانب) کا مسح کیا۔" [1]

لیکن میرٹھی صاحب کو یہ نبوی طریقہ پسند نہیں آیا۔ آیئے اس حدیث پر ان کے اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں:

فصلِ اوّل: فنّی اعتراضات کا جائزہ

سعید بن عبدالرحمٰن کی روایت پر "لغو ونا قابل التفات" کا فتویٰ!

"سعید بن عبدالرحمٰن کے روایت کردہ قصہ عمار وعمر کی روایات میں مذکور ہے کہ عمار بن یاسر

[1] صحیح بخاری: ۳۳۸

نے جب حضور اکرم ﷺ کو اپنا وہ ماجرا سنایا کہ پانی نہ ہونے کی وجہ سے میں نے مٹی سے طہارت حاصل کرنے کی غرض سے جانور کی طرح مٹی میں لوٹ لگائی تھی تو آپ نے فرمایا، تمہیں یہ بس کر لینا کافی تھا۔ یہ کہہ کر آپ نے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور روئے انور پر اور دونوں ہتھیلیوں پر پھیر لیے۔

اسی سے استدلال کر کے امام بخاری اور عام محدثین نے یہ کہا ہے کہ تیمم میں بس ایک ضرب، یعنی ایک بار مٹی پر ہاتھوں کو مارنا ہے۔ وہ دونوں ہاتھ اولاً پورے چہرے پر پھیر لیے جائیں، پھر پہنچوں تک دونوں ہتھیلیوں پر، یعنی بایاں ہاتھ داہنے کف دست پر اور اپنا داہنا ہاتھ بائیں کف دست پر۔

اور میں ثابت کر چکا ہوں کہ سعید بن عبدالرحمٰن کی روایت کردہ حدیث لغو و نا قابل التفات ہے، لہٰذا اس سے استدلال کرنا درست نہیں ہے۔۔۔" [1]

ہم ثابت کر چکے ہیں کہ اس حدیث کے راوی سعید بن عبدالرحمٰن پر میرٹھی صاحب کا اعتراض قطعاً "لغو و نا قابل التفات" ہے۔ اس کی بنا پر بالکل صحیح حدیث کو رد کرنا ایک منصف مزاج کو بالکل زیب نہیں دیتا۔

کیونکہ سعید بن عبدالرحمٰن بالاتفاق "ثقہ و صدوق" راوی تھے۔ کسی ایک ثقہ محدث نے بھی ان پر جرح نہیں کی، لیکن میرٹھی صاحب نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے بغیر کسی سند و حوالہ کے اس بے قصور راوی پر اپنے جرحی نشتر چلائے ہیں۔

راویوں کی "فضول گوئی" یا سچائی کا علم محدثین کو تھا، اصول حدیث سے ناواقف میرٹھی صاحب کو راویانِ حدیث کے حالات سے کیا واقفیت؟ لہٰذا ان کا راویوں پر کلام کرنا دیوانے کی بڑ

---

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۳۶

سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

اگر میرٹھی صاحب کے کسی شخص یا فرقہ میں اتنی کوئی ہمت ہے تو اسے بروئے کار لا کر سعید بن عبدالرحمٰن راوی پر کسی محدث سے کوئی جرح ثابت کرے۔ مگر ایسا قیامت تک ممکن نہیں ہے۔

(۲) میرٹھی صاحب نے سعید بن عبدالرحمٰن پر تو اعتراض کر دیا ہے کہ انہوں نے سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے واقعہ نقل کیا ہے جس کے راوی یہ نہیں، لیکن ان کو شاید یاد نہیں کہ صحیح بخاری میں ہی سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بھی سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ اس کے الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیں:

((فضرب بکفه ضربة علی الأرض ...))

"آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ کو ایک ہی دفعہ زمین پر مارا۔۔۔"[1]

خود میرٹھی صاحب نے اپنی کتاب میں اسی حدیث پر اعتراض کیا ہے جس کا ہم علمی تحقیقی جواب ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ!

لیکن یہاں وہ اسے بالکل بھول گئے ہیں۔

اسی طرح سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے بالاتفاق "ثقہ" راوی ابو مالک غفاری نے بھی بیان کیا ہے جیسا کہ ہم آئندہ صفحات میں اسے تفصیلاً ذکر کریں گے۔

مگر یہاں میرٹھی صاحب نے صرف سعید بن عبدالرحمٰن پر بے دلیل اعتراض کر کے اس حدیث سے دور کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ اعتراض محض باطل ہے۔

لہٰذا اس حدیث سے امام بخاری رحمہ اللہ اور دوسرے ائمہ دین کا استدلال بالکل درست ہے۔

---

[1] صحیح بخاری: ٣٤٧، صحیح مسلم: ٣٦٨

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا فتویٰ اور "جمہور" کا عمل!

"اس مسئلہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا عمل اور فتویٰ ہی اس لائق ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے موطا میں امام نافع سے، جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے خادم خاص تھے اور پوری امت ان کی ثقاہت پر اتفاق رکھتی ہے، روایت کی ہے۔۔۔

امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی رحمہ اللہ اور جمہور اہل علم اس کے قائل ہیں کہ تیمم میں دو ضرب ہیں۔ پہلی ضرب میں پورے چہرے کا اور دوسری میں کہنیوں سمیت کلائیوں کا مسح کیا جائے۔۔۔ [1]

تبصرہ ① آپ میرٹھی صاحب کے علمی معیار کا اندازہ کریں کہ وہ صحابی رسول سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ کا عمل پیش کر کے اسے مرفوع کے خلاف قرار دے کر کہنا یہ چاہتے ہیں کہ یہی قابل عمل ہے۔

بھلا سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے دو ضرب والے اور کہنیوں تک مسح والے عمل سے رسول اللہ ﷺ کے ایک ضرب والی حدیث ناقابل عمل کیسے ہو جائے گی؟ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ صحیح بخاری کی اس صحیح مرفوع حدیث میں موجود فعل رسول ﷺ کے مقابلے میں کسی صحیح مرفوع حدیث میں موجود کوئی قول و فعل رسول ﷺ ہی پیش کرتے اور پھر زور لگاتے کہ اس کا راوی زیادہ معتبر ہے لہٰذا اسی پر ہی عمل جو زیادہ صحیح ہے کر لیا گیا۔ میرٹھی صاحب کا مبلغ علم ہی اتنا ہے!

رہا ابن عمر رضی اللہ عنہ کا دو ضرب اور کہنیوں تک مسح والا عمل تو اسے صحیح تسلیم کرنے کے بعد بھی اس سے بھلا نبی اکرم ﷺ کے عمل مبارک کی نفی کیسے ہو گی؟

---

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱ / ۱۲۰ - ۱۲۱

اگر کوئی منصف مزاج سمجھنا چاہے تو کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے، کیونکہ جیسے وضو میں اعضاء کو ایک ایک بار، دو دو بار اور تین تین بار دھونا جائز ہے۔ جس حدیث میں ایک بار دھونے کا ذکر ہے، وہ دو یا تین بار دھونے کے خلاف نہیں ہے، اسی طرح دو یا تین بار دھونے کے ذکر والی روایات ایک بار دھونے سے وضو مکمل ہونے والی روایات کے خلاف نہیں ہیں۔ ذرا ہوش سے کام لیا جائے تو بالکل اسی طرح ایک ضرب سے دو کی نفی اور دو سے ایک کی نفی لازم نہیں آتی۔

② پھر خود سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری سند کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کے بعد سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں یہ فتویٰ ثابت ہے:

التيمم هكذا ، وضرب ضربة للوجه والكفين .

"تیمم ایسے ہے، پھر آپ رضی اللہ عنہ نے چہرے اور دونوں ہتھیلیوں کے لیے ایک ہی دفعہ ہاتھوں کو زمین پر مارا۔" ❶

مصنف ابن ابی شیبہ کے الفاظ یہ ہیں:

انّه تيمّم ، فمسح بيديه التّراب ، ثمّ نفخهما ، ثمّ مسح بهما وجهه ويديه ، ولم يمسح ذراعيه .

"آپ رضی اللہ عنہ نے تیمم کیا تو اپنے دونوں ہاتھوں کو مٹی پر مارا، پھر ان کو پھونکا، پھر ان دونوں کے ساتھ اپنے چہرے اور دونوں ہاتھوں کا مسح کیا، لیکن اپنی کہنیوں کا مسح نہیں کیا۔"

سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والے راوی ابو مالک غزوان الغفاری بالاتفاق "ثقہ" ہیں۔ کسی ایک محدث نے بھی ان پر کوئی جرح نہیں کی۔

---

❶ الاوسط لابن المنذر : ۲۱۸-۲۱۷/۲، واللفظ له ، مصنف ابن ابی شیبۃ : ۱۴۷/۱، وسندهٗ صحیح

میرٹھی صاحب سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے اس فتویٰ کو کس کھاتے میں ڈالیں گے؟ اگر سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے فتویٰ پر عمل ہوسکتا ہے تو سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے اس صحیح فتویٰ پر عمل کیوں نہیں ہوسکتا جو مرفوع حدیث کے عین مطابق ہے اور کسی طرح بھی اس کے خلاف نہیں ہے؟ کیا اب بھی میرٹھی صاحب پورے زور سے یہی کہیں گے کہ:

''اس مسئلہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا عمل اور فتویٰ ہی اس قابل ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔۔۔''؟؟؟

حالانکہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا فتویٰ بظاہر ان کا اپنا ہے، لیکن سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے فتویٰ دے کر بالجزم یہ بھی فرمایا ہے کہ تیمم اسی طرح ہے اور وہ اس مرفوع حدیث کے راوی بھی ہیں، جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تیمم کا طریقہ موجود ہے۔

اس تحقیق سے یہ بھی ثابت ہوا کہ میرٹھی صاحب کا اس مسئلہ میں صحیح بخاری کی اس حدیث کے راوی سعید بن عبدالرحمٰن پر جرح کرنا ان کی صریح زیادتی ہے، ان کو یہ بھی معلوم نہیں ہوسکا کہ سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے تیمم میں ایک ضرب اور صرف ہتھیلیوں کے مسح والی روایت کو سعید کے علاوہ ابومالک رحمہ اللہ نے بھی بیان کیا ہے۔

یہ ہے ان کا مبلغ علم اور وہ اعتراض کرنے بیٹھے ہیں امت مسلمہ کے اتفاقی فیصلے پر!

③ میرٹھی صاحب کا تیمم میں دو ضرب کو جمہور کا مذہب قرار دینا بھی قطعاً غلط ہے، کیونکہ معاملہ اس کے برعکس ہے، جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وھو قول غیر واحد من أھل العلم من أصحاب النبیّ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم ... وغیر واحد من التابعین ... قالوا التیمّم ضربۃ للوجہ والکفّین، وبہ یقول أحمد وإسحاق، وقال بعض أھل العلم ... التیمّم ضربۃ للوجہ وضربۃ للیدین إلی المرفقین ...

"یہ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔۔۔ اور بہت سے تابعین کا قول ہے۔۔۔ انہوں نے کہا ہے کہ تیمم میں چہرے اور ہتھیلیوں کے لیے ایک ہی ضرب ہے، امام احمد بن حنبل اور امام اسحاق بن راہویہ کا بھی یہی مذہب ہے۔۔۔ البتہ کچھ اہل علم کا کہنا ہے کہ تیمم میں ایک ضرب چہرے کے لیے اور ایک ضرب کہنیوں تک ہاتھوں کے لیے ہے۔۔۔" ❶

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وفيه الاكتفاء بضربة واحدة في التيمم، ونقله ابن المنذر عن جمهور العلماء، واختاره...

"اس (حدیث) میں تیمم کے وقت ایک ہی ضرب کے کافی ہو جانے کا ذکر ہے۔ امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے اسے جمہور علمائے کرام سے نقل کیا ہے اور اسے پسند بھی کیا ہے۔۔۔" ❷

اسی مسئلہ میں امام بخاری رحمہ اللہ پر علامہ کرمانی حنفی کے اعتراضات پر امام بخاری رحمہ اللہ کا دفاع کرتے ہوئے، اعتراف حقیقت کرتے ہوئے اور کرمانی حنفی کا رد کرتے ہوئے میرٹھی صاحب کے حنفی بھائی علامہ بدرالدین عینی حنفی لکھتے ہیں:

لأنّ أصل الفرض يقوم بضربة واحدة كما في الوضوء على أنّ مذهب الجمهور الاكتفاء بضربة واحدة، كذا ذكره ابن المنذر، واختاره هو أيضا والبخاري أيضا، فلذلك بوّب عليه...

"کیونکہ اصل فرض ایک ہی ضرب ہے جیسا کہ وضو میں (ایک دفعہ دھونا ہی واجب) ہے، اس کے ساتھ ساتھ جمہور کا مذہب بھی یہی ہے کہ (تیمم میں) ایک ضرب کافی ہو جاتی ہے۔

---

❶ جامع ترمذی، تحت حدیث: ۱۴۴

❷ فتح الباری لابن حجر: ۱/۴۵۷، ۴۵۸

اسی طرح امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے اسے (ایک ضرب کو) ذکر کیا ہے اور اسی کو اختیار بھی کیا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اسی لیے اس پر باب قائم کیا ہے۔۔۔" ❶

اب تو قارئین کرام کو یقین کر لینا چاہیے کہ میرٹھی صاحب کا دو ضرب کو جمہور کا مذہب قرار دینا ان کی کم علمی ہے۔

❷ امام ابن المنذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فأما الأخبار الثلاثة التي احتج بها من رأى أن التيمم ضربة للوجه وضربة لليدين إلى المرفقين فمعلولة كلها، لا يجوز أن يحتج بشيء منها...

"تینوں (مرفوع) احادیث، جن سے ان لوگوں نے دلیل لی ہے، جن کی رائے میں تیمم کی ایک ضرب چہرے کے لیے اور دوسری کہنیوں تک ہاتھوں کے لیے ہیں، وہ ساری کی ساری احادیث معلول ہیں، ان میں سے کسی سے دلیل لینا جائز نہیں ہے۔۔۔" ❷

اب چاہیے تو یہ تھا کہ میرٹھی صاحب ان مرفوع احادیث میں موجود فعل رسول کو ثابت کرتے اور پھر صحیح بخاری میں موجود تیمم کے طریقے پر اعتراض کرتے، لیکن ان مرفوع احادیث کی کمزور حالت کا شاید میرٹھی صاحب کو بھی علم تھا، لہٰذا انہوں نے صحیح بخاری کی اتفاقی طور پر صحیح مرفوع حدیث کے مقابلے میں ایک موقوف قول کو پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے، جو کہ بہت بڑی بے اصولی ہے اور اس بارے میں دلائل سے ان کے تہی دست ہونے کی واضح بر ہان ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ جمہور کا مذہب ہے اور نہ ہی اس بارے میں میرٹھی صاحب کی پیش کردہ دلیل اصولی طور پر اس قابل ہے کہ اس پر مزید تبصرہ کیا جا سکے، لہٰذا ہم اس بارے میں بات کا طول دے کر اپنے غلط بحث سے کام نہیں لیں گے۔

---

❶ عمدة القاري شرح صحيح البخاري للعيني: كتاب التيمم، باب التيمم ضربة

❷ الأوسط لابن المنذر: ٢/ ٥١ ٢

"نظرِ صحیح" اور تیمم!

"نظرِ صحیح سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ وضو میں چار اعضاء ہیں۔ چہرہ دھونے کے بعد نیا پانی لے کر ہاتھ کہنیوں سمیت دھوئے جاتے ہیں، پھر نیا پانی لے کر سر کا مسح کیا جاتا ہے، پھر نیا پانی لے کر پاؤں دھوئے جاتے ہیں۔ تیمم میں اللہ تعالیٰ نے ان چار میں سے دو کو، یعنی سر اور پاؤں کو ساقط کر دیا ہے۔ پس جیسے وضو میں چہرہ دھونے کے لیے الگ الگ پانی اور کلائیوں کو دھونے کے لیے الگ پانی لیا جاتا ہے، اسی طرح تیمم میں چہرے پر مسح کرنے کے لیے الگ ضرب اور کلائیوں پر مسح کرنے کے لیے الگ ضرب ہونی چاہیے اور جب تیمم میں مسح پورے چہرے کا ہوتا ہے تو اسی طرح کہنیوں تک پوری کلائیوں کا مسح ہونا چاہیے۔

اگر کسی شخص نے وضو کرتے ہوئے کلائیاں نہ دھوئیں اور بس پہنچوں تک ہاتھ دھو لیے تو اس کا وضو صحیح نہیں ہوا اور اس ناقص وضو سے نماز پڑھنا درست نہیں ہے، اسی طرح تیمم میں کوئی کلائیوں پر کہنیوں تک مسح نہ کرے اور بس پہنچوں تک مسح کر کے رہ جائے تو اس کا تیمم درست نہیں اور اس ناقص تیمم سے شرعاً نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ قصورِ علم کے باعث کوئی اسے کامل تصور کرے تو یہ اس کا قصور ہے۔" [1]

① "نظرِ صحیح" کے الفاظ سے میرٹھی صاحب نے صحیح بخاری کی اس صحیح حدیث پر اپنے تئیں ایک "خالص عقلی" اعتراض کیا ہے، لیکن یہ ان کی غلطی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ طریقہ ہائے عبادت میں یوں عقل استعمال کرنا انسان کو کفر تک لے جا سکتا ہے۔

اگر میرٹھی صاحب جیسا کوئی دوسرا شخص اسی "نظرِ صحیح" کو قرآنِ کریم پر استعمال کرنا شروع

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ": 1/127-128

کر دیتے اور (معاذ اللہ!) یہ کہہ دیتے کہ:

"نظر صحیح تو اس بات کی متقاضی ہے کہ قرآن کریم نے وضو میں چہرے، بازوؤں، ہاتھوں اور پاؤں کو دھونے کا جو حکم دیا ہے، وہ صحیح نہیں، کیونکہ بے وضو ہونے میں ان اعضاء کا کوئی قصور نہیں، چنانچہ وہ اعضا دھوئے جانے چاہئیں، جو بے وضو ہونے کا باعث بنتے ہیں، مثلاً اعضائے تناسل وغیرہ۔"

تو میرٹھی صاحب کے معتقدین کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا؟ جب وضو کے بارے میں بتائے گئے طریقہ الٰہی میں عقل استعمال نہیں ہو سکتی تو پھر تیمم کے بتائے گئے نبوی طریقہ میں کسی "میرٹھی" کو اپنی عقل نارسا استعمال کرنے کی اجازت کہاں سے ملی ہے؟

③ میرٹھی صاحب کے قول کے بالکل برعکس نظر صحیح تو اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ تیمم میں کہنیوں تک مسح نہ کیا جائے، کیونکہ قرآن کریم میں وضو کے متعلق کہنیوں تک کی قید لگائی گئی ہے، جبکہ تیمم میں کہنیوں تک کی قید نہیں آئی، چنانچہ قرآن کریم میں جب ہاتھ کا لفظ مطلق آئے تو اس سے مراد ہاتھ کے جوڑ تک کا حصہ ہی لیا جاتا ہے، جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ اس بات کو یوں بیان کرتے ہیں:

اَلتَّیَمُّمُ ضَرْبَۃٌ لِلْوَجْہِ وَالْکَفَّیْنِ، قَالَ اللّٰہُ: ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا﴾

"تیمم چہرے اور (صرف) دونوں ہتھیلیوں کے لیے ایک ہی ضرب کا نام ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا﴾ (یعنی چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو)۔" ❶

❶ مسائل الإمام أحمد بروایۃ ابنہ أبي الفضل صالح: ۱۲۰۵

امام احمد بن حنبل کی مرضی یہ ہے کہ جب چور کا مطلق ہاتھ کاٹنے کا حکم قرآن کریم میں آیا ہے تو بالاتفاق چور کا ہاتھ جوڑ سے کاٹا جاتا ہے، کوئی مسلمان چور کے ہاتھ کو بغلی سمیت کاٹنے کا حکم نہیں دیتا، ہاں البتہ خارجی لوگ چور کا ہاتھ بغلی سمیت کاٹنے کے قائل ہیں اور ان کا یہ موقف قرآن وسنت اور اجماع امت کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہے، لہٰذا تیمم میں جب یہی لفظ مطلق آیا ہے تو خارجیوں کی طرح اس کو بغلی کلائی سمیت کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

(۲) اسی طرح نظر صحیح یہ تقاضا بھی کرتی ہے کہ تیمم میں ایک ہی دفعہ زمین پر ہاتھ مارے جائیں، اس لیے کہ صحیح احادیث میں زمین پر ہاتھ مار کر ان میں پھونکنے کا بھی ذکر ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ زیادہ مٹی اڑ جائے، کیونکہ نظر صحیح سے تیمم میں مقصود پانی کی طرح مٹی کو جسم پر ملنا نہیں ہے، بلکہ پانی نہ ہونے کی صورت میں طہارت پر اپنے دل کو مطمئن کرنا ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ مجبوری کی صورت میں انسان معذور ہوتا ہے لہٰذا جب پانی نہیں مل رہا تھا تو انسان پانی استعمال کر کے طہارت حاصل کرنے کا مکلف نہیں ہوتا، لیکن چونکہ کسی عادی انسان کو پانی نہ ملے اور وہ وضو یا غسل کی حاجت رکھتا ہو تو اس کا ضمیر اپنے اس عذر کے باوجود قلق واضطراب میں رہتا ہے، اسی کو ختم کرنے کے لیے تیمم کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

اسی لیے مٹی کو پھونک کر اڑا دیا جاتا ہے کہ مقصود جسم پر مٹی ملنا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے بتائے گئے طریقے کے مطابق اپنے ضمیر کو طہارت پر مطمئن کرنا ہوتا ہے۔

جب صورت حال یہ ہے تو نظر صحیح یہی تقاضا کرتی ہے کہ مٹی پر ایک ہی دفعہ ہاتھ مار لینا کافی ہو جائے، کیونکہ دوبارہ ہاتھ مارنے سے مزید مٹی لگے گی، جبکہ مٹی لگانا مقصود نہیں ہے۔

پھر جس طرح تیمم میں وضو والے اعضاء میں تخفیف کر دی گئی ہے، اسی طرح نظر صحیح کا تقاضا ہے کہ تیمم کی ضربوں میں بھی تخفیف کر دی جائے۔

معلوم ہوا کہ نظر صحیح بھی صحیح بخاری ہی کی تائید کرتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پندرھواں باب

تیمم کے متعلق سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا مباحثہ

قارئین کرام! صحیح بخاری میں غسل واجب ہونے پر پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کرنے کے بارے میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا مباحثہ موجود ہے، جس پر شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب نے اعتراضات کیے ہیں۔ یہ حدیث صحیح بخاری کے علاوہ مختلف روایات کے ساتھ بہت سی کتب حدیث میں موجود ہے۔

شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب نے خود اس کا خلاصہ یوں بیان کیا ہے:

"ان روایات کا حاصل یہ ہے کہ ابووائل نے اعمش سے بیان کیا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پانی نہ ملنے کی صورت میں بس وضو کے لیے تیمم کے قائل تھے، غسل کے لیے تیمم کے قائل نہ تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جس شخص پر غسل واجب ہو اور نماز کا وقت آ جائے، مگر اسے غسل کے لیے پانی دستیاب نہ ہو تو تیمم کر کے نماز نہ پڑھے، بلکہ پانی ملنے کا انتظار کرے، جب تک پانی نہ ملے نماز نہ پڑھے، خواہ اسے اس انتظار میں ایک مہینہ لگ جائے۔

عبداللہ بن مسعود کے اس فتوے کا علم امیر کوفہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو ہوا۔ ابوموسیٰ نے عبداللہ بن مسعود سے ملاقات کی۔ ابووائل بھی موجود تھے۔ ابوموسیٰ نے ابن مسعود سے اس فتویٰ کے متعلق دریافت کیا۔ ابن مسعود نے کہا، ہاں میں اس کا قائل ہوں کہ تیمم غسل کے لیے نہیں ہوتا، بس وضو کے لیے ہوتا ہے۔ ابوموسیٰ نے کہا، آپ کو عمار بن یاسر کا قصہ معلوم نہیں ہوا کہ انہوں نے جنابت کی وجہ سے نماز کے لیے تیمم کیا تھا، کیونکہ پانی تھا نہیں اور وہ

حدیثِ رسول میں اپنی طرف سے الفاظ کا اضافہ کر دیا ہے۔

سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اپنی دلیل کے طور پر صرف اتنا فرمانِ باری تعالیٰ پڑھا تھا:

﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾ [1]

آپ اس حدیث کی تمام روایات پڑھ جائیں، لیکن آپ کو آیتِ قرآنی کے ان الفاظ سے زائد کوئی لفظ نہیں ملے گا، لیکن چونکہ میرٹھی صاحب کا وہ مدعا، جس کا ہم اعتراض نمبر ① کے جواب میں ذکر کریں گے، مذکورہ الفاظ سے پورا نہیں ہو رہا تھا، لہٰذا انہوں نے اپنی طرف سے آیتِ کریمہ کے پچھلے الفاظ بھی نقل کر دیے ہیں، حالانکہ کتبِ حدیث میں سے کسی کتاب میں بھی یہ الفاظ موجود نہیں، نہ ہی ان الفاظ سے سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے استدلال کیا ہے۔

یہ ہے میرٹھی صاحب کی "دیانتِ علمی"، پھر بھی بعض لوگ ان کو بہت بڑا "مذہبی سکالر" سمجھتے ہیں!

فصلِ اوّل: فنی اعتراضات کا جائزہ

ابو وائل رحمہ اللہ کا تفرد!

"ابو وائل کے علاوہ اور کسی نے بھی حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف اس فتویٰ کی نسبت نہیں کی۔ علقمہ بن قیس نخعی اور اسود بن یزید نخعی، حضرت ابنِ مسعود کے ملازمِ صحبت شاگردانِ رشید تھے اور علم و فضل اتقان و تثبت اور ثقاہت و فقاہت میں ابو وائل سے بدرجہا بڑھ کر تھے۔" [2]

① ہم بارہا بیان کر چکے ہیں کہ حدیث کے صحیح ہونے میں قطعاً

[1] النساء: ٤/ ٤٣ [2] "صحیح بخاری کا مطالعہ": ١/ ١٣٦

یہ شرط غیب ہے کہ اسے ایک استاذ سے کئی شاگرد بیان کریں یا کوئی ملازمِ صحبت راوی ہی اسے بیان کرے۔

میرٹھی صاحب خود لکھتے ہیں:

"محدثین کی اصطلاح میں صحیح حدیث وہ ہے جس کی اسناد متصل ہو اور راوی سب کے سب ثقہ و ضابط ہوں اور اس کی اسناد یا متن میں نہ کوئی شذوذ ہو نہ کوئی علت ہو۔" ❶

یہ تعریف خود میرٹھی صاحب نے کی ہے۔ اب قارئین ہی بتائیں کہ کیا اس تعریف میں اس بات کا کہیں ذکر بھی ہے کہ راوی کے دوسرے سب ساتھی بھی وہی حدیث بیان کریں تو تسلیم ہوگی ورنہ نہیں؟ یا کسی محدث کے ملازمِ صحبت راوی وہ حدیث بیان کریں گے تو قبول ہوگی ورنہ نہیں؟ پھر یہ حدیث کسی دوسرے راوی کی روایت کے خلاف بھی نہیں ہے کہ دوسرے کی روایت کو ترجیح دے کر اسے ناقابلِ التفات قرار دیا جائے!

② تجزیہ: یہ کوئی مستقل حدیث نہیں تھی کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سب شاگردوں کو بیان کرتے۔ نہ ہی یہ "مناظرہ" کسی طے شدہ پروگرام کے تحت ہوا تھا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے سب شاگرد اس میں شامل ہوتے، بلکہ یہ تو ایک اتفاقی مباحثہ تھا، جس میں ابو وائل شقیق بن سلمہ رحمہ اللہ موجود تھے۔

اگر اس کا شیڈول پہلے سے طے ہوتا تو شاید دیگر لوگ وہاں بھی حاضر ہوتے اور اسے بیان کرتے۔ لہٰذا اس کے بیان کرنے میں ابو وائل رحمہ اللہ کا اکیلا ہونا عقلی و نقلی کسی بھی اعتبار سے قابلِ تعجب بات نہیں ہے۔

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۳۲/۱

ابو وائل پر جرح اور میرٹھی صاحب کی علمی "گہرائی"!

"مشہور و بلند پایہ محدث حماد بن زید رحمہ اللہ نے ابو وائل کو متہم قرار دیا ہے۔ سنن نسائی میں ہے کہ شعبہ نے حماد بن زید سے ذکر کیا کہ میں نے منصور بن معتمر و اعمش و زبید یامی سے سنا۔ ان تینوں حضرات نے ابو وائل سے روایت کی ہے اور ابو وائل نے عبداللہ بن مسعود سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سباب المسلم فسوق وقتاله كفر (مسلمان سے گالم گلوچ کرنا فسق ہے اور اس سے لڑنا کفر ہے)۔

یہ حدیث سنا کر شعبہ نے حماد بن زید سے کہا، بتائیے اس حدیث کی صحت میں کچھ کلام ہو سکتا ہے؟ میں نے یہ حدیث منصور سے، اعمش سے اور زبید سے سنی ہے۔ کیا آپ منصور کو متہم قرار دیتے ہیں (یعنی منصور پر دروغ گوئی و کذب بیانی کا الزام لگاتے ہیں) یا اعمش کو یا زبید کو؟ قال: لا اتهمهم، ولكن اتهم ابا وائل. (حماد نے کہا یہ تینوں ثقہ ہیں، میں انہیں متہم قرار نہیں دیتا، لیکن میں ابو وائل پر دروغ گوئی کا الزام لگاتا ہوں)۔۔۔

شعبہ کے پاس حماد بن زید کی اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ پس ابو وائل کی بیان کی ہوئی وہی بات لائق وثوق ہوگی، جس کی تائید کسی اور شخص کی روایت سے ہوتی ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ حضرت ابن مسعود کے فتوے اور ابو موسیٰ اشعری سے مناظرہ کا قصہ ابو وائل کا ہی تصنیف کیا ہوا ہے۔

نیز اس نے سعید بن عبدالرحمٰن بن ابزی کا بیان کیا ہوا قصہ "عمار و عمر" بن لیا تھا۔ بندۂ خدا نے اسے بھی اس مناظرہ کے قصہ میں پیوند کر دیا۔" [1]

① میرٹھی صاحب کا مبلغ علم دیکھیں کہ انہوں نے ابو وائل

---

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۳۱۔۱۳۲

شقیق بن سلمہ کو "متہم" قرار دینے والے شخص کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ "مشہور و ثقہ فقیہ محدث حماد بن زید" ہیں حالانکہ یہ سیرتی صاحب کے فن حدیث کی ابجد سے بھی ناواقف ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے، کیونکہ یہاں جو حماد ہیں وہ حماد بن ابی سلیمان ہیں جیسا کہ مذکورہ حدیث کے تحت تو اس کی وضاحت موجود ہے۔ امام اہل سنت احمد بن حنبل رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں۔

قال شعبة - قلت لحماد بن ابي سليمان : هذا الأعمش وزبيد ومنصور حدثونا عن شقيق عن عبد الله عن النبيّ صلّى الله عليه وسلّم ((سباب المسلم فسوق ..)) ، فأيهم تتهم ؟ أتتهم الأعمش ؟ أتتهم المنصور ؟ أتتهم أبا وائل ؟ قال إسحاق : قلت لأبي عبد الله . وأيش اتهم من أبي وائل ؟ قال : اتهم رأيه الخبيث ، يعني حماد بن أبي سليمان ، وقال لي : قال ابن عون كان حماد بن أبي سليمان من أصحابنا حتّى أحدث ما أحدث ، قال أحدث الإرجاء .

"امام شعبہ رحمہ اللہ نے کہا کہ میں نے حماد بن ابی سلیمان سے کہا یہ اعمش، زبید اور منصور ہیں، انہوں نے ہمیں شقیق (بن سلمہ) کے واسطے سے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان کو گالی دینا فسق ہے (اور مسلمان سے لڑائی کفر ہے)۔ تم ان راویوں میں سے کسے متہم قرار دیں گے؟ کیا اعمش کو متہم قرار دیں؟ کیا منصور کو متہم قرار دیں؟ کیا ابو وائل کو متہم قرار دیں؟" (حماد بن ابی سلیمان نے کہا کہ میں ابو وائل کو متہم قرار دیتا ہوں)۔

اسحاق کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد رحمہ اللہ سے پوچھا اس (حماد بن ابی سلیمان) نے ابو وائل میں کس چیز کا الزام لگایا ہے؟ فرمایا اس نے اپنی خبیث رائے (کو مدنظر رکھتے) کا الزام لگایا ہے۔ نیز (امام احمد رحمہ اللہ نے) مجھے فرمایا، عبداللہ بن عون بیان کرتے تھے کہ حماد بن

ابی سلیمان ہمارے ساتھیوں میں سے تھے، یہاں تک کہ انہوں نے وہ بدعت جاری کی، جو انہوں نے جاری کی۔ (امام احمد رحمہ اللہ نے) فرمایا، انہوں نے عقیدۂ ارجاء کی بدعت جاری کی تھی۔" [1]

اب تو قارئین کرام کو میرٹھی صاحب کی "علمی" حالت کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ انہوں نے اپنی کم فہمی کی بنا پر حماد بن ابی سلیمان کو حماد بن زید سمجھ لیا ہے۔

ابو وائل رحمہ اللہ پر جرح کی حقیقت اور عقیدۂ ارجاء

حماد بن ابی سلیمان خود عقیدۂ ارجاء کے حامل تھے اور اپنے اسی عقیدۂ فاسد کی وجہ سے انہوں نے ثقہ امام ابو وائل شقیق بن سلمہ رحمہ اللہ پر جرح کی ہے، کیونکہ عقیدۂ ارجاء کے حامل لوگ عمل کو ایمان میں داخل نہیں سمجھتے، بلکہ ان کے نزدیک پکا بے عمل بھی پکا مؤمن ہوتا ہے، جیسا کہ بالاتفاق ثقہ معتبر امام سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

أمّا المرجئة فيقولون : الإيمان كلام بلا عمل ، من قال : أشهد أن لا إله إلّا الله ، وأنّ محمّدا عبده ورسوله ، فهو مؤمن مستكمل الإيمان ، إيمانه على إيمان جبريل والملائكة ، وإن قتل كذا و كذا مؤمنا ، وإن ترك غسل الجنابة ، وإن ترك الصّلاة ، وهم يرون السّيف على أهل القبلة .

"مرجی لوگ کہتے ہیں کہ ایمان بغیر عمل کے صرف (زبان سے توحید و رسالت کی) کلام کا نام ہے، (ان کے بقول) جس نے توحید و رسالت کے زبانی گواہی دے دی، وہ کامل ایمان والا مؤمن ہے، اس کا ایمان جبریل اور دیگر فرشتوں کے ایمان جیسا ہے، خواہ اس نے کتنے ہی مؤمنوں کو قتل کر دیا ہو، خواہ اس نے غسل جنابت چھوڑ دیا ہو اور خواہ اس نے نماز

[1] السنة لأبي بكر الخلال : ٥٩٩/٣، الرقم : ١٠٦٣

ترک کردی ہو۔ وہ (مرجئی لوگ) اہل قبلہ کے خلاف تلوار اٹھانا بھی جائز سمجھتے ہیں۔" ❶

نیز ایک مشہور مرجئی امام نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا: (نعوذ باللہ!)

إيمان إبليس وإيمان أبي بكر الصّدّيق رضي الله عنه واحد، قال أبو بكر : يا ربّ، وقال إبليس : يا ربّ.

"ابلیس اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایمان ایک ہی تھا، کیونکہ ابوبکر نے یا رب! (اے میرے رب!) کہا تھا اور ابلیس نے بھی یا رب! (اے میرے رب!) کہا تھا (یعنی ایمان صرف زبان سے اقرار کا نام ہے اور یوں دونوں کا ایمان برابر ہے، کیونکہ دونوں اس بات کے اقراری تھے)۔" ❷

نیز اسی شخص نے اس سے بڑھ کر یہ بھی کہا ہے: (استغفر اللہ!)

إيمان آدم وإيمان إبليس واحد، قال إبليس : ﴿رَبِّ بِمَآ أَغْوَيْتَنِي﴾، وقال : ﴿رَبِّ فَأَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ﴾، وقال آدم : ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا﴾

"آدم علیہ السلام اور ابلیس کا ایمان ایک ہی تھا، کیونکہ ابلیس نے کہا تھا: ﴿رَبِّ بِمَآ أَغْوَيْتَنِي﴾ (اے میرے رب! چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے) اور ﴿رَبِّ فَأَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ﴾ (اے میرے رب! مجھے قیامت تک مہلت دے دے) اور آدم علیہ السلام نے

---

❶ الشريعة للآجري : ٢٧٩٩/٥-٢٠٠٠، رقم : ١٩٩١، شرح أصول اعتقاد أهل السنة للالكائي : ٩٨٤/٥، رقم : ١٨٤٥، شرح مذاهب أهل السنة لابن شاهين : ٣٥، وسنده صحيح إلى مؤمل [illegible] ... ثقة [illegible] ... قال : [illegible]

❷ السنة لعبد الله بن أحمد : ٣٧٧، تاريخ بغداد للخطيب : ٣٧٦/١٣، وسنده صحيح

بھی کہا تھا : ﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا ﴾ (اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے)۔"[1]

معلوم ہوا کہ عقیدۂ ارجاء کے مطابق اللہ تعالیٰ کا زبانی طور پر اقراری شخص فرشتوں اور نبیوں جیسے ایمان کا حامل پکا مؤمن ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا گناہ اور اللہ تعالیٰ کی بڑی سے بڑی نافرمانی اس کے ایمان میں کمی نہیں کر سکتی، لیکن ابو وائل کی بیان کردہ حدیث سے حماد بن ابی سلیمان کے اس عقیدۂ فاسد کی نفی ہو رہی تھی، کیونکہ اس میں صراحت تھی کہ مسلمان کو گالی دینے اور اس سے لڑائی کرنے سے مؤمن کا ایمان کامل نہیں رہتا، بلکہ اس میں فسق و کفر آ جاتا ہے۔

جب امام شعبہ رحمہ اللہ نے حماد بن ابی سلیمان سے کہا کہ یہ حدیث تو صحیح ہے اور اس کے سارے راوی ثقہ ہیں تو آپ کا عقیدہ باطل ہے، نیز فرمایا کہ اس حدیث کے کس راوی کو ہم متہم سمجھ سکتے ہیں؟ اس پر حماد بن ابی سلیمان نے اپنے فاسد عقیدہ کو بچانے کے لیے بلاوجہ بالاتفاق ثقہ راوی امام ابو وائل شقیق بن سلمہ تابعی رحمہ اللہ کو "متہم" قرار دے دیا۔

ابو وائل بالاتفاق ثقہ راوی ہیں

قارئین کرام اندازہ فرمائیں کہ اتنی سی بات سمجھنے کی میرٹھی صاحب نے کوشش نہیں کی اور حماد بن ابی سلیمان کو "مشہور و بلند پایہ محدث" قرار دے دیا ہے، جو کہ فی الحقیقت مختلف فیہ راوی ہیں۔

ان کے عقیدۂ ارجاء کی وجہ سے کئی محدثین نے ان پر جرح کی ہے، اس کے برعکس ابو وائل شقیق بن سلمہ رحمہ اللہ، جو کہ بالاتفاق ثقہ راوی ہیں، ان کو میرٹھی صاحب نے ایک فاسد عقیدہ والے راوی کے کہنے پر "متہم" قرار دے دیا ہے، حالانکہ ابو وائل رحمہ اللہ کے بارے میں:

---

[1] المعرفة والتاريخ للفسوي: ٩٦/٣، تاريخ بغداد: ٣٧٧/١٣، وسنده صحيح

۱۔ حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

أجمعوا على أنه ثقة .

"مسلمانوں کا ان کے ثقہ ہونے پر اجماع و اتفاق ہے۔" ❶

۲۔ ثقہ امام سلیمان بن مہران الاعمش رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

قال لي إبراهيم : عليك بشقيق ، فإني قد أدركت أصحاب عبد الله ، وهم متوافرون ، وهم يعدونه من خيارهم .

"مجھے امام ابراہیم (نخعی رحمہ اللہ تابعی) نے فرمایا کہ شقیق کو لازم پکڑو، کیونکہ میں نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بہت سے شاگردوں سے ملاقات کی ہے، وہ سب شقیق بن سلمہ رحمہ اللہ کو اپنے میں سے بہتر سمجھتے تھے۔" ❷

۳۔ امام وکیع بن الجراح رحمہ اللہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں

أبو وائل ثقة ، لا يسئل عنه .

"ابووائل ثقہ تھے، ان (جیسے راویوں) کے بارے میں پوچھا نہیں جاتا۔" ❸

٤۔ امام عجلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

شقيق بن سلمة الأسدي ، يكنى أبا وائل من أصحاب عبد الله ، ثقة ، رجل صالح ...

---

❶ تهذيب التهذيب لابن حجر: ٤/ ٣٦٢

❷ الجرح والتعديل لابن أبي حاتم: ٤/ ٣٧١، الطبقات الكبرى لابن سعد: ٦/ ٩٦، وسنده صحيح

❸ الجرح والتعديل لابن أبي حاتم: ٤/ ٣٧١، وسنده صحيح

"شقیق بن سلمہ الاسدی، ان کی کنیت ابووائل تھی، سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں میں سے ایک ہیں، ثقہ ہیں اور نیک آدمی ہیں۔۔۔" ❶

٥۔ امام ابن سعد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وكان ثقة، كثير الحديث.

"آپ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔" ❷

٦، ٧۔ امام بخاری و مسلم رحمہما اللہ نے ان کی سینکڑوں احادیث کو صحیح قرار دے کر ان کی واضح توثیق کی ہے۔

٨، ٩، ١٠۔ اسی طرح امام ابن خزیمہ، امام ابن حبان، امام حاکم اور امام ابن الجارود رحمہم اللہ وغیرہم نے بھی ان کی بہت زیادہ احادیث کی تصحیح کی ہے۔

⊙ ان کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

قد كان هذا السّيد رأسا في العلم والعمل.

"یہ سید و سردار (امام ابووائل شقیق بن سلمہ رحمہ اللہ) علم و عمل میں کامل شخص تھے۔" ❸

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ ابووائل شقیق بن سلمہ تابعی رحمہ اللہ بالکل "ثقہ" راوی تھے۔ عقیدۂ ارجاء کے حامل حماد بن ابی سلیمان کے علاوہ کسی نے ان پر کوئی جرح نہیں کی۔

اختلافِ عقیدہ کے سبب کی گئی جرح ناقابل قبول ہوتی ہے

کاش کہ میرٹھی صاحب حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ قول پڑھ لیتے، آپ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

❶ معرفة الثقات للعجلي: ١/٤٥٩

❷ الطبقات الكبرىٰ لابن سعد: ٦/١٠٢

❸ سير اعلام النبلاء للذهبي: ٤/١٦٥

وممن ينبغي أن يتوقف في قبول الجرح ممن كان بينه وبين من جرحه عداوة سببها الاختلاف في الاعتقاد، فإن الحاذق إذا تأمل ثلب أبي إسحاق الجوزجاني لأهل الكوفة رأى العجب، وذلك لشدة انحرافه في النصب وشهرة أهلها بالتشيع، فتراه لا يتوقف في من ذكره منهم بلسان ذلقة وعبارة طلقة، حتى إنه بلين مثل الأعمش وأبي نعيم وعبيد الله بن موسى وأساطين الحديث وأركان الرواية، فهذا إذا عارضه مثله أو أكبر منه، فوثق رجلا ضعفه قبل التوثيق...

"جن لوگوں کے جرح والے قول کو قبول کرنے میں توقف کرنا ضروری ہے، ان میں سے وہ شخص بھی ہے، جس کی مجروح راوی سے بسبب اختلافِ عقیدہ عداوت ہو، چنانچہ جب کوئی ماہر (رجال) آدمی ابو اسحاق جوزجانی کی اہل کوفہ کے خلاف جرح پر غور کرے گا، وہ عجیب طرز دیکھے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقیدۂ نصب (سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے عداوت) میں سخت انحراف کا شکار ہیں، جبکہ کوفہ والے تشیع (سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ محبت) میں مشہور ہیں، لہٰذا آپ دیکھیں گے کہ اہل کوفہ میں سے جس کو بھی ابو اسحاق جوزجانی نے ذکر کیا ہے، اس پر تیز زبان اور سخت عبارت کے ساتھ جرح کرنے میں توقف نہیں کیا، یہاں تک کہ وہ امام اعمش، ابو نعیم اور عبید اللہ بن موسیٰ (جیسی)، جیسے حدیث کے پائیوں اور روایت کے ستونوں پر بھی جرح کرنا شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب جوزجانی کے مقابلے میں جب ان کا ہم پلہ امام یا ان سے بڑا امام اس آدمی کو ثقہ کہہ دے، جس کو جوزجانی نے ضعیف کہا ہو تو توثیق کو قبول کیا جائے گا۔۔۔" [1]

---

[1] لسان المیزان لابن حجر 1/16

معلوم ہوا کہ مخالف عقیدہ رکھنے والے لوگوں کا ایک دوسرے پر جرح کرنا معتبر نہیں ہوتا۔ پھر حماد بن ابی سلیمان کی جرح میں تو صراحت بھی موجود ہے، جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے بیان کر دیا ہے کہ انہوں نے یہ جرح اپنے عقیدۂ فاسدہ کے خلاف حدیث بیان کرنے کی وجہ سے ابووائل رحمہ اللہ پر کی ہے، کسی اور سبب سے نہیں۔

پھر باقی سب محدثین بالاتفاق ابووائل رحمہ اللہ کی توثیق کر رہے ہیں، لیکن میرٹھی صاحب ہمارے عدل وانصاف کا خون کیے جا رہے ہیں۔

اب بھی اگر کوئی شخص میرٹھی صاحب کو منصف مزاج کہے تو وہ خود منصف نہیں ہے، اللہ ہی جانے کہ عدل وانصاف اور علم وفضل کا اس قدر خون کرنے والے شخص کو صحیح بخاری کی اتفاقی طور پر صحیح احادیث کی "تحقیق وتنقید" کا مشورہ کس نے دیا تھا؟

فصلِ ثانی: عقلی اعتراضات کا جائزہ

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور آیتِ تیمم!

"اگر ابووائل کا یہ بیان صحیح اور واقعی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو تیمم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد مذکور سے ذہول ہو گیا تھا، اس لیے وہ فتویٰ دے رہے تھے کہ تیمم بس وضو کے لیے ہے، غسل کے لیے نہیں ہے، مگر جب حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے انہیں ارشادِ حق یاد دلایا تو اس کے بعد انہوں نے اپنے اس فتویٰ سے رجوع کر لیا، جو محتاطانہ احتیاط پر مبنی تھا، کیونکہ یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مقابلہ میں ابن مسعود اپنی رائے پر اصرار کرتے۔

ویسے میں سمجھتا ہوں کہ ابووائل کا یہ بیان کردہ یہ قصہ شروع سے آخر تک غلط ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اکابر صحابہ کرام میں سے تھے۔ سابق الاسلام اور ملازم صحبتِ نبوی

سے مراد جماع کے علاوہ (چھونا) ہے۔۔۔" [1]

جب سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس آیت میں ملامست سے مراد جماع لیتے ہی نہیں اور ان کے نزدیک اس آیت سے جنبی کے لیے تیمم کی اجازت نکلتی ہی نہیں تو پھر یہ اعتراض بالکل بے جا ہے کہ اس سے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قرآن کو بھول جانا لازم آتا ہے۔

(۲) اس حدیث میں سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے آیت کریمہ کا صرف یہ ٹکڑا بطور دلیل ذکر کیا ہے:

﴿ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا ﴾ [2]

"تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی کا قصد کرو (اس کے ساتھ تیمم کرو)"

اگر اس آیت میں ﴿ أَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ ﴾ عورتوں سے جماع کے بارے میں صریح ہوتی، جیسا کہ میرٹھی صاحب ثابت کرنا چاہتے ہیں تو سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ان الفاظ کو ضرور ذکر کرتے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو الفاظ ان کا اصل مستدل تھے، انہیں ذکر ہی نہ کیا ہو؟

اب تو قارئین کرام کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ میرٹھی صاحب نے اس حدیث کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے مذکورہ آیت کریمہ کو اپنی طرف سے زائد کیوں نقل کر دیا تھا، حالانکہ یہ کسی روایت میں بھی اس طرح مذکور نہیں تھی، جیسا کہ میرٹھی صاحب نے ذکر کی ہے؟

وجہ یہی تھی کہ میرٹھی صاحب ﴿ أَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ ﴾ کے الفاظ سے جماع مراد لے کر اس آیت کو جنبی کے لیے تیمم کرنے میں صریح قرار دے کر صحیح بخاری پر اعتراض کرنا چاہتے تھے۔ ان الفاظ کے بغیر ان کا یہ مدعا ثابت نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے انہوں نے حدیث نبوی میں اپنی

---

[1] التمهيد لابن عبد البر: ۱۹/ ۲۷۰

[2] النساء: ٤/ ٤٣

طرف سے الفاظ کے اضافے سے بھی احتراز نہیں کیا!

ہم نے گزشتہ حدیث کے تحت ہی مکمل وضاحت سے ذکر کر دیا ہے کہ دراصل آیت مذکورہ جنبی کے تیمم کے لیے صریح ہے، تاہم راجح قول کے مطابق اس آیت میں ملامست سے مراد جماع ہے۔ تاہم سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ ملامست سے مراد جماع نہیں سمجھتے تھے کہ وہ اس آیت سے جنبی کے لیے تیمم کی اجازت سمجھتے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ لاجواب کیوں ہو گئے تھے؟ اس بارے میں قارئین کرام حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی توضیح پڑھ چکے ہیں۔ آئیے اب شارح بخاری علامہ عینی حنفی کا تبصرہ بھی ملاحظہ فرمائیں، وہ لکھتے ہیں:

ولعل المجلس ما كان يقتضي تطويل المناظرة، وإلا فكان لعبد الله أن يقول: المراد من الملامسة في الآية تلاقي البشرتين فيما دون الجماع، وجعل التيمم بدلا من الوضوء فقط، فلا يدل على جواز التيمم للجنب...

”شاید کہ اس مجلس میں مناظرہ کو طول دینے کی گنجائش نہ تھی، ورنہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یہ کہہ سکتے تھے کہ اس آیت میں ملامست سے مراد جماع نہیں، بلکہ دو جسموں کا (شہوت کے ساتھ) ملنا ہے (جیسا کہ ان سے ثابت بھی ہے) اور (اس آیت میں) تیمم صرف وضو کا بدل بنایا گیا ہے لہٰذا اس میں جنبی کے لیے تیمم کے جواز کی کوئی دلیل نہیں۔۔۔“ [1]

نیز کسی نے یہ اعتراض کیا تھا کہ بھلا بعض لوگوں کے غلط روش کو اپنانے کی وجہ سے اس آیت پر عمل کو چھوڑنا سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے لیے کیسے جائز تھا؟ اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس آیت میں موجود رخصت کو کیوں ختم کر دیا تھا، حالانکہ ایسا کرنے کے نتیجہ میں جنبی کو پانی نہ ملنے کی

---

[1] عمدة القاري للعيني: ۲/ ۵

صورت میں اس سے نماز بھی ساقط ہو رہی تھی؟ اس اعتراض کو نقل کرتے ہوئے اور اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ عینی حنفی ہی لکھتے ہیں:

واجيب عن هذا بأن عبدالله لم يذهب هذا المذهب الذي ظنه هذا القائل، وإنما كان يتأول الملامسة المذكورة في الآية على غير معنى الجماع، إذ لو أراد الجماع لكان فيه مخالفة الآية صريحا، وذلك مما لا يجوز من مثله في علمه وفهمه وفقهه ...

"اس کا جواب یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا وہ مذہب (قرآنی آیت کو اپنی رائے کی وجہ سے چھوڑنا) نہیں تھا، جو اس اعتراض کرنے والے نے سمجھ لیا ہے، بلکہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس آیت میں مذکورہ ملامست کی تفسیر جماع کے علاوہ (بوس و کنار وغیرہ) کرتے تھے۔ اگر آپ رضی اللہ عنہ اس آیت میں ملامست سے مراد جماع لیتے ہوئے (اور پھر جنبی کو تیمم کی رخصت نہ ہونے کا فتویٰ دیتے) تو اس آیت کی صریح مخالفت ہوتی اور ایسا کام آپ رضی اللہ عنہ جیسے علامہ، فہامہ اور فقیہ سے ممکن نہیں ..." [1]

لہٰذا میرٹھی صاحب کی اپنی کم علمی ہی ان کے صحیح بخاری پر اعتراض کرنے کا سبب بنی ہے۔

③ اگر یہ آیت پانی نہ ملنے کی صورت میں جنبی کے لیے تیمم کرنے میں صریح ہوتی تو سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، سیدنا عمار رضی اللہ عنہ والی حدیث ذکر کرنے سے پہلے شروع میں ہی یہ آیت کریمہ اپنی دلیل کے طور پر پیش کرتے، جو سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو خود بھی یاد تھی۔

معلوم ہوا کہ سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی فرمان باری تعالیٰ: ﴿أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ ...﴾ سے مراد جماع نہیں لیتے تھے، نہ ہی ﴿فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً

---

[1] عمدة القاري للعيني: ٣٦/٤

فَتَيَمَّمُوْا ... ﴾ کو جنبی کے لیے تیمم کی اجازت میں صریح نہیں سمجھتے تھے، اسی لیے تو انہوں نے بعد میں اسے ذکر کیا ہے، ورنہ قوی و صریح دلیل تو ہمیشہ شروع میں پیش کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن الفاظ کی وجہ سے میرٹھی صاحب نے اس آیت کو جنبی کے لیے تیمم میں صریح قرار دیا ہے، وہ الفاظ بھی سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بطور دلیل پیش نہیں کیے۔

بات صرف اتنی تھی کہ جب سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ ، سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کا واقعہ سن کر اس میں موجود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے قول کی وجہ سے مطمئن نہیں ہوئے تو سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اس آیت کریمہ کے عموم سے استدلال کیا ہے کہ اس آیت میں پانی نہ ملنے پر تیمم کا حکم ہے، لہٰذا اگرچہ یہ جنبی کے لیے صریح نہیں، لیکن عموم میں جنبی بھی شامل ہونا چاہیے۔ لیکن سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس لیے اس عموم سے استدلال صحیح نہیں سمجھا کہ دوسری قرآنی آیات میں جنبی کے لیے صراحتاً پانی سے طہارت حاصل کرنے کا ذکر ہے۔

ان کا خیال تھا کہ جس طرح قرآن کریم نے صراحتاً وضو سے تیمم کی کفایت کا بیان کیا ہے، اسی طرح جنابت سے بھی تیمم کی کفایت کا بیان ہونا چاہیے تھا، جو کہ نہیں ہے، اس لیے وہ جنبی کو پانی ملنے تک نماز سے روکتے تھے، ورنہ یہ آیت کریمہ تو ان کو خوب یاد تھی۔

اتنی سی بات تھی جس کی وضاحت محدثین وائمہ دین نے بڑی صراحت سے کر دی ہے، لیکن میرٹھی صاحب نے اپنی کم علمی کی وجہ سے اس آیت کو جنابت سے تیمم میں صریح قرار دے کر امت مسلمہ کے اتفاقی فیصلے صحیح بخاری پر اس طرح کے اعتراضات کر دیے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حق کا ساتھ دینے کی توفیق عطا فرمائے! آمین۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سولہواں باب

﴿ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ ... ﴾

(نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں)

کے شانِ نزول کے متعلق

کئی جلیل القدر صحابہ سے مروی حدیث

صحیح بخاری میں یہ حدیث موجود ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

أنّ رجلا أصاب من امرأة قبلة، فأتى النّبيّ صلّى اللّٰه عليه وسلّم، فأخبره، فأنزل اللّٰه عزّ وجلّ: ﴿ أَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ﴾، فقال الرّجل: يا رسول اللّٰه! ألي هذا؟ قال: لجميع أمّتي كلّهم.

"ایک آدمی نے ایک (اجنبی) عورت کو بوسہ دے دیا، پھر نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہو کر آپ ﷺ کو بتایا، تو آپ پر یہ فرمانِ باری تعالیٰ نازل ہوا: {دن کے دونوں اطراف اور رات کی گھڑیوں میں نماز قائم کیجیے، یقیناً نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں} اس آدمی نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا یہ صرف میرے لیے ہے؟ فرمایا: میری ساری کی ساری امت کے لیے ہے۔"[1]

اس حدیث کو بہت سے محدثین و ائمہ دین نے صحیح قرار دیا ہے، پھر پوری امت مسلمہ اس کی صحت پر متفق ہو چکی ہے، جیسا کہ علامہ ابن العربی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وهذا صحيح، رواه الأئمّة كلّهم.

---

[1] صحیح بخاری: ۵۲۶، صحیح مسلم: ۲۷۶۳

"یہ حدیث صحیح ہے، اسے سارے ائمہ کرام نے بیان کیا ہے۔۔۔" ❶

علامہ سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: صح من عدة طرق ...

"یہ کئی سندوں سے صحیح ثابت ہے۔۔۔" ❷

لیکن ساری امت و مسلک سے اپنا دامن چھڑاتے ہوئے شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب نے اس پر بھی لایعنی اعتراضات کر دیئے ہیں۔ آیئے ان اعتراضات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہیں۔

فصلِ اوّل: فنی اعتراضات کا جائزہ

سلیمان تیمی کے "ارسال" اور معتمر بن سلیمان کے حافظہ کی تحقیق!

میرٹھی صاحب صحیح بخاری کی اس صحیح حدیث پر پہلا اعتراض یوں کرتے ہیں:

"۔۔۔ اگر ان میں سے کسی کی اسناد میں سلیمان تیمی کا یہ قول مذکور ہوتا کہ سمعت ابا عثمان یا اخبرنی ابو عثمان یا حدثنی ابو عثمان یا انبانی ابو عثمان تو ثابت ہوتا کہ سلیمان تیمی نے ابوعثمان نہدی سے یہ حدیث سنی تھی۔ تب تو یہ اسناد متصل ہوتی، لیکن لفظ عن اتصال پر دلالت نہیں کرتا اور یہ ثابت ہے کہ سلیمان تیمی کثیر الارسال راویٔ حدیث تھے اور بہت سے نامعلوم و مجہول اشخاص سے موصوف نے روایتیں اخذ کی ہیں اور اسناد میں ان کا نام نہیں لیا۔ ایسی روایات کو سلیمان عن کے ساتھ ذکر کیا کرتے تھے۔ اسی لیے اہل علم کا سلیمان تیمی کی روایت کردہ احادیث کے متعلق فیصلہ ہے کہ لا یقبل من حدیثه إلا ما سمّی فیه الذی حدثه به (تهذیب التهذیب)

---

❶ احکام القرآن لابن العربی: ۸٤/۱

❷ الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی: ٤٩/١

سلیمان تیمی کی روایت کردہ وہی حدیث قابل قبول ہے، جس کی اسناد میں اس شخص کا نام مذکور ہو، جس نے سلیمان سے وہ حدیث بیان کی تھی۔

ہاں! سلیمان کے فرزند معتمر کی اسناد میں یہ مذکور ہے کہ سلیمان نے حدثنا ابو عثمان کہا تھا، لیکن معتمر بدحفظ آدمی تھے، یعنی ان کی یادداشت اچھی نہ تھی۔ (تہذیب التہذیب)

لہٰذا یہی سمجھنا چاہیے کہ معتمر نے اس کی اسناد میں عن ابی عثمان کی جگہ حدثنا ابو عثمان غلط کہہ دیا تھا۔

الغرض یہ حدیث سند کے لحاظ سے متصل نہیں ہے۔ سلیمان تیمی کو کسی نامعلوم شخص سے معلوم ہوئی تھی۔ اس نے ابو عثمان نہدی کی طرف اس کی روایت منسوب کی تھی۔ سلیمان تیمی نے اس شخص کا ذکر نہیں کیا اور عن ابی عثمان کہہ کر اس کی روایت کر ڈالی۔۔۔" ❶

جواب ① برقی صاحب نے صحیح بخاری کی اس صحیح حدیث پر پہلا اعتراض یہ کیا ہے کہ سلیمان تیمی یہ روایت بصیغہ عن بیان کر رہے ہیں، لیکن ان کا یہ اعتراض بالکل غلط ہے، کیونکہ خود انہوں نے اقرار کیا ہے کہ معتمر اس حدیث کو سلیمان تیمی بصیغے سماع کی صراحت کے ساتھ نقل کرتے ہیں، جیسا کہ صحیح مسلم ❷ میں موجود ہے۔

معتمر بن سلیمان بالاتفاق ثقہ راوی ہیں

اب اعتراض کی کوئی اور صورت نہ پاتے ہوئے صحیح مسلم کی اس صحیح روایت پر برقی صاحب نے یہ اعتراض داغ دیا ہے کہ معتمر بن سلیمان بدحفظ آدمی تھے، حالانکہ معتمر بن سلیمان بالاتفاق "ثقہ صدوق" راوی ہیں۔

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" (۱/ ۱۴۲، ۱۴۳)

❷ صحیح مسلم: ۲۷۶۳/ ۴۰

۱۔ امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

معتمر بن سليمان ثقة .

''معتمر بن سلیمان ثقہ ہیں۔'' ❶

۲۔ امام ابوحاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

معتمر بن سليمان التيميّ ثقة ، صدوق .

''معتمر بن سلیمان تیمی ثقہ وصدوق راوی ہیں۔'' ❷

۳۔ قرہ بن خالد رحمہ اللہ کہتے ہیں:

ما معتمر عندنا دون سليمان التيميّ .

''ہمارے نزدیک معتمر (اپنے والد) سلیمان تیمی سے (ثقاہت میں) کم نہیں تھے۔'' ❸

۴،۵۔ امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم رحمہ اللہ نے ان کی بہت ساری احادیث کو صحیح قرار دے کر ان کی توثیق کی ہے۔

۶،۷۔ اسی طرح کئی اور ائمہ مثلاً امام الضیاء المقدسی اور امام ابوعوانہ وغیرہم رحمہم اللہ نے بھی ان کی احادیث کو صحیح قرار دے کر ان کی توثیقِ ضمنی کی ہے۔

۸۔ امام ابن سعد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ويكنّى ابا محمّد ، وكان ثقة . ''ان کی کنیت ابو محمد تھی اور یہ ثقہ تھے۔'' ❹

---

❶ الجرح والتعديل لابن ابي حاتم : ۲/۸ ۔ ٤٠، وسندهٔ صحيحٌ

❷ الجرح والتعديل لابن ابي حاتم : ۲/۸ ۔ ٤٠

❸ الجرح والتعديل لابن ابي حاتم : ۲/۸ ۔ ٤٠، وسندهٔ صحيحٌ

❹ الطبقات الكبرى لابن سعد : ۷/ ۲۹۰.

۹. امام عجلی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

معتمر بن سلیمان التیمی بصری ، ثقة .

"معتمر بن سلیمان تیمی بصرہ کے رہنے والے ثقہ راوی ہیں۔" ❶

۱۰. امام ابن حبان رحمہ اللہ نے ان کو "ثقہ" قرار دیا ہے۔ ❷

۱۱. امام حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

تقول : إن المعتمر بن سليمان أحد أئمة الحديث

"ہم کہتے ہیں کہ معتمر بن سلیمان حدیث میں سے ایک ہیں۔" ❸

۱۲. علامہ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وكان رأسا في العلم والعبادة كأبيه .

"وہ علم وعبادت میں اپنے والد کی طرح ہی سردار تھے۔" ❹

۱۳. اسی طرح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سمیت دیگر محدثین نے بھی معتمر بن سلیمان کو بالاتفاق ثقہ قرار دیا ہے۔

کسی ایک ثقہ محدث سے بھی ان کے حافظے پر جرح کرنا ثابت نہیں۔

معتمر بن سلیمان پر جرح کی حقیقت

ہاں! حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام یحییٰ بن سعید القطان سے ضرور یہ نقل کیا ہے کہ:

---

❶ معرفة الثقات للعجلي : ٢/٢٨٦

❷ الثقات لابن حبان : ٧/٥٢١

❸ المستدرك على الصحيحين للحاكم ، تحت حديث : ٢٩٧

❹ الكاشف للذهبي : ٥٥٤٦

إذا حدثكم المعتمر بن سليمان بشيء، فاعرضوه، فإنه سيّئ الحفظ.

"جب تمہیں معتمر بن سلیمان کوئی حدیث بیان کرے تو اس سے اعراض کرو، کیونکہ اس کا حافظہ خراب تھا۔" [1]

لیکن امام ابن القطان رحمہ اللہ کے اس قول کی کوئی متصل سند ہمیں نہیں مل سکی۔ البتہ حافظ ابوالولید سلیمان بن خلف الباجی رحمہ اللہ (۴۰۳۔۴۷۴ھ) نے اس کی سند یوں ذکر کی ہے:

قال أحمد بن عليّ بن مسلم: حدثنا مجاهد بن موسى، سمعت يحيى بن سعيد يقول: إذا حدثكم... [2]

لیکن ابوالولید الباجی اور احمد بن علی بن مسلم کے درمیان تقریباً ۱۱۳ سالوں کا فاصلہ ہے، کیونکہ سلیمان بن خلف الباجی ۴۰۳ ہجری میں پیدا ہوئے ہیں، جبکہ احمد بن علی بن مسلم ۲۹۰ ہجری میں فوت ہو چکے تھے۔ نامعلوم کس نے ابوالولید الباجی کو بتایا تھا کہ احمد بن علی بن مسلم نے اپنی سند سے امام یحییٰ بن سعید القطان سے یہ بیان کیا تھا؟

میرٹھی صاحب کی یہ "عادتِ مبارکہ" قارئین نوٹ فرماتے رہتے ہیں کہ وہ دو ایسے "غیر مدلس" راویوں کے بارے میں بھی جن کا آپس میں سماع ولقاء معروف ہو، یہ فرماتے رہتے ہیں کہ "عن" سے بیان کرنے کی وجہ سے شبہ ہے کہ اس شاگرد نے اپنے استاذ سے ڈائریکٹ یہ حدیث نہ سنی ہو، بلکہ کسی نامعلوم راوی نے اسے اس کے استاذ کی طرف منسوب کر کے حدیث سنا دی ہو اور اس نے اس نامعلوم کا نام لیے بغیر یونہی بیان کر دی ہو۔

لیکن یہاں پر میرٹھی صاحب کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ ابوالولید الباجی کی تاریخ پیدائش اور احمد بن علی بن مسلم کی تاریخ وفات ہی دیکھ لیتے!

---

[1] تهذيب التهذيب لابن حجر: ٢٠٤/١٠

[2] التعديل والتجريح لمن خرج له البخاري في الجامع الصحيح للباجي: ٨٤٠/٢

رہا ابن خراش کا معتمر بن سلیمان کے حافظے کو خراب قرار دینا تو عرض ہے کہ میرٹھی صاحب علمی لحاظ سے بالکل ہیچ میدان ہیں۔ انہیں کھرے کھوٹے کی ذرا برابر بھی پہچان نہیں ہے، کیونکہ عبدالرحمن بن یوسف بن خراش کا کسی راوی کو "ضعیف" قرار دینا کوئی حیثیت نہیں رکھتا، ابن خراش تو خود رافضی خبیث تھا۔

حافظ ابو زرعہ محمد بن یوسف جرجانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

كان خرج مثالب الشيخين، وكان رافضيا.

"اس نے شیخین (سیدنا ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما) کی گستاخی پر مبنی تصانیف کی ہیں اور یہ رافضی شخص تھا۔" ❶

مزید تفصیل کے لیے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی کتاب لسان المیزان ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ ❷

نیز ابن خراش کی جرح نقل کرنے کے بعد علامہ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

قال ابن خراش: يخطئ من حفظه، وإذا حدث من كتابه، فهو ثقة، قلت: هو ثقة مطلقا...

"ابن خراش نے کہا ہے کہ وہ (معتمر) اپنے حافظے سے بیان کرنے میں غلطی کرتے تھے، جب یہ اپنی کتاب سے بیان کریں تو ثقہ ہوتے ہیں۔ میں (ذہبی) کہتا ہوں کہ وہ (حافظے سے بیان کریں یا کتاب سے) مطلق طور پر ثقہ ہیں۔" ❸

آپ نے دیکھا کہ کس طرح میرٹھی صاحب نے ایک ثقہ امام پر بلا وجہ جرح کی نشتر چلائے۔

---

❶ تاریخ بغداد للخطیب: ۱۰/۲۸۰، و سندہ صحیح

❷ لسان المیزان: ۳/۴۴۴

❸ میزان الاعتدال للذہبی: ۴/۱۴۲

"سماک بن حرب نہایت غلط بیان اور غیر ثقہ شخص تھا۔ شاید اس نے سلیمان تیمی کی روایت کردہ حدیث سن لی تھی۔ اپنی طرف سے اس کی دوسری سند گھڑ لی اور مضمون میں کچھ رد و بدل کرکے اس کی روایت کر ڈالی۔ افسوس ترمذی پر ہے۔ ترمذی نے سماک بن حرب کی یہ حدیث تخریج کرکے اسے "حسن صحیح" بتا دیا ہے، حالانکہ یہ "صحیح منکر" ہے۔۔۔" ❶

جائزہ: دیکھئے آپ نے کہ حدیث اور محدثین کے خلاف میرٹھی صاحب نے اپنی زبان کو کیسے تلوار بنایا ہوا ہے! حالانکہ یہ سارا افسوس خود ان کو اپنی عقل پر ہونا چاہیے تھا، کیونکہ سماک بن حرب رحمہ اللہ "صدوق، حسن الحدیث" درجے کے راوی ہیں۔

بہت سے ائمہ کرام نے ان کو "ثقہ وصدوق" قرار دیا ہے، جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ البتہ یہ وضاحت ضروری ہے کہ بعض ائمہ نے جو سماک بن حرب کو "ضعیف" قرار دیا ہے، وہ تضعیف مطلق نہیں، بلکہ بعض خاص مقامات پر ہے۔

سماک بن حرب کی صرف عکرمہ سے روایات "مضطرب" ہیں، نیز وہ آخری عمر میں حافظے کی خرابی کا شکار ہو گئے تھے، لہٰذا ان سے جن شاگردوں نے حافظے کی خرابی کے بعد سنا ہے، ان کی احادیث "ضعیف" ہوں گی۔

جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

قال يعقوب: وروايته عن عكرمة خاصة مضطربة، وهو في غير عكرمة صالح، وليس من المتثبتين، ومن سمع منه قديما مثل شعبة وسفيان فحديثهم عنه صحيح مستقيم، والذي قاله ابن المبارك إنما نرى أنه فيمن سمع منه بآخره. . .

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" (1/139-140)

"امام یعقوب نے فرمایا ہے کہ اس (سماک بن حرب) کی صرف عکرمہ سے روایت "ضعیف" ہے۔ عکرمہ کے علاوہ دوسرے راویوں سے بیان کرنے میں سماک صالح (حسن الحدیث) ہیں، ہاں وہ بہت بڑے ثقہ راویوں میں سے نہیں ہیں۔ جن شاگردوں نے ان سے (حافظہ کی خرابی سے) پہلے کا سماع کیا ہے، جیسا کہ امام شعبہ اور امام سفیان ہیں، ان کی حدیث سماک بن حرب سے صحیح اور درست ہوتی ہے۔ امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے جو فرمایا ہے (کہ وہ ضعیف ہے) ہم اسے سمجھتے ہیں کہ وہ ان شاگردوں کے بارے میں ہے، جنہوں نے سماک سے آخری عمر میں (حافظہ خراب ہونے کی حالت میں) سنا ہے۔۔۔" [1]

دیگر بہت سے محدثین کرام نے بھی اس سے ملتی جلتی بات کی ہے۔ سب کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔

معلوم ہوا کہ سماک بن حرب رحمہ اللہ کے استاذ اگر عکرمہ ہوں یا ان کے شاگرد امام شعبہ وسفیان کے علاوہ کوئی اور ہوں تو ان کی حدیث "ضعیف" ہوتی ہے، لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو، یعنی سماک بن حرب کے شیخ عکرمہ کے علاوہ ہوں اور شاگرد امام شعبہ وسفیان ہوں تو ان کی حدیث بالکل صحیح ہوتی ہے۔

اب آیئے خود میرٹھی صاحب کی زبانی امام ترمذی رحمہ اللہ کی ذکر کردہ حدیث سماک کے بارے میں معلوم کرتے ہیں کہ وہ سماک کے کن اساتذہ اور کن شاگردوں کی بیان کردہ ہے؟

"سماک سے اس کی روایت شعبہ واسرائیل بن یونس وابو الاحوص اور سفیان ثوری نے کی ہے۔ شعبہ کو سماک نے بتایا کہ مجھے یہ حدیث ابراہیم نخعی سے، ابراہیم کو اسود بن یزید نخعی سے،

[1] تهذيب التهذيب لابن حجر: ٤/٢٠٤

اسود کو عبداللہ بن مسعودؓ سے پہنچی ہے۔" ❶

آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے کہ برقی صاحب کے اقرار کے ساتھ۔ امام ترمذی کی جس حدیث میں سماک بن حرب کے استاذ عکرمہ نہیں، بلکہ ابراہیم نخعی ہیں، جبکہ ان کے شاگردوں میں سے شعبہ اور سفیان ثوری بھی اس حدیث کو بیان کر رہے ہیں، لہٰذا اس حدیث کو "حسن صحیح" کہنے میں برقی صاحب کا امام ترمذی پر یہ افسوس دراصل خود اپنی کم علمی پر ہے!

یہ ہے برقی صاحب کا مبلغ علم، اور ان کا اعتراض ہے امت مسلمہ کے اتفاقی فیصلے صحیح بخاری پر! قارئین کرام خود ہی فیصلہ کریں کہ جس شخص کی رجال حدیث، اصول حدیث اور اصول تفسیر کے بارے میں علمی حالت اتنی کمزور ہو وہ اس کتاب صحیح بخاری پر اعتراضات کرتا کیسا ہے؟

فصلِ ثانی: عقلی اعتراضات کا جائزہ

❀ کیا مکی سورت میں مدنی واقعہ "نہایت غیر معقول" ہے؟

مذکورہ فنی اعتراضات کرنے کے بعد برقی صاحب محدثین کے بارے میں لکھتے ہیں:

"کاش وہ قرآن مجید کھول کر سورۂ ہود کے آخری رکوع میں اس آیت سے پہلی دو آیتیں اور بعد کی ایک آیت پڑھ لیتے تو شاید اس غلط حدیث کو روایت کرنے کی غلطی نہ کرتے اور یہ تو ان آیات کو نہ پڑھنے اور نہ سمجھنے کی غلطی سلیمان تیمی کے تلامذہ اور ان کے تلامذہ سے ہوئی ہے۔"

ان راویان حدیث کو یہ احساس نہ ہوا کہ سورۂ ہود، جس کے آخری رکوع میں آیت ﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ﴾ ہے، مکی سورت ہے اور جو قصہ اس میں مذکور ہے اگر

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱۳۶/۱

ہوا ہے تو مدینہ میں ہوا ہے، یعنی ایک شخص کا ایک اجنبی عورت کو چوم لینا، پھر نادم ہو کر خدمت نبوی میں حاضر ہونا اور اس جرم کا کفارہ معلوم کرنا۔

پس اگر یہ آیت اس موقع پر نازل ہوئی تھی تو لامحالہ یہ آیت مدنیہ ہوئی، حالانکہ اس آیت سے پہلی تمام آیتیں اور اس کے بعد کی تمام آیتیں آخر سورت تک مکیہ ہیں۔ مکی آیات کے درمیان کسی آیت کے مدنیہ ہونے کا قائل ہونا باطل اور نہایت غیر معقول بات ہے۔" [1]

① میرٹھی صاحب کے اس اعتراض سے صحیح بخاری کی صحت میں تو کوئی فرق نہیں آیا، البتہ خود میرٹھی صاحب کا علمی میدان میں ہیچ ہونا خوب واضح ہو گیا ہے۔ میرٹھی صاحب کے بقول مکی سورت میں کسی مدنی آیت کا ہونا محال ہے اور ایسا کہنا باطل اور غیر معقول ہے، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔

کاش کہ میرٹھی صاحب نے صحیح بخاری کی تفسیری روایات پر اعتراضات کرنے سے پہلے علوم القرآن پر لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کر لیا ہوتا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو شاید یہ اعتراض کرنے کی شدید غلطی نہ کرتے، کیونکہ مکی سورتوں میں مدنی آیات کا ہونا اور مدنی سورتوں میں مکی آیات کا ہونا علوم القرآن کے مستقل باب ہیں۔ جن علمائے کرام نے علوم القرآن پر کتابیں لکھی ہیں، انہوں نے اس بات کا خصوصی ذکر کیا ہے۔

سردست ہم اس بارے میں کچھ علمائے تفسیر کے اقوال پیش کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں:

حافظ بغوی رحمہ اللہ (۴۳۶۔۵۱۰ھ) اسی سورۂ ہود کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

مكية إلا قوله ﴿ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ ﴾ ...

"یہ سورت مکی ہے، سوائے اس فرمانِ باری تعالیٰ کے: ﴿ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۳۳۔۱۳۵

النَّهَارِ ﴾ (کہ یہ مدنی ہے)۔۔۔" ❶

مشہور مفسر علامہ قرطبی رحمہ اللہ (٦٠٠-٦٧١ھ) لکھتے ہیں:

وقال ابن عباس وقتادة: إلا آية، وهي قوله تعالى: ﴿ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ ﴾ ...

"سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ اور امام قتادہ تابعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ (یہ سورت مدنی ہے)، سوائے ایک آیت کے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے ﴿ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ ﴾ ۔۔۔" ❷

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے سورۂ ہود میں سے تین آیات کو مدنی قرار دیا ہے، ان میں سے تیسری آیت یہی زیرِ بحث آیت ہے، پھر لکھتے ہیں:

دليل الثالثة ما صح من عدة طرق أنها نزلت بالمدينة في حق أبي اليسر ..

"تیسری آیت (کے مدنی ہونے) کی دلیل وہ حدیث ہے، جو بہت سی سندوں سے صحیح ثابت ہے کہ یہ آیت مدینہ میں صحابیِٔ رسول ابوالیسر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔۔۔" ❸

مذکورہ علمائے تفسیر کے علاوہ دیگر مفسرین مثلاً علامہ خازن، ابن عادل، ابن عطیہ، شربینی وغیرہم نے بھی سورۂ ہود کی اس آیت کو مدنی قرار دیا ہے۔

---

❶ معالم التنزیل للبغوی: ٢/٤٠٢

❷ الجامع لأحكام القرآن للقرطبي: ٩/١

❸ الإتقان في علوم القرآن للسيوطي: ١/١٦

لہٰذا مکی سورتوں میں مدنی آیات کی موجودگی کا انکار کرنا اور اس بنا پر صحیح بخاری کی احادیث پر اعتراض کرنا اصولِ تفسیر سے بے بہرہ ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

④ یہ بات تو معلوم ہے کہ قرآن کریم قریباً تیس برس کے عرصہ میں حالات وواقعات کی مناسبت سے نازل ہوتا رہا۔ کوئی عقل وشعور رکھنے والا مسلمان یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ قرآن کریم کی موجودہ ترتیب وہی ہے، جس ترتیب سے وہ نازل ہوا تھا، بلکہ لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کسی موقع کی مناسبت سے کچھ آیات ایک مضمون کی نازل ہوتیں تو آئندہ وحی میں کسی اور واقعہ کی مناسبت سے کسی اور مضمون کی آیات نازل ہو جاتی تھیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ اپنے اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعے کاتبینِ وحی سے فرماتے کہ اس آیت کو فلاں سورت میں فلاں آیتِ کریمہ کے بعد رکھو۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو اس میں بھلا اشکال ہی کیا ہے کہ مدینہ میں نازل ہونے والی اس آیت کو آپ ﷺ نے مکی سورت میں رکھنے کا حکم دے دیا ہو؟

④ یہ بھی عین ممکن ہے کہ یہ آیت دو مرتبہ نازل ہوئی ہو اور یہ بعید بھی نہیں، جیسا کہ بہت سے اہلِ علم نے اس کی صراحت کی ہے۔

تعددِ نزول عین حق ہے

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ایک آیتِ کریمہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

او تكون نزلت مرّتين، مرّة لهذا السّبب ومرّة لهذا السّبب ...

''یا یہ آیت دو مرتبہ نازل ہوئی ہوگی، ایک مرتبہ ایک وجہ سے اور دوسری مرتبہ دوسرے سبب سے۔۔۔'' [1]

[1] مقدمة في اصول التفسير : ص ۱۷

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

فيحمل على تعدد النزول أو تكرره.

”اسے کئی مرتبہ نازل ہونے یا بار بار نازل ہونے پر محمول کر لیا جائے گا۔“ ❶

نیز لکھتے ہیں:

فنجمع بين هذه الأحاديث بتعدد النزول.

”ہم ان احادیث کے درمیان یہ تطبیق دیں گے کہ آیت کئی مرتبہ نازل ہوئی ہے۔“ ❷

علامہ زرکشی نے بھی کئی بار نازل ہونے والی آیات پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے، اس کے تحت لکھتے ہیں:

وقد ينزل الشيء مرتين تعظيما لشأنه

”بسا اوقات ایک آیت کو اس کی شان بڑھانے کے لیے دو مرتبہ نازل کر دیا گیا ہے۔“ ❸

پھر مثال کے طور پر صحیح بخاری کی اسی حدیث کو پیش کرتے ہوئے، جس پر میرٹھی صاحب نے اعتراض کیا ہے، لکھتے ہیں:

وكما ثبت في الصحيحين عن أبي عثمان النهدي عن ابن مسعود أن رجلا ... فهذا كان في المدينة ... وسورة هود مكية بالاتفاق، ولهذا أشكل على بعضهم هذا الحديث ... ولا إشكال، لأنها نزلت مرة بعد مرة...

---

❶ الإتقان في علوم القرآن للسيوطي: 1/97

❷ الإتقان في علوم القرآن للسيوطي: 1/94

❸ البرهان في علوم القرآن للزركشي: 1/29

وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ ... ﴾ معطوف ہے۔ اس کا ماقبل پر عطف ہے تو کیا یہ کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ معطوف برسوں بعد مدینہ میں اترا ہو۔“ ❶

ثابت ہوا کہ صحیح بخاری کی اس بالکل صحیح حدیث پر میرٹھی صاحب کے اعتراضات ان کی اپنی کم علمی پر مبنی ہیں۔

اللہ تعالیٰ حق کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے! آمین!

❶ [illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ستر ہواں باب

حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ
کی فضیلت میں

حدیث رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ

صلیت خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فعطست، فقلت: الحمد للہ حمداً کثیراً طیباً، مبارکاً فیہ، مبارکاً علیہ، کما یحب ربنا ویرضی، فلما صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصرف، فقال: ((من المتکلم فی الصلاۃ؟)) فلم یتکلم أحد، ثم قالہا الثانیۃ: ((من المتکلم فی الصلاۃ؟)) فلم یتکلم أحد، ثم قالہا الثالثۃ: ((من المتکلم فی الصلاۃ؟)) فقال رفاعۃ بن رافع ابن عفراء: أنا یا رسول اللہ! قال: ((کیف قلت؟)) قال: قلت: الحمد للہ حمداً کثیراً طیباً، مبارکاً فیہ، مبارکاً علیہ، کما یحب ربنا ویرضی، فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ((والذی نفسی بیدہ! لقد ابتدرہا بضعۃ وثلاثون ملکاً، أیہم یصعد بہا))

"میں نے رسول اللہ ﷺ کی اقتداء میں نماز ادا کی، مجھے چھینک آئی تو میں نے کہا الحمد للہ حمداً کثیراً طیباً، مبارکاً فیہ، مبارکاً علیہ، کما یحب ربنا ویرضی۔ جب آپ ﷺ نے نماز سے سلام پھیرا تو فرمایا: نماز میں کلام کرنے والا کون تھا؟ کوئی شخص نہ بولا، پھر آپ ﷺ نے دوسری مرتبہ یہی فرمایا کہ نماز میں کلام کرنے والا کون تھا؟

کوئی نہ بولا، پھر آپ ﷺ نے تیسری مرتبہ یہی فرمایا کہ نماز میں کلام کرنے والا کون تھا؟ اس پر رفاعہ بن رافع ابن عفراء نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! (نماز میں کلام کرنے والا) میں تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: آپ نے کیسے کہا تھا؟ میں نے عرض کی: میں نے یوں کہا تھا الحمد للہ حمداً کثیراً طیباً، مبارکاً فیہ، مبارکاً علیہ، کما یحب ربنا ویرضی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! ان کلمات کی طرف تیس سے زائد فرشتے جلدی کر رہے تھے کہ ان کو کون اوپر لے

کر جاتا ہے ---"❶

اب دیکھیں کہ اس روایت میں صحیح بخاری کی روایت سے کیا اختلاف ہے؟ یہ اختلاف اتنا "شدید" تھا کہ میرٹھی صاحب اسے بیان بھی نہیں کر سکے!

کسی باشعور انسان کو اس میں کوئی شدید یا خفیف اختلاف نظر نہیں آتا۔ ہاں! میرٹھی صاحب کو اس میں جو "شدید اختلاف" نظر آیا ہے، وہ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ صحیح بخاری کی روایت میں رکوع سے سر اٹھاتے وقت ربنا ولک الحمد ... کے الفاظ کہے تھے، جبکہ سنن ابی داؤد اور سنن ترمذی کی روایت میں ہے کہ چھینک آنے پر یہ الفاظ کہے تھے۔

پھر صحیح بخاری کی روایت میں سیدنا رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کا قصہ بیان کیا ہے، جبکہ دوسری روایت میں اپنا واقعہ ذکر کیا ہے، پھر صحیح بخاری میں مبارکا علیہ کے الفاظ نہیں ہیں، جبکہ دوسری روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ کیا یہ اختلاف واقعی "شدید" ہے یا محض میرٹھی صاحب کو ہی "شدید" نظر آیا ہے؟

چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

انّه لا تعارض بينهما، بل يحمل على أنّ عطاسه وقع عند رفع رأس رسول الله صلى الله عليه وسلّم، ولا مانع أن يكنى عن نفسه لقصد إخفاء عمله ...

"دونوں روایات میں کوئی اختلاف نہیں، بلکہ اس کو اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ سیدنا رفاعہ رضی اللہ عنہ کو چھینک عین اس وقت آئی جب رسول اللہ ﷺ نے رکوع سے سر مبارک کو اٹھایا تھا اور کسی راوی کے اپنے نفس کو چھپانے کے لیے ارادی طور پر آپ کو کنایۃً ذکر کرنے میں

❶ سنن ابی داؤد: ۷۷۳، سنن الترمذی: ۴۰۴، واللفظ لہ، وسندہ حسن

کوئی تضاد نہیں ہے۔۔۔" ❶

لیکن سر اٹھاتے وقت یہ الفاظ کہے اور چھینک آنے پر کہنے میں کوئی "شدید اختلاف" نہیں، یعنی چھینک سر اٹھاتے وقت ہی آئی تھی۔ چنانچہ کوئی تعارض نہیں۔ اسی طرح ایک روایت میں ایک آدمی کا قصہ بیان کرنے اور دوسری روایت میں خود اپنا واقعہ ذکر کرنے میں بھی کوئی "شدید اختلاف" نہیں ہے، کیونکہ سیدنا رفاعہ رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ اس طرح بیان کیا تو دوسری مرتبہ اس طرح۔ اگر کوئی شخص اپنا واقعہ کسی وجہ سے اپنا نام بتائے بغیر ذکر کر دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یوں یہ "شدید اختلاف" بھی دور ہوا۔

معلوم ہوا کہ میرٹھی صاحب کے اس اعتراض میں صحیح بخاری کا کوئی قصور نہیں ہے۔

کاش کہ میرٹھی صاحب صحیح بخاری پر اعتراض کرنے سے پہلے فتح الباری ہی پڑھ لیتے! اور اگر انھوں نے فتح الباری کا مطالعہ کیا تھا اور ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس "شدید اختلاف" کو حل کیا ہے تو علمی دیانت داری کا تقاضا یہ تھا کہ یا تو اسے تسلیم کرتے یا تسلیم نہ کرنے کی صورت میں اس پر علمی انداز سے گرفت کرتے!

(۲) رہا میرٹھی صاحب کا یہ کہنا کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے اس اختلاف کو دیکھتے ہوئے اس حدیث کو نظر انداز کیا ہے اور اسے ناقابل التفات قرار دیا ہے تو یہ علمی میدان میں انتہائی غیر علمی حرکت ہے، کیونکہ فن حدیث سے ادنیٰ سا مس رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے کہ امام بخاری یا امام مسلم کا کسی حدیث کا اپنی کتاب میں پیش نہ کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ ان کے نزدیک "ناقابل التفات" یا "ضعیف" ہے، بلکہ علمائے حدیث نے بڑی وضاحت سے بتا دیا ہے کہ ایسا قطعاً نہیں ہے، جیسا کہ:

---

❶ فتح الباری لابن حجر: ۲۸۶/۲

حماد بن سلمہ اور خلف بن خلیفہ کی روایت میں "اختلاف"!

"اور اسی طرح کی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور اس کے دو طریق ہیں۔

ایک حماد بن سلمہ کا دوسرا ایک خلف بن خلیفہ کا

حماد بن سلمہ کی روایت اور خلف بن خلیفہ کی روایت کا اختلاف ظاہر ہے۔۔۔

اس طرح کی روایات ناخدا ترس واعظوں کی بیان کردہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور اس کا ذکر یقیناً خیر عظیم اور نہایت مبارک عمل ہے لیکن یہ کہنا کہ بارہ سے زائد فرشتوں یا تیرہ یا چونتیس فرشتوں کے جھپٹنے یا بارگاہِ حق میں لے جانے کے لیے مسابقت کرنے کی بات واعظوں کا بے عمل افسانہ ہے۔

کسی نے اس کا تعلق رکوع کے بعد قومہ سے بتایا ہے، کسی نے نماز میں چھینکنے کی کہانی بیان کر دی۔ کسی نے نماز شروع کرنے سے اسے جوڑ دیا، کسی نے مجلس میں بیٹھنے کے آداب میں داخل کر دیا۔۔۔" ①

تبصرہ: ① میرٹھی صاحب کی بیان کردہ اس حدیث کا صحیح بخاری سے کوئی تعلق ہے، نہ ہی صحیح بخاری میں مذکور سیدنا رفاعہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے کوئی ربط، بلکہ یہ واقعہ ہی اور ہے۔ اگر ایک شخص کے ایک حالت میں یہ کلمات کہنے پر تیس سے زائد فرشتے آئے ہیں جبکہ دوسرے شخص کے کسی دوسری حالت میں یہ کلمات کہنے سے بارہ فرشتے آئے ہیں تو بھلا اس میں کونسا اشکال ہے؟ ہر شخص کی نیت، عمل اور ہر حالت کی نیکی کا نتیجہ الگ ہوتا ہے۔

اس کو بنیاد بنا کر صحیح بخاری کو اعتراضات کا ہدف بنانا صریح جہالت یا ہٹ دھرمی ہے۔

لہٰذا ہم اس کی تفصیل میں پڑ کر اپنے موضوع "صحیح بخاری" سے خارج نہیں ہونا چاہتے۔

---

① صحیح بخاری کا مطالعہ، ص ۱۴۲-۱۴۳

انصاف پسند لوگ ہماری ذکر کردہ تحقیق سے برقی صاحب کے اعتراضات کی وقعت و حیثیت بخوبی جان لیں گے۔ ان شاء اللہ!

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں حق کو پہچاننے اور پھر اس پر ڈٹ جانے کی توفیق عطا فرمائے!

آمین!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اٹھارہواں باب

منافقین کی طرف سے سیدہ عائشہ پر بہتان کا واقعہ

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر منافقین نے تہمت لگائی، جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کی براءت نازل کی۔ چودہ سو سال تک سب مسلمان مفسرین سورۂ نور کی آیاتِ براءت کی تفسیر میں یہی حدیث بیان کرتے رہے ہیں۔ سب مسلمانوں کا اس پر اعتقاد تھا، لیکن چودہ سو سال بعد شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب نے اسے "اوّل تا آخر جھوٹ" قرار دے دیا ہے اور اس پر بہت سے اعتراضات وارد کیے ہیں۔

آئیے ان کے اعتراضات کا منصفانہ جائزہ لیتے ہیں:

اجمالی جواب

بخاری و مسلم کی احادیث کے صحیح ہونے پر امت کے اجماع و اتفاق کی قطعی و عمومی دلیل تو ہے ہی، لیکن اس سے قطع نظر خاص حدیثِ افک کی صحت پر بھی ساری امت کے محدثین کا اجماع و اتفاق ہے۔ شروع سے لے کر آج تک کے علماء و محدثین نے عقیدہ، تفسیر، حدیث، لغت اور دیگر کتابوں میں اس حدیث سے حجت لی ہے۔ آئیے اس کا سرسری سا خاکہ دیکھتے ہیں:

حدیثِ افک عقائد میں

آئیے ہم بعض ان ائمہ کرام کا اختصاراً ذکر کرتے ہیں، جنھوں نے حدیثِ افک کو عقیدہ کی کتابوں میں ذکر کیا ہے:

① امام عبداللہ بن احمد بن حنبل رحمہ اللہ (۲۱۳-۲۹۰ھ) ❶

② امام آجری رحمہ اللہ (م ۳۶۰ھ) ❷

③ امام بیہقی رحمہ اللہ (م ۴۵۸ھ) ❸ وغیرہم

دین میں عقیدے کی اہمیت کسے معلوم نہیں، کیا برقی صاحب کے بقول جو "کہانی شروع سے آخر تک جھوٹ ہی جھوٹ" ہو اس سے محدثین نے مسلمانوں کو عقیدہ ثابت کر کے دیا ہے؟ اس پر طرہ یہ کہ کسی ایک محدث نے بھی ان کے اس کام کو غلط قرار نہیں دیا، کیا مسلمانوں کے سلف صالحین اپنے عقیدے کی بنیاد جھوٹی کہانیوں پر رکھتے تھے؟؟؟

حدیثِ افک کو جھوٹ قرار دینا (نعوذ باللہ) سلف صالحین کو بد عقیدہ قرار دینے کی ایک خفیہ سازش ہے۔ جو شخص سلف صالحین کے بارے میں ایسا ذہن رکھتا ہے اس کے عقیدے کی حالت کیا ہوگی؟

حدیثِ افک تفسیر میں

درج ذیل علمائے تفسیر نے اس حدیث کو سورۂ نور کی تفسیر میں پیش کیا ہے۔

① امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ (م ۳۱۰ھ) ❹

② امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم رحمہ اللہ (م ۳۲۷ھ) ❺

---

❶ السنۃ لعبد اللہ بن احمد: ۱/۲۴۳

❷ الشریعۃ للآجری: ۵/۲۰۰

❸ الاسماء والصفات للبیہقی: ۲/۱۵۱

❹ تفسیر الطبری: ۱۸/۱۰۱

❺ تفسیر ابن ابی حاتم: ۱۰/۳۴

③ امام ابو محمد الحسین بن مسعود بغوی رحمہ اللہ (م ۵۱۰ھ) ❶

④ امام ابو الفداء اسماعیل بن کثیر رحمہ اللہ (۷۰۰ھ۔۷۷۴ھ) ❷

⑤ علامہ ابو عبد اللہ محمد بن عمر رازی (۵۴۴ھ۔۶۰۶ھ) ❸

⑥ علامہ قرطبی رحمہ اللہ (م ۶۷۱ھ) ❹

⑦ علامہ سیوطی رحمہ اللہ (۸۴۹۔۹۱۱ھ) ❺ وغیرہم

سب مفسرین کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا صرف اتنی بات یاد رہے کہ صحابہ کرام اور تابعین عظام سے لے کر آج تک جتنے بھی مسلمانوں نے قرآن کریم کی تفاسیر لکھی ہیں، سب نے بالاتفاق سورۂ نور کی آیت مبارکہ کہ

﴿إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ ...﴾ ❻

کی تفسیر میں یہی حدیث افک ہی اس آیت کا شانِ نزول بتایا ہے، بلکہ اس کی صحت پر سب کا یقین بھی تھا، بعض نے اس روایت کی صراحت بھی کر دی ہے جیسا کہ علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

وسبب نزولها ما رواه الأئمة من الحديث الإفك الطويل في قصة عائشة رضوان الله عليها، وهو خبر صحيح مشهور، أغنى اشتهاره عن ذكره، وسيأتي مختصرا.

---

❶ معالم التنزیل بغوی ۳/۳۴۷

❷ تفسیر ابن کثیر ۳/۲۷۲

❸ مفاتیح الغیب رازی ۲۳/۱۵۰

❹ الجامع لاحکام القرآن قرطبی ۱۲/۱۹۷

❺ الدر المنثور سیوطی ۶/۱۵۴

❻ النور ۲۴/۱۱

"اس آیت کا شانِ نزول وہ طویل حدیثِ افک ہے جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ہے، یہ حدیث صحیح و مشہور ہے، اس کی شہرت نے یہاں اس کے تذکرے کی ضرورت کو ختم کر دیا ہے۔ عنقریب اس کا مختصر بیان آئے گا۔" ❶

علامہ ابو عبداللہ محمد بن عمر بن الحسن بن الحسین الرازی (م ۶۰۶ھ) لکھتے ہیں:

واجمع المسلمون علی ان المراد ما افک به علی عائشة.

"تمام مسلمانوں کا اس بات پر اجماع و اتفاق ہے کہ اس آیت سے مراد سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر لگائی گئی تہمت والا واقعہ ہے۔" ❷

ہمارا میرٹھی صاحب کے معتقدین سے سوال ہے کہ علامہ رازی سے پہلے کسی مسلمان سے اس حدیث کا انکار ثابت کریں، ورنہ اجماعِ امت سے کنارہ کش ہو کر نیا راستہ اختیار نہ کریں۔

نیز ان سے سوال ہے کہ کیا صحابہ و تابعین اور ائمہ محدثین میں سے کسی کو میرٹھی صاحب جتنی بھی عقل نصیب نہیں ہوئی تھی؟ اگر اس بات میں کوئی وزن ہوتا تو سب نہیں، چلو کوئی ایک محدث ہی یہ کہہ دیتا کہ "افک کی کہانی جو شروع سے آخر تک جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔"

ایسی عقل تو اللہ تعالیٰ کسی دشمن کو بھی نہ دے جو ساری کائنات کی عقلوں کو ناقص قرار دے کر اپنے آپ کو کامل قرار دے!!!

حدیثِ افک کتبِ حدیث میں

جب سے تدوینِ حدیث کا آغاز ہوا ہے، ائمہ محدثین بالتواتر حدیثِ افک کو اپنی کتابوں میں درج فرماتے آئے ہیں۔

---

❶ تفسیر القرطبی ۱۲/۱۹۷

❷ التفسیر الکبیر للرازی ۲۳/۱۷۳

③ امام ابو عبد الرحمٰن احمد بن شعیب النسائی رحمہ اللہ (۲۱۵ـ۳۰۳ھ) ❶

④ امام ابو عبد اللہ محمد بن یزید بن ماجہ القزوینی (۲۰۷ـ۲۷۵ھ) ❷

⑤ امام موصوف کے بعد آنے والے ان محدثین کرام نے اسی حدیث کو بطور استدلال پیش کیا ہے:

① امام ابو یعلیٰ احمد بن علی بن المثنیٰ بن یحییٰ الموصلی رحمہ اللہ (۲۱۰ـ۳۰۷ھ) ❸

② امام ابو محمد عبد اللہ بن علی بن الجارود النیسابوری رحمہ اللہ (م ۳۰۷ھ) ❹

③ امام ابو حاتم محمد بن حبان بن احمد البستی رحمہ اللہ (م ۳۵۴ھ) ❺

④ امام ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی رحمہ اللہ (۲۶۰ـ۳۶۰ھ) ❻

⑤ امام ابو بکر احمد بن الحسین بن علی بن عبد اللہ البیہقی رحمہ اللہ (۳۸۴ـ۴۵۸ھ) ❼

پھر امت نے اس حدیث کی صحت پر اتفاق بھی کر لیا تھا، کسی نے اسے باطل یا جعلی نہیں کہا۔ کیا میرٹھی صاحب کے خیال میں وہ ائمہ حدیث جن کے ذریعے حدیث ان تک پہنچی ہے، سب کے سب حدیث کے فہم میں قلیل تھے؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو یہ ان کے اپنے فہم کی خرابی ہے جس کا وہ دوسروں کو الزام دے رہے ہیں۔

---

❶ السنن الكبرى للنسائي: ١١٢٥١

❷ سنن ابن ماجه: ٢٣٤٧

❸ مسند أبي يعلى: ٢١٨/٨

❹ المنتقى من السنن المسندة لابن الجارود: ٧٢٢

❺ صحيح ابن حبان: ٢٠٠٣

❻ المعجم الكبير للطبراني: ٨٣/٢٣

❼ السنن الكبرى للبيهقي: ٣٦/١٠

تفصیلی جوابات

فصلِ اوّل: فنی اعتراضات کا جائزہ

"راوی معلوم اور مروی مجہول" کی تحقیق!

"ابن شہاب زہری کا بیان یہ ہے کہ میں نے یہ قصہ کچھ سعید بن مسیب سے سنا ہے، کچھ عروہ بن زبیر سے، کچھ علقمہ بن وقاص لیثی سے، کچھ عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود سے، ان میں سے کسی نے مجھے پورا قصہ نہیں سنایا، مگر ان چاروں سے سنی ہوئی باتوں کو جوڑنے سے پورا قصہ یہ بنتا ہے۔۔۔۔ پس اس اسناد میں دو قصور ہیں، اول یہ کہ راوی تو ثقہ ہیں اور زہری نے ان کا نام بتایا ہے کہ وہ فلاں اور فلاں چار اشخاص ہیں، لیکن ان میں سے کسی بھی راوی کی بیان کردہ بات زہری نے متعین طور پر نہیں بتائی، پس راوی معلوم ہے اور مروی مجہول اور یہ ضعف کے اسباب میں سے ایک سبب ہے، جیسے وہ روایت ضعیف و غیر معتبر ہے جس میں راوی مجہول اور مروی معلوم ہو، اسی طرح وہ روایت بھی ضعیف و غیر معتبر ہے جس میں راوی معلوم ہو اور مروی مجہول ہو۔" [1]

① یہ اتنی ہی بے غلط بات ہے جتنی دن کو رات قرار دینے والی بات غلط ہے۔ اگر اس "اصول" کی کوئی دلیل ہوتی تو پیش کی جاتی، نہ معلوم اسے "ضعف کے اسباب میں سے ایک سبب" کس نے شمار کیا ہے؟ ورنہ عقل سے بھی کام لیا جائے تو بھی یہی معلوم ہوگا کہ ہر جگہ مروی کا مجہول ہونا روایت کے "ضعف" کا سبب نہیں بنتا، کیونکہ اگر چار راویوں میں سے کوئی ایک یا زائد راوی ناقابلِ اعتبار ہوں اور سب کی بات اکٹھی بیان کر دی جائے تو پھر

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۷۴۔۱۷۵

روایت کے جس حصے سے بھی استدلال کیا جائے گا، وہاں احتمال ہوگا کہ شاید یہ ''ضعیف'' راوی کا بیان کردہ ہو، لیکن جب چاروں راوی ''ثقہ'' ہوں تو پھر جس حصے سے بھی دلیل لی جائے، کوئی اعتراض کسی صورت میں بھی وارد نہیں ہونا چاہیے۔

(۴) رہی اصولِ محدثین کی بات تو آج تک کسی محدث نے ایسی صورت میں روایت کے ''ضعیف'' ہونے کا حکم نہیں لگایا، بلکہ وہ اسے موجب جرح خیال نہیں کرتے تھے، جیسا کہ اسی حدیث افک کی صحت پر محدثین، مفسرین اور دوسرے علمائے دین کا اجماع و اتفاق کر کے ہم نے بیان کر دیا۔ کوئی ''میرٹھی'' دنیا کے کسی ایک محدث سے بھی حدیث افک کا ''ضعیف'' ہونا ثابت کرے!

الحمد للہ! ہماری اس بحث سے محدثین کرام کا ایک بڑی واتفاقی اصول ثابت ہوگیا ہے کہ جب سب راوی معلوم و ''ثقہ'' ہوں اور مروی بحثیں روایت کردہ حدیث مجہول ہو تو اس پر کوئی کلام نہیں ہو سکتی۔ اس کو ''ضعیف'' کہنے والا اصطلاحوں کی راہ سے ہٹا ہوا ہے۔

غیر مدلس راویوں کے سماع کی تصریح کا مسئلہ!

''دوسرا قصور یہ ہے کہ ان چاروں میں سے کسی راوی کی یہ تصریح مذکور نہیں کہ اس نے خود ام المومنین سے یہ قصہ سنا تھا اور ظاہر عبارت سے یہی مستفاد ہوتا ہے کہ ان چاروں کو دیگر اشخاص نے حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب کر کے یہ قصہ سنایا تھا، کیونکہ اگر سعید بن مسیب و علقمہ بن وقاص و عروہ بن زبیر و عبیداللہ بن عبداللہ نے براہِ راست حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ قصہ سنا ہوتا تو عبارت یوں ہوتی:

ذكروا أنهم سمعوا عائشة الصديقة تقول یا ذكروا أن عائشة حدثتهم، قالت..

پس فی الواقع یہ زہری کی "مرسل" یعنی منقطع روایت ہے، یعنی ہم یہ تو یقین رکھتے ہیں کہ زہری نے یہ داستان خود نہیں گھڑی، بلکہ فی الواقع مجموعی طور پر یہ داستان زہری نے سعید بن مسیب وعروہ بن زبیر وعلقمہ وعبیداللہ بن عبداللہ سے سنی تھی، لیکن ان چاروں شخصوں نے خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ قصہ نہیں سنا تھا، بعض اشخاص نے انہیں بتادیا تھا کہ ام المومنین نے یہ بیان کیا تھا، وہ کون اشخاص تھے؟ اس کا علم نہیں، پس سند کے اعتبار سے یہ روایت کے زہری کی مرسل روایات میں سے ہے جو بہ اتفاق اہل علم یا قابل اعتماد اور عموماً غلط ہوتی ہیں، اہل علم نے کہا ہے:

مراسیل الزّھری شرّ المراسیل ." [1]

جواب: یہ اعتراض میرٹھی صاحب کے اصول حدیث سے کورا ہونے کی واضح دلیل ہے، کیونکہ محدثین نے روایت کے صحیح ہونے کے لیے سماع کی تصریح کی شرط صرف خاص قسم کے راویوں کے لیے لگائی ہے، جن کو اصطلاح محدثین میں "مدلّس" کہتے ہیں، یعنی ایسے راوی جو اپنے استاذ کا نام چھوڑ کر ایسے اگلے راوی سے سماع کے احتمال والے لفظوں کے ساتھ حدیث بیان کردیتے ہیں، جس سے انھوں نے اور احادیث تو سنی ہوتی ہیں، لیکن یہ حدیث نہیں سنی ہوتی۔

الحمد للہ صحیح بخاری کے ان چاروں راویوں میں سے ایک بھی راوی ایسا نہیں جو "مدلّس" ہو۔ اگر کسی میں ہمت ہو تو آزمالے اور نہ صحیح بخاری جو امت کے اجماعی فیصلے کے مطابق صحیح ہے، اس پر ایسے اعتراضات کا کوئی تک نہیں۔

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۷۵۔۱۷۶

میرٹھی صاحب کی بے اصولی

اس اعتراض سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معترض اصول حدیث سے تھوڑا بہت نہیں، بلکہ مطلق ناواقف ہوتے ہیں۔ رہی عقل کی بات تو صحیح بخاری کی مخالفت نے ان سوچنے سمجھنے سے بھی عاری کر دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں کہ میرٹھی صاحب نے اس روایت کو زہری کی مراسیل میں سے شمار کیا ہے حالانکہ:

اولاً تو راجح قول کے مطابق "مرسل" کی تعریف یہ ہے کہ کوئی تابعی براہِ راست رسول کریم ﷺ سے روایت کرے لہٰذا یہ روایت "مرسل" ہے ہی نہیں، بلکہ "منقطع" ہے۔

ثانیاً: اگر اس "منقطع" روایت کو مرجوح قول کے مطابق "مرسل" شمار کر بھی لیا جائے تو بھی یہ "زہری کی مرسل" نہیں ہوگی۔ زہری کی "مرسل" وہ ہوگی جو امام زہری ایسے راوی سے بیان کریں، جس سے ان کی ملاقات ثابت نہ ہو، حالانکہ خود میرٹھی صاحب صراحت کر رہے ہیں کہ امام زہری رحمہ اللہ نے یہ روایت مجموعی طور پر ان چاروں اساتذہ سے سنی ہے۔

ثالثاً: محدثین اور اہل علم کا یہ جو قول امام زہری رحمہ اللہ کی مراسیل کے بارے میں پیش کیا گیا ہے، وہ امام زہری رحمہ اللہ کی ان روایات کے بارے میں ہے جو انہوں نے براہِ راست رسول کریم ﷺ سے بیان کی ہیں، نہ کہ ان روایات کے بارے میں جو زہری رحمہ اللہ نے اپنے اساتذہ سے سنی ہیں!

اگر سند میں موجود اوپر والے راویوں کا ارسال نیچے راویوں کی طرف منسوب کرنا صحیح ہوتا تو پھر اسے میرٹھی صاحب کے مطابق "مرسل بخاری" کہنا زیادہ بہتر ہونا چاہیے تھا نہ کہ "مرسل زہری"!

یہ ہے میرٹھی صاحب کا مبلغ علم اور وہ اعتراض کرتے ہیں امت کے اجماعی فیصلے "صحیح بخاری" پر۔

کیا عروہ نے یہ حدیث سیدہ عائشہ سے نہیں سنی؟

"زہری کی یہ روایت غزوۂ بنی المصطلق کے تحت جو امام بخاری رحمہ اللہ نے درج فرمائی ہے، اس میں ہے۔۔۔ أُخْبِرْتُ أنّه كان يشاع ويتحدث به عنده .....

أُخْبِرْتُ کے معنی ہیں، مجھے خبر دی گئی، کس نے دی اس کا ذکر نہیں، لم يُسَمّ من أهل الأفك... کے معنی ہیں، افک والوں کے بارے میں سے صرف تین شخصوں کا نام زد ذکر کیا گیا ہے۔۔۔۔

اب ظاہر ہے کہ اگر عروہ نے قصۂ افک خود اپنی خالہ حضرت عائشہ سے سنا ہوتا تو أخبرتني کہتے، أُخْبِرْتُ نہ کہتے اور لم تُسَمّ بصیغہ مؤنث معروف کہتے۔۔۔۔

پس بے شک عروہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان لگنے والی داستان سنی تھی، مگر خود حضرت عائشہ سے نہیں، بلکہ کسی اور شخص یا اشخاص سے جن کا نام انہوں نے ذکر نہیں کیا اور جب عروہ نے یہ داستان حضرت عائشہ سے نہیں سنی حالانکہ وہ ام المومنین کے قریبی عزیز یعنی بھانجے تھے تو سعید بن مسیب وغیرہ کا سننا تو اور بھی مستبعد ہے۔۔۔"[1]

① پہلی بات تو یہ ہے کہ عروہ رحمہ اللہ کے یہ لفظ کہ "مجھے خبر دی گئی" "امام زہری نے حدیث بیان کرتے وقت بیان ہی نہیں کیے، بلکہ درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر ایک بات ذکر کی ہے اور اس جملہ معترضہ میں یہ لفظ ہیں۔

حدیث کے شروع میں تو عروہ، سعید بن مسیب، علقمہ اور عبید اللہ رحمہم اللہ سب سے لفظ "عن" کے ساتھ روایت ہے، جو کہ اصولِ محدثین کے مطابق غیر مدلس راوی کی طرف سے بولا گیا ہو تو بالاجماع اتصال شمار ہوتا ہے۔ حدیث دشمنی نے شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب کو مجبور

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۷۵۔۱۷۷

[کر] دیا ہے کہ وہ اس صیغہ مجہول کی نسبت ساری حدیث کی طرف کر دیں جو صرف ایک جملے میں [بو]لا گیا ہے، ورنہ حدیث بیان کرتے وقت راویوں کے ایسے جملہ معترضہ کو اصطلاح میں "ادراج" کہتے ہیں، جو کہ حدیث کے ادنیٰ سے طالب علم سے بھی مخفی نہیں۔ اس لیے اسی جملہ [مع]ترضہ پر ساری حدیث کو محمول کرنا بہت بڑی بے اصولی ہے۔

② دوسری بات یہ ہے کہ اگر پوری حدیث عروہ رحمہ اللہ اس طرح بیان کرتے تو سب [س]ے پہلے محدثین اس پر مطلع ہوتے، کیونکہ عربوں کا مشہور مقولہ ہے:

صاحب البیت أدریٰ بما فیه . (گھر والا اپنے گھر کی زیادہ خبر رکھتا ہے)۔

بھلا میرٹھی صاحب کو علل حدیث سے کیا معرفت جو "مرسل" اور "منقطع" حدیث کا فرق [ب]ھی نہیں سمجھتے، نیز جن کو ادراج کی تعریف بھی نہیں آتی، نہ ہی ان کو "اتصال" و "انقطاع" کا فرق [م]علوم ہے؟؟؟

③ تیسری بات یہ ہے کہ اگر کبھی میرٹھی صاحب کے معتقدین ذرا ٹھنڈے دماغ سے [غ]ور کریں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ میرٹھی صاحب:

"بے شک عروہ نے حضرت عائشہ پر لگنے کی داستان سنی تھی، لیکن خود عائشہ سے نہیں۔۔۔"

کہہ کر اپنے ہی ہاتھوں بے عزت ہو گئے ہیں، کیونکہ خود انہوں نے ہی لکھا ہے کہ:

"ان لوگوں (خارجیوں) نے اسے اس انداز سے مرتب کیا کہ اسے حضرت ام المومنین کے حق میں ہجو ملیح (میٹھی میٹھی مذمت) کہنا بے جا نہ ہوگا۔۔۔ سفر میں گم شدگی کی جو کہانی اس میں پیوست کر دی گئی ہے، وہ بڑی بھاری ہجو و مذمت کی چیز ہے، پھر بریرہ خادمہ کی زبانی ان خبیثوں نے ام المومنین کا پھوڑ اور بے سلیقہ ہونا ظاہر کیا ہے۔" ❶

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱۸۲/۱

نے اس روایت پر اعتراض کا جو جواب دیا وہ دلائل کی رو سے روزِ روشن کی طرح واضح ہے، وہاں انہوں نے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے سمجھ لیا کہ شاید ہم امام بخاری رحمہ اللہ پر اعتراض کر کے صحیح سلامت نکل جائیں گے اور کوئی انہیں لگام دینے والا نہ ہوگا۔ اسے "متصل" اور "صحیح" قرار دینے والوں کے دلائل بغیر ذکر کیے ہضم کر گئے ہیں، حالانکہ اس اختلاف میں حق امام بخاری رحمہ اللہ اور ان ائمہ دین کے ساتھ ہے جو اس حدیث کو صحیح قرار دینے والے ہیں

(ii) علامہ شمس الدین ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ (م ۷۵۱ھ) اس حدیث کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں

وقال آخرون: كلّ هذا لا يرد الرواية الصحيحة التي أدخلها البخاري في صحيحه، وقد قال إبراهيم الحربي وغيره: أنّ مسروقا سألها وله خمس عشرة سنة ومات وله ثمان وسبعون سنة، وأم رومان أقدم من حدثت عنه.

"دوسرے (امام بخاری کے ہم نوا) علمائے کرام کا کہنا ہے کہ یہ سارے اعتراضات بھی اس روایت کو رد کرنے کا موجب نہیں بن سکتے جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں درج کر دیا ہے، ابراہیم حربی کہتے ہیں: مسروق نے پندرہ سال کی عمر میں سیدہ ام رومان رضی اللہ عنہا سے سوال کیا تھا اور جب وہ فوت ہوئے تو ان کی عمر اٹھتر سال تھی، سب سے پہلے انہوں نے ام رومان سے ہی احادیث لی ہیں۔" [1]

(۳) رہی یہ بات کہ سیدہ ام رومان رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کی زندگی میں ہی فوت ہو گئی تھیں اور رسول کریم ﷺ ان کی قبر میں اترے تھے تو اس کی حیثیت ایک افسانے سے زیادہ

[1] زاد المعاد لابن قیم: ۳/ ۱۲۷

کردہ روایت ہے اور وہ ضعیف راوی ہے۔۔۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی التاریخ الاوسط اور التاریخ الصغیر کتاب میں اس پر تنبیہ کی ہے۔۔۔

اور فرمایا ہے کہ مسروق کی (ام رومان سے سماع والی) حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ترین ہے، امام بخاری کی بات بالکل درست ہے۔۔۔

لہٰذا اس (نئے ہوئے افسانے) کی وجہ سے صحیح اور قابل اعتماد روایات کیونکر ضعیف قرار دی جا سکتی ہیں؟" ❶

اب سوچنے کی بات ہے کہ میرٹھی صاحب نے محدثین کے نزدیک بالاتفاق "ثقہ" قرار پانے والے راویوں، مثلاً امام سعید بن جبیر، امام زہری، عطاء بن یسار، علقمہ وغیرہ پر تو جرح کے نشتر چلائے ہیں، نیز "ثقہ غیر مدلس" راویوں کی معنعن (لفظ عن سے بیان کردہ) احادیث کو تو "مرسل یا منقطع" قرار دیا ہے، لیکن اپنے مطلب کی بات آئی ہے تو یہاں علی بن زید بن جدعان جیسے مشہور ومعروف "ضعیف" اور "منکر الحدیث" راوی کی روایت کو دلیل بنا لیا ہے اور قاسم بن محمد کے "ارسال" کو چھپنے سے نکالا ہے۔

تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَى ۔ یہ میرٹھی صاحب کی "بندر بانٹ" ہے!!!

الحاصل:

یہ میرٹھی صاحب کے صحیح بخاری کی بلا تنازع "صحیح" حدیث پر کیے جانے والے فنی اعتراضات کی کل کائنات اور اس ضمن میں ان کی بے اصولیاں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں، جب اصول وضوابط اور نقل کے اعتبار سے اس حدیث کی سند بے غبار ثابت ہو گئی ہے تو اب اس پر

---

❶ فتح الباری، لابن حجر: ۲۷۳/۹

تاریخی و عقلی اعتراض کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ اگر کوئی منکر قرآن کسی آیت قرآنی پر عقلی اعتراضات کرنے لگے کہ میری عقل میں یہ بات درست نہیں تو اسے یہی کہا جائے گا کہ جا کر اپنی عقل کا علاج کروائے۔ لہٰذا سنداً صحیح ثابت ہو جانے کے بعد حدیث افک پر عقلی و تاریخی اعتراضات چنداں معتبر نہیں، نہ ہی ہمارے لیے ان کا جواب دینا ضروری ہے۔

لیکن پھر بھی ہم ایک ایک اعتراض کا جواب دیں گے، تا کہ میرٹھی صاحب کی بے اصولی کی طرح ان کی ''عقلی'' حیثیت بھی لوگوں پر واضح ہو جائے اور وہ کبھی ان کی دام فریب میں نہ آئیں، نیز یہ کار خیر بھی ہے، جیسا کہ ایک حدیث پر مخالفین کے اعتراضات کے جوابات دیتے ہوئے حافظ ابن حزم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وان کنّا غالین عن ذالک .. لکن نصر الحقّ فضیلة، وقمع الباطل وسیلة الی اللّٰہ تعالٰی.

''اگرچہ ہمیں ان اعتراضات کے جوابات دینے کی چنداں ضرورت نہیں، لیکن (صرف اس وجہ سے ایک ایک کا جواب دیں گے کہ) حق کی نصرت نیکی ہے اور باطل کا قلع قمع اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ ہے۔'' [1]

[1] المحلی لابن حزم: ۲۲۹/٤

فصلِ ثانی: عقلی اعتراضات کا جائزہ

سیدہ عائشہ کے جانے کا علم رسولِ اکرم ﷺ کو کیوں نہ ہوا؟

"جب ام المؤمنین قضائے حاجت کے لیے گئی تھیں تو حضور ﷺ کو اس کا علم کیسے نہ ہوا؟ ظاہر ہے کہ وہ آپ کے ساتھ اور آپ کے پاس ہی تو تھیں۔۔۔
بہرکیف حضرت عائشہ کے جنگل جانے اور واپس نہ آنے سے حضور اکرم ﷺ کا بے خبر رہ جانا قطعاً سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔" [1]

① اگر کسی شخص کی عقل و سمجھ دو اور دو کے چار ہونے کا انکار کر دے تو کیا اس حقیقت کا انکار کر دیا جائے گا؟ قطعاً نہیں، بفضل اللہ اس حدیث کی سند و متن پر واقع ہونے والے اصولی و تاریخی اعتراضات کے شافی و کافی جوابات دے کر ہم نے اس کی صحت کو ثابت کر دیا ہے۔ اب بھی اگر کوئی "میں نہ مانوں" کا مصداق بن کر حدیثِ رسول کی قبولیت کے لیے اپنی عقلِ نارسا کو معیار قرار دینے کی سعی کرے تو یہ اس کی مرضی ہے۔

ہم ایسے لوگوں سے سوال کرتے ہیں کہ قرآن کریم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ ایک آدمی اگر ایسا ہی اعتراض قرآن کریم پر کر دے، مثلاً فرمانِ باری تعالیٰ:

﴿ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ﴾ [2]

---

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۳۸

[2] سبا: ۱٤

"جب ہم نے ان (سلیمان علیہ السلام) پر موت کا فیصلہ کیا تو ان (جنوں) کو ان کی موت کی خبر اس زمین کے کیڑے (دیمک) نے ہی دی جو ان کی لاٹھی کو کھا رہا تھا، جب آپ علیہ السلام گر پڑے تو جنوں کی حقیقت واضح ہو گئی کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس رسوا کن عذاب میں نہ پڑے رہتے۔"

اس کے بعد حاشیے میں یہ تبصرہ کرتے ہیں:

"یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر حضرت سلیمان علیہ السلام بے حرکت کھڑے رہے، لیکن جنوں کو پتا ہی نہ چلا کہ وہ فوت ہو گئے ہیں، حالانکہ اپنی زندگی میں آپ علیہ السلام ہر وقت اور ہر کام میں ان کو مناسب احکام دیتے رہتے تھے، نیز سستی کرنے والے کو سزا بھی دیتے تھے، اگر ایک دو دن آپ نے کوئی حرکت نہ کی تھی تو جنوں کو معلوم ہو جانا چاہیے تھا کہ کوئی نہ کوئی مسئلہ ہے، وہ پاس ہونے سے قریب آ کر ہی دیکھ لیتے کہ کیا ماجرا ہے، جنوں کی تیز اور شرارتی طبیعت سے کون واقف نہیں؟ کیا اتنے عرصے میں کسی جن نے کوئی غلطی نہ کی تھی؟ پھر دیمک کے لاٹھی کو چاٹنے اور آپ کے گرنے تک کے دورانیے میں جنوں کو معلوم نہ ہونا عقل سے بالاتر ہے۔۔۔"

تو اس کا میرٹھی صاحب کے معتقدین کے پاس کیا جواب ہے؟

جو جواب وہ منکرین قرآن کو دیں گے، وہی جواب ہم ان کو حدیث عائشہ پر اس اعتراض کا دے دیں گے۔

② اس حدیث کو ہی اگر غور سے پڑھ لیا جاتا تو یہ اعتراض کرنے کی نوبت نہ آتی، کیونکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا تو یہ بیان فرماتی ہیں

كنت أحمل في هودجي وأنزل فيه.

"میں اپنے ہودج (اونٹ پر رکھی جانے والی چھت دار کاٹھی) میں ہی سوار کی جاتی اور

اٹھائی جاتی تھی۔" ❶

عربوں میں رواج تھا کہ عورتوں کے لیے اونٹ کے اوپر رکھی جانے والی کاٹھی کمرہ نما بناتے تھے، لہٰذا رسول اللہ ﷺ کا گمان یہ تھا کہ آپ ؓ اپنے اس کمرے میں چلی گئی ہیں، اسی لیے آپ نے پورے راستے میں بھی خیال نہیں فرمایا، اتنی سی بات میرٹھی صاحب کی سمجھ میں نہیں آسکی اور انہوں نے امت کے اجماعی فیصلے صحیح بخاری کو ٹھکرا دیا ہے۔

انکارِ حدیث سے انکارِ قرآن تک

یاد رہے کہ منقولہ بالا رسالہ کا حدیث نبوی میں استعمال صرف انکارِ حدیث تک نہیں، بلکہ انکارِ قرآن تک بھی پہنچا دیتا ہے، جیسا کہ میرٹھی صاحب صحیح بخاری کی ایک حدیث پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عبیداللہ کی روایت میں ہے کہ اہل مکہ نے کہا تھا: لو نعلم أنك رسول الله...
لو نعلم عربیت کے لحاظ سے غلط ہے، صحیح لفظ لو علمنا ہے۔" ❷

غور کریں کہ میرٹھی صاحب نے جوش میں ہوش کھو کر قرآن کریم کا بھی انکار کر دیا ہے، کیونکہ بالکل یہی الفاظ لو نعلم قرآن کریم ❸ میں بھی موجود ہیں، معاذ اللہ میرٹھی صاحب اللہ تعالیٰ کی کلام کو عربیت کے لحاظ سے غلط قرار دے چکے ہیں، اس بات سے ہر عقلمند انسان بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ انکارِ حدیث دراصل انکارِ قرآن ہے۔

یہی میرٹھی صاحب صحیح بخاری کی اجماعی طور پر صحیح تفسیری روایات کو غلط قرار دے کر جو بجا اپنی تفسیر "مفتاح القرآن" کے مطالعہ کی دعوت دیتے رہتے ہیں۔ قارئین کرام اتنی سی مثال سے ہی

---

❶ صحیح بخاری: ٤١٤١؛ صحیح مسلم: ٢٧٧٠

❷ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ١/٣٠ ❸ آل عمران: ٣/١٦٧

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ کوئی خادمہ کیوں نہ گئی؟

"مدینہ منورہ میں جب تک گھروں میں پاخانے تعمیر نہیں کیے گئے تھے، عورتیں رات کے وقت قریبی جنگل میں قضائے حاجت کے لیے جایا کرتی تھیں، ازواج مطہرات بھی جاتی تھیں، مگر تنہا نہیں، ساتھ میں کوئی خادمہ ضرور ہوتی تھی۔۔۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ام المومنین کے علاوہ لشکر اسلام میں کوئی عورت نہیں تھی یا تھیں، لیکن آپ کی قیام گاہ سے دور تھیں تو طبعاً ام المومنین خود حضور اکرم ﷺ سے اپنے ساتھ چلنے کو کہتیں، ان کا اندھیری رات میں پڑاؤ سے تنہا باہر جانا بعید از امکان ہے۔۔۔" [1]

① قرآن کریم میں سیدہ مریم علیہا السلام کا قصہ مذکور ہے کہ جب ان کو ایک "حاجت" پیش آئی تو وہ اکیلی قوم سے دور چلی گئیں، پھر اکیلی واپس آئیں۔ اگر مریم علیہا السلام کا اکیلے چلے جانا کسی منکر قرآن کی عقل میں نہ آئے اور وہ اسے ناممکن قرار دے کر قرآن کا انکار کر دے تو میرٹھی صاحب کے معتقدین کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ اگر یہ قرآنی واقعہ ان لوگوں کو ہضم ہو جاتا ہے تو بھلا حدیث نبوی کی صورت میں اسی قرآن کی تشریح و توضیح ہی آخر ان کے حلق میں کیوں اٹکتی ہے؟

② مدینہ میں رہتے ہوئے جب قضائے حاجت کے لیے عورتیں جاتی تھیں تو انہیں باہر جنگل میں جانا پڑتا تھا اور جنگل دور ہوتا تھا، اس لیے کچھ عورتیں مل کر نکلتی تھیں، جبکہ اس حدیث کے مطابق سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اتنی دور گئی ہی نہیں تھیں کہ ساتھ کسی کو لے کر جانے کی ضرورت محسوس ہوئی، کیونکہ لشکر کا پڑاؤ جنگل میں ہی ہوا تھا اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا زیادہ دور گئی ہی نہ تھیں، جیسا کہ خود اسی حدیث میں ان کا اپنا بیان ہے:

---

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/ ۱۳۸-۱۳۹

فمشیت حتی جاوزت الجیش "میں چلتی رہی حتی کہ میں نے لشکر کو عبور کر لیا۔" ❶

نیز خود میرٹھی صاحب نے بھی لکھا ہے:

"قضائے حاجت کے لیے پڑاؤ سے زیادہ دور تو آپ گئی تھیں ہی۔۔۔"

جب دور گئی تھیں تو اعتراض کس بات پر؟ اتنی سی بات میرٹھی صاحب کی سمجھ میں نہیں آ سکی اور انہوں نے امام بخاری سمیت تمام علمائے امت کو مطعون کرنا شروع کر دیا ہے۔

جاتے ہوئے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا کسی کو نظر نہ آنا کیسے ممکن ہے؟

"اتنی سی لاغر نحیف اور دھان پان سی سہی پھر بھی ام المؤمنین کوئی سوئی تو تھیں نہیں کہ کسی کو ان کے باہر جانے کا علم ہی نہ ہوتا، جب کہ کوچ کا وقت قریب تھا اور پورا لشکر کوچ کے لیے جاگا ہوا تھا اور حضور ﷺ کی قیام گاہ لشکر کے قلب و وسط میں ہوتی تھی۔ پس یہ کیسے ممکن ہے کہ قلب لشکر میں لگے ہوئے خیمے سے کوئی عورت نکل کر جنگل کی طرف جائے اور سب کے جاگتے ہوئے بھی کسی کو نظر نہ آئے!" ❷

جواب: رات کے وقت پاس سے گزرنے والے کا علم دوسروں کو نہ ہونا عقل سقیم کے خلاف تو ہو سکتا ہے، عقل سلیم کے نہیں، خصوصاً جب کہ رات چاندنی نہ ہو اور ہر طرف اندھیرا ہو؟

جن مؤرخین نے اس غزوے کے حوالے سے ماہ شعبان کے ساتھ ساتھ دن یا تاریخ کا ذکر کیا ہے، انہوں نے یہی لکھا ہے کہ اس غزوے سے آپ کی واپسی اس وقت ہوئی جب ماہ شعبان کے اختتام میں صرف دو دن باقی تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رات بھی اندھیری تھی۔ پھر

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۲: ۱۴۹

❷ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۲: ۱۴۹

اگر کسی نے انہیں دیکھا تو کون سا عجوبہ ہے؟

② اگر کسی نے دیکھا بھی تھا تو اس کے خیال میں آپ رضی اللہ عنہا وہیں آ گئی تھیں، کیونکہ دیر تو آپ کو ہار کے گم ہونے کی وجہ سے ہوئی تھی، کسی کو یہ علم غیب تو تھا نہیں کہ آپ کا ہار گم ہو گیا ہے اور وہ اسے تلاش کر رہی ہیں!

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو لشکر کی روانگی کا علم نہ ہونا "عقلاً" محال ہے:

"قضائے حاجت کے لیے پڑاؤ سے زیادہ دور تو آپ گئی نہ ہوں گی، جب لشکر نے کوچ کیا ہوگا، اونٹ بلبلائے ہوں گے، لوگ باہم بول چال رہے ہوں گے اور رات کے سناٹے میں ان کے کوچ کرنے کی آواز تو دور دور تک پہنچی ہوگی، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ام المومنین کو اس کا پتہ نہ چلا ہو کہ اب لشکر کوچ کر رہا ہے۔۔۔

واللہ یہ بالکل عقل سے خارج بات ہے کہ ام المومنین کو لشکر کی روانگی کا پتہ نہ چلے اور وہ ہار تلاش کرتی رہیں اور لشکر کوچ کر جائے۔۔۔" ❶

جس شخص کی "عقل" میں قرآن کریم میں موجود فرمان باری تعالیٰ ﴿لو نعلم﴾ نہ آئے اور وہ اسے عربیت کے لحاظ سے غلط قرار دے، اس کی عقل سے اگر یہ حدیث خارج ہو جائے تو کوئی تعجب خیز بات نہیں۔

حالانکہ یہ تجربے کی بات ہے کہ اچانک پیش آنے والی کسی عام پریشانی میں بھی انسان کو ساتھ بیٹھے انسان کی وہ بات بھی نہیں سنتی جو خاص اسی سے کی جا رہی ہو، پھر نہایت قیمتی ہار اچانک گم ہو جانے کے بعد دور سے آنے والی عام آواز نہ سننے پر اعتراض کرنا بہت بڑی جسارت ہے۔

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱۴۹/۲

شبہ: راستے میں رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا علم کیوں نہ ہوا؟

"نمازِ فجر سے پہلے کوچ ہوا، راستے میں آپ یقیناً نمازِ فجر کے لیے رکے ہوں گے، پورا لشکر رکا ہوگا، ام المومنین رہ گئی ہوتیں تو کیا اس وقت حضور اکرم ﷺ کو ان کی گمشدگی کا علم نہ ہو جاتا؟ سخت حیرت کی بات ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو راستے میں اس کا علم ہو، نہ نماز فجر پڑھنے کے لیے رکنے پر پتہ چلے، نہ بعد نماز روانہ ہو جانے کے بعد قیام گاہ تک احساس ہوسکا۔

اگر کوئی کہے کہ یہ ممکن ہے تو یہ بھول جائیے، ممکن تو بے عقلی کی بات ہے، جب تو دو اور دو کا پانچ ہونا اور دو نقیضوں کا جمع ہو جانا بھی ممکن ہو جاتا ہے۔" [1]

ازالہ: سخت حیرت کی بات ہے کہ میرٹھی صاحب کی عقل میں اتنی بات بھی نہیں آئی، کوئی ان کو بتائے کہ سیدہ عائشہ ؓ نے نماز تو اپنے خیمے میں پڑھی ہوگی یا پھر عورتوں کی صف میں جو سب سے آخر میں ہوتی ہے، وہاں ادا کی ہوگی، کیونکہ حدیثِ رسول ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: خير صفوف الرجال أولها وشرها آخرها، وخير صفوف النساء آخرها وشرها أولها.

"سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مردوں کی صفوں میں سے بہترین صف سب سے پہلی اور سب سے بری (ثواب میں کم) سب سے آخری صف ہے، جبکہ عورتوں کی صفوں میں سب سے بہترین صف آخری اور سب سے بری (ثواب میں کم) پہلی صف ہے۔" [2]

---

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/ ۱۴۹-۱۵۰

[2] صحیح مسلم - ۴۴۰

نیز حدیث نبوی ﷺ کا بیان ہے:

عن أم سلمة رضي الله عنها قالت: كان يسلم فينصرف النساء، فيدخلن بيوتهن من قبل أن ينصرف رسول الله صلى الله عليه وسلم.

''سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے سلام پھیرتے تو عورتیں فوراً واپس جا کر (مقتدیوں کی طرف) آپ کے چہرہ مبارک پھیرنے سے پہلے اپنے گھروں میں داخل ہو جاتیں۔'' ❶

لہٰذا جیسے حدیث نبوی میں طریقہ موجود ہے رسول اللہ ﷺ کے خیال میں اسی طرح فوراً نماز ختم ہوتے ہی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا گھر روانگی سواری کے اوپر پردے ہودج میں داخل ہو گئی ہوں گی۔

مزید برآں رسول کریم ﷺ فجر کی نماز اندھیرے میں ادا فرماتے تھے جیسے کہ:

عن عائشة رضي الله عنها قالت: إن كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ليصلي الصبح، فينصرف النساء متلفعات بمروطهن، ما يعرفن من الغلس.

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، بیان کرتی ہیں کہ اس بات میں کچھ شبہ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز ادا فرماتے تو عورتیں فوراً چادروں میں لپٹی ہوئی واپس چلی جاتیں، وہ اندھیرے کی وجہ سے پہچانی نہ جاتی تھیں۔'' ❷

اس حدیث میں بیان کیے گئے معمول کے مطابق یقیناً آپ ﷺ نے نماز فجر اندھیرے میں ادا کی گئی ہوگی، اس لیے یہ خیال نہ فرمایا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کیوں نظر نہیں آ رہیں۔

---

❶ صحیح بخاری: ۸۵۰

❷ صحیح بخاری: ۸۶۷؛ صحیح مسلم: ۶۴۵

اتنی سی بات بھی میرٹھی صاحب کی سمجھ میں نہیں آئی، پھر بھی وہ اعتراض کرتے ہیں نیز بخاری پر اعتراض ہے جو کہ بالاتفاق امیر المؤمنین فی الحدیث ہیں۔ ان پر اعتراض کرنا از حد حماقت + از حد وقت کے پابند ہونے پر اعتراض کرنے کے مترادف ہے۔

❀ رسول اللہ ﷺ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے باز پرس کیوں نہ کی؟

"بالفرض حضور اکرم ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات کو نماز فجر کے لیے اترنے پر بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گمشدگی کا علم نہ ہوا اور راستے میں کسی کو پتہ نہ چل سکا اور وہاں پہنچ کر اگلی منزل پر پڑاؤ کرنے کے بعد بھی علم نہ ہوا اور اب عین دوپہر کو صفوان انہیں اپنے اونٹ پر سوار کیے ہوئے لائے۔۔۔

تو کیا یہ بات ایسی تھی کہ نبی ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پیچھے رہ جانے کی وجہ دریافت نہ فرماتے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جو بہت سریع الغضب تھے۔ یعنی انہیں ناگوار بات پر جلد غصہ آ جاتا تھا، اپنی بیٹی پر ناراض نہ ہوتے لیکن نہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کچھ پوچھا نہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کچھ کہا، جیسا کہ زہری کی بیان کردہ داستان سے مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس سلسلے میں کوئی پوچھ گچھ نہیں کی گئی۔ اس وجہ سے روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ یہ داستان شروع سے آخر تک قطعاً غلط ہے۔۔۔" [1]

❀ قارئین! آپ پوری حدیث افک پڑھ جائیں، آپ کو صراحتاً یا اشارۃً کسی طریقے سے بھی یہ معلوم نہیں ہوگا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا گیا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ضرور کوئی پوچھ گچھ ہوئی ہوگی اور ان کے عذر کو من کر شکایت قریب نہ کی گئی ہوگی۔ مگر منافقین نے جو سارا پروپیگنڈا کیا، اس

---

[1] دیکھیے بخاری کا مطالعہ، ص: ۱۵۰، ۱۵۱

کا ظہور تو رونما نہیں ہوا۔ نہ اس کی خبر اسی وقت رسول کریم ﷺ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ تک پہنچی کہ وہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے برہم ہوتے۔

مزید برآں تیمم کی مشروعیت والی حدیث میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہار کے گم ہو جانے کی وجہ سے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ برہم ہوئے تھے۔ اس کے بعد آیات تیمم نازل ہوگئیں تو سیدنا اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

ما هي بأول بركتكم يا آل أبي بكر.

"اے ابوبکر کی اولاد! یہ تمہاری پہلی برکت تو نہیں ہے۔" ❶

لہٰذا اس وقت سے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ معلوم کر چکے تھے کہ میری بیٹی عائشہ رضی اللہ عنہا سے اگر کوئی ایسا کام سرزد ہوتا ہے جو بظاہر ناگوار محسوس ہوتا ہو تو اس میں بھی کوئی خیر و بھلائی ہی مضمر ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اب برہم نہ ہوئے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی بیماری اور رسول اکرم ﷺ کی بے التفاتی!

"لیکن میں یقین رکھتا ہوں کہ یہ بھی حضرت عائشہ کی بیان کردہ بات نہیں ہے اور ہرگز ایسا نہیں ہوا کہ ایک ماہ کی طویل بیماری کے زمانہ میں حضور ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ویسی بے التفاتی برتی ہو، کیونکہ شرعاً اس بے التفاتی کی کوئی وجہ نہ تھی۔ بیمار پر تو سنگ دل لوگوں کو بھی رحم آتا ہے۔

اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ حضرت ام المومنین پر واقعی کچھ لوگ الزام لگا رہے تھے تو بلاشبہ ان کے پاس کوئی ثبوت تو نہ تھا کہ ام المومنین کو واقعی مجرم قرار دے کر نفرت و اعراض کا مظاہرہ کرنے کی گنجائش ہوتی۔ کسی شخص پر بغیر کسی ثبوت کے الزام لگایا جائے تو وہ معلوم

---

❶ صحیح بخاری: ٣٣٤؛ صحیح مسلم: ٣٦٧

ہے۔ یعنی ام المؤمنین جو خود نبی اکرم ﷺ کے علم میں بھی تھا تو شرع کی رو سے معصوم محسنہ اور وہ مظلومہ آتی بیمار بھی پڑی ہوئی تھی۔ تو کیا یہ بات تصور کرنے کے لائق ہے کہ رحمت للعالمین ﷺ، اپنے گھر میں بیمار پڑی ہوئی مظلوم بیوی کو بلا وجہ اعراض و بے التفاتی کی سزا دیتے رہیں۔ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۔" ❶

تبصرہ برقی صاحب کے اس اعتراض کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ بھی ہے تو بغیر ثبوت کے ایک بات کو سن کر آپ ﷺ پورا مہینہ سیدہ عائشہ ؓ سے بے التفاتی کیوں کرتے رہے؟

یہ اعتراض عقل و نقل دونوں اعتبار سے واضح طور پر باطل ہے۔ عقل کے اعتبار سے تو اس طرح کہ ہر ذی شعور سمجھ سکتا ہے کہ رسول کریم ﷺ ان دنوں بے حد پریشان تھے۔ لہٰذا اس حدیث میں جس بے التفاتی کا تذکرہ ہے، وہ "نفرت و اعراض" کی وجہ سے نہیں تھی، بلکہ آپ ﷺ کی بے حد پریشانی کی وجہ سے تھی۔

ظاہر ہے کہ آدمی پریشانی میں کسی کی طرف وہ التفات نہیں کر سکتا جو عام حالت میں ہوتا ہے اور نقل کے اعتبار سے اس طرح یہ اعتراض نا قابل التفات ہے کہ اسی حدیث میں یہ ذکر موجود ہے کہ آپ ﷺ سیدہ عائشہ ؓ کے پاس ان دنوں میں جاتے تو ان کا حال دریافت فرماتے تھے۔ آپ فرماتی ہیں:

وَيَرِيبُنِي فِي وَجَعِي أَنِّي لَا أَرَى مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللُّطْفَ الَّذِي كُنْتُ أَرَى مِنْهُ حِينَ أَمْرَضُ، إِنَّمَا يَدْخُلُ، فَيُسَلِّمُ، ثُمَّ يَقُولُ: كَيْفَ تِيكُمْ؟

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/۱۸۳

”میری تکلیف کے دوران مجھے یہ چیز شک میں ڈالتی تھی کہ میں نبی کریم ﷺ کی طرف سے وہ لطف و کرم نہیں دیکھ رہی تھی جو (عام دنوں میں) بیماری کے دوران دیکھتی تھی، آپ ﷺ تشریف لاتے اور سلام کہتے، پھر فرماتے تمہارا کیا حال ہے؟“ ❶

اس روایت سے تو بالکل وضاحت ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ناراض نہ تھے:

وقد انتهى الحديث الى رسول الله صلى الله عليه وسلم والى ابوى، ولا يذكران لى من ذلك قليلا ولا كثيرا، الا انى قد انكرت من رسول الله صلى الله عليه وسلم بعض لطفه بى...

”یہ بات رسول اللہ ﷺ اور میرے والدین تک پہنچ چکی تھی، لیکن وہ مجھ سے اس بارے میں کچھ بھی بات نہ کرتے تھے، ہاں! ایک بات تھی کہ میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے لطف و کرم کی کچھ کمی محسوس کر رہی تھی۔“ ❷

اب روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا ہے کہ آپ ﷺ ان دنوں میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف بھی لاتے، سلام بھی کہتے اور حال بھی دریافت کرتے تھے۔

جو پریشانی میں ہر انسان کو جو صورت حال لاحق ہو جاتی ہے، وہ آپ ﷺ کو بھی لاحق ہو گئی، جس کی بنا پر آپ پہلے کی طرح التفات نہ کر سکے اور یہ آپ کے بس کی بات بھی نہ تھی، ورنہ تہمت لگنے کے بعد بھی آپ ﷺ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو بے گناہ اور اس الزام کو بے ثبوت ہی سمجھتے تھے، جیسا کہ اسی حدیث کے الفاظ ہیں، آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا:

---

❶ صحيح بخاری: 2661، 4141، 4750۔ صحيح مسلم: 2770۔

❷ تاريخ الامم والملوك لطبری: 11244 وسنده صحيح

من یعذرنی من رجل بلغنی اذاہ فی اھلی ، فواللہ ما علمت علی اھلی الا خیرا ، ولقد ذکروا رجلا ما علمت علیہ الا خیرا .....

"جس آدمی (عبداللہ بن اُبی) کی طرف سے میری بیوی کے بارے میں مجھے تکلیف پہنچی ہے، اس سے مجھے انصاف کون دلائے گا، اللہ کی قسم! میں اپنی بیوی کے بارے میں صرف اچھائی ہی جانتا ہوں، انہوں (تہمت لگانے والوں) نے ایسے آدمی کا نام لیا ہے کہ جس کے بارے میں صرف اچھائی ہی جانتا ہوں ـــ" ❶

ثابت ہوا کہ صحیح بخاری پر کیے گئے اس اعتراض کی کوئی عقلی و نقلی حیثیت نہیں۔

❀ اسامہ رضی اللہ عنہ جیسے نوعمر سے مشورہ!

سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے میں جو مشورہ کیا تھا، اس پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اسامہ بن زید اس وقت جب کا یہ قصہ بتایا جاتا ہے، چودہ پندرہ سال کے لڑکے تھے، ان کے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ موجود تھے، جنہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہورِ نبوت سے قبل ہی اپنا بیٹا بنالیا تھا اور سورۂ احزاب کے نزول تک وہ زید بن محمد ہی کہے جاتے تھے، پس اگر آپ کو اپنے اس نازک امر میں مشورہ لینا ہی تھا تو اسامہ کی بجائے ان کے والد حضرت زید بن حارثہ سے لیتے۔ ایسے اہم امر میں کہیں نوعمر لڑکوں سے مشورہ لیا جاتا ہے؟ ـــ" ❷

❀ قارئین کرام جانتے ہیں کہ چودہ پندرہ سال کا لڑکا یقیناً بالغ ہو جاتا ہے، خصوصاً عرب علاقوں میں تو اسے قریباً عاقل و بالغ آدمی سے مشورہ کرنے میں کیا حرج ہے؟!

---

❶ صحیح بخاری: ۲۶۶۱، ۴۱۴۱، ۴۷۵۰؛ صحیح مسلم: ۲۷۷۰

❷ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/۱۵

نیز یتیموں کی پرورش کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ یتیموں کا مال ان کے حوالے نہ کرو کہ بچے ہونے کی وجہ سے عقل کی کمی کی بنا پر وہ اسے ضائع کر دیں گے، لیکن جب وہ بلوغت کو پہنچ جائیں تو خود اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ فوراً ان کا مال ان کے حوالے کر دیا جائے، جب اللہ تعالیٰ بالغ آدمی کی عقل و دانش کا اعتبار کرتا ہے تو اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اسی کام کے کیے جانے پر اعتراض کیوں ہے؟

چودہ پندرہ سال کا لڑکا اگر زیرک اور روشن دماغ ہو تو یقیناً وہ بڑی عمر والے عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر سوچ سکتا ہے، خصوصاً جب وہ سید المرسلین کا تربیت یافتہ ہو اور "حِبّ رسول" (رسول کریم ﷺ کا محبوب) کے لقب سے معروف ہو۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا وہ واقعہ بھی اگر میرٹھی صاحب کے ذہن میں ہوتا جو صحیح بخاری و صحیح مسلم میں موجود ہے تو شاید وہ یہ اعتراض نہ کرتے، رسول اللہ ﷺ نے اس سدا بہار درخت کے بارے میں سوال کیا جس کے پتے کسی موسم میں بھی نہیں گرتے تو سب صحابہ میں سے صرف ابن عمر رضی اللہ عنہ کے ذہن میں اس سوال کا جواب آیا تھا، حالانکہ وہ اس وقت سب سے چھوٹے تھے۔ [1]

اب بھی اگر کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے تو یہ سوائے ہٹ دھرمی کے اور کچھ نہیں۔

وحی کا انتظار کیوں؟

"پھر حضور اکرم ﷺ کو وحی کا کیا انتظار تھا؟ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت ام المومنین پر بہتان لگایا گیا تھا تو یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہ تھا کہ وحی جدید نازل ہو کر اسے حل کرتی۔ افک سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ قانون نازل فرما دیا تھا کہ جو لوگ پارسا عورتوں پر الزام لگائیں اور ثبوت میں چار گواہ پیش نہ کریں تو انہیں اسی کوڑے مارو اور عمر بھر کے لیے مردود الشہادۃ

---

[1] صحیح بخاری: ٦١، صحیح مسلم: ٢٨١١

قرار دے دیا ہر دو لاحق ہیں۔حضرت ام المومنین کے مسئلہ میں آپ کو اسی پر عمل کرنا تھا،
کیونکہ الزام لگانے والوں کے پاس ثبوت نام کی تو کوئی چیز تھی نہیں۔۔۔۔
ایک ماہ تک آپ کا کڑھن اور کبیدگی میں رہنا اور وحی کا انتظار فرمانا اور قرآن کا صاف و
صریح حکم نافذ کرنا ہرگز سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔۔۔"❶

جواب ① دینی امور میں نبی کریم ﷺ کا ہر قول و فعل وحی الٰہی سے

صادر ہوتا تھا، جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝﴾

"آپ اپنی خواہش سے نہیں بولتے، وہ تو بس وحی الٰہی ہوتی ہے۔"❷

ہمارا ایمان ہے کہ آپ ﷺ کا اس معاملے میں یہ توقف وحی الٰہی کی بنا پر تھا، آپ ﷺ کو
اسی طرح حکم باری تعالیٰ تھا اور ضروری نہیں کہ توقف کا یہ حکم قرآن میں ہی ملے تو تب ہی ایمان
لایا جائے، بلکہ امت کا اجماعی فیصلہ ہے کہ حدیث بھی وحی ہے، جس طرح قرآن کریم میں اللہ
تعالیٰ کے احکامات نازل ہوتے تھے، اسی طرح حدیث میں بھی نازل ہوتے تھے، ہم اس کی ایک
مثال پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

جب غزوۂ بنی نضیر کے موقع پر آپ ﷺ نے اس یہودی قبیلے کے کھجوروں کے کچھ درخت
کاٹ دیئے اور کچھ جلا دیئے، اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ ادھر پیغمبر اسلام فساد فی الارض اور مال
کے ضیاع سے منع فرماتے ہیں اور ادھر عملاً خود اس کی خلاف ورزی میں اتنا قیمتی مال ضائع کر
رہے ہیں، اس وقت یہ فرمان باری تعالیٰ نازل ہوا:

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/۱۵۵
❷ النجم: ۳۔۴

واقعہ کی وجہ سے اپنا عمومی حکم بدل دیا اور آیاتِ لعان نازل فرما دیں۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ کی بیویوں کا معاملہ عام عورتوں سے مختلف ہونا تو خود اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں بایں الفاظ بیان فرما دیا ہے:

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ ❶

''اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں میں سے کسی عورت کی طرح نہیں ہو۔۔۔''

جب قرآنِ کریم سے نبی ﷺ کی بیویوں کے معاملے کا خاص ہونا ثابت ہو گیا ہے تو بھلا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر الزام کے معاملے میں آپ ﷺ کا پرانا قانون لاگو نہ فرمانا سمجھ میں نہ آنے والی بات کس طرح ہو گئی؟

(۳) عام عورت پر الزام کی صورت میں تہمت لگانے والے پر اتنی تو زنا کی سزا لاگو ہونے کی وجہ لوگوں کے ذہن میں یہ شبہ رہ جاتا ہے کہ شاید تہمت لگانے والا سچا ہو لیکن چار گواہ پیش نہ ہو سکنے کی وجہ سے اس پر حد قائم کر دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی بیویوں کا مقام و مرتبہ اس شک و شبہ سے بلند و بالا رکھا ہے، لہٰذا سابقہ قانون کو چھوڑ کر خود ان کی براءت نازل کرنا اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی، نہ جانے یہ بات برقی صاحب کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی؟

جبریل علیہ السلام سے روزانہ ملاقات اور وحی کی بندش!

''بتایا جاتا ہے کہ یہ حضرت ام المومنین پر بہتان لگنے کا قصہ غزوۂ بنی المصطلق سے واپسی میں پیش آیا تھا۔ یہ غزوہ شعبان میں ہوا ہے۔ مگر چند روز بعد شعبان تک واپسی ہو گئی ہو گی تو اس داستان کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تقریباً نصف رمضان تک بیمار رہیں اور اس پوری مدت میں آپ وحی کے منتظر رہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ تقریباً نصف رمضان تک حضور

---

❶ الاحزاب ۳۲:۳۳

اکرم ﷺ کی جبرئیل سے ملاقات نہ ہوئی ہو، حالانکہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ ہر سال ماہ رمضان کی ہر شب میں آپ کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام آکر قرآن سنتے سناتے تھے، لہٰذا نہایت سہولت کے ساتھ آپ ان کے متعلق حضرت جبرئیل علیہ السلام سے حقیقت حال معلوم کر سکتے تھے۔" ❶

ازالہ

① مہرتھی صاحب بخاری کا صحیح مفہوم سمجھ نہیں پائے، ان کے نزدیک شاید جبرئیل علیہ السلام عالم غیب تھے اور نبی کریم ﷺ جب چاہتے جبرئیل علیہ السلام کو بلا کر سب حالات دریافت فرما لیتے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام بلکہ تمام فرشتے مل کر بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر کچھ نہ جانتے تھے، نہ ہی کسی چیز کا علم ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کسی کو بتانے کا اختیار کسی فرشتے کے پاس تھا۔

جبرئیل علیہ السلام سو بار بھی آپ کے پاس آئے ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت ہی یہ تھی کہ اصل حقیقت دیر سے آشکارا کیا جائے۔ لہٰذا جبرئیل علیہ السلام کو پہلے پتہ بھی تھا تو وہ بتا نہ سکتے تھے، وہ جس کام کے لیے آتے تھے صرف وہی کرتے تھے، اس دوران کسی اور وحی کا انکار کس نے کیا ہے، صرف سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں اتنے دن وحی نازل نہیں ہوئی، جیسا کہ وہ خود بیان کرتی ہیں:

وقد لبث شهرا، لا يوحى اليه في شأني بشيء.

"آپ ایک ماہ تک یوں رہے کہ میرے بارے میں آپ کی طرف کوئی وحی نازل نہیں کی گئی۔" ❷

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۵۵۔۱۵۶

❷ صحیح بخاری: ۲۶۶۱، ۴۷۵۰-۴۱۴۱؛ صحیح مسلم: ۲۷۷۰

اس لیے نہایت سہولت کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے، کوئی اعتراض والی بات ہے ہی نہیں:

مہاجرین کی خاموشی!

"صحیح بات یہ ہے کہ غزوۂ احزاب کے بعد ہی غزوۂ بنی المصطلق ہوا تھا۔ اچھا فرض کر لیجیے کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اپنی وفات سے نو دس ماہ بعد یکا یک زندہ ہو کر اس وقت مسجد کے اندر مجمع میں آ گئے تھے اور حضور اکرم ﷺ سے مخاطب ہو کر اپنی دلی محبت کا ثبوت دیا اور بہتان لگانے والوں کو گردن زدنی قرار دیا تھا اور سعد بن عبادہ جیسے جلیل القدر صحابی پر اس وقت خاندانی تعصب کا بھوت چڑھ گیا تھا تو مہاجرین کو کیا ہو گیا تھا کہ انہوں نے اس موقع پر ایک لفظ بھی نہ کہا، حالانکہ اس داستان کے مطابق مہاجرین میں سے دو شخص اس جرم عظیم کے مرتکب ہو رہے تھے۔۔۔ ❶"

تبصرہ: میرٹھی صاحب نے غزوۂ احزاب کے پہلے اور غزوۂ بنی المصطلق کے بعد میں ہونے پر اتفاق کا جو جھوٹا دعویٰ کیا ہے، اس کا تو پول ہم تاریخی اعتراضات کے جوابات کے ضمن میں کھولیں گے اور یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں کریں گے کہ غزوۂ احزاب بعد میں ہوا تھا لہٰذا ان کو اس جھوٹ پر جھوٹ "فرض" کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

رہی بات یہ کہ مہاجرین میں سے دو صحابہ اس کام میں شریک ہوئے تھے تو مہاجرین نے وہاں کوئی بات کیوں نہ کی اور رسول کریم ﷺ سے محبت کا اظہار کیوں نہ کیا تو اس کا جواب سیدھا سا ہے کہ میرٹھی صاحب خود لکھ چکے ہیں:

"اس کے نتیجہ میں مسجد میں شور برپا ہو گیا اور بنی اوس اور بنی خزرج باہم لڑنے مرنے پر

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/۱۴۳

آمادہ ہو گئے۔" ❶

بلکہ صحیح بخاری میں یہ الفاظ بھی ہیں:

فثار الحیان الأوس والخزرج حتی ھموا ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی المنبر، فنزل، فخفضھم حتی سکتوا وسکت.

"اوس اور خزرج دونوں قبیلے بھڑک اٹھے یہاں تک کہ انہوں نے (لڑائی کا) ارادہ کر لیا، رسول کریم ﷺ منبر پر تھے، آپ نیچے تشریف لائے اور ان کو ٹھنڈا کیا حتیٰ کہ وہ بھی خاموش ہو گئے اور آپ بھی خاموش ہو گئے۔" ❷

معلوم ہوا کہ وہاں پہلے ہی شور برپا ہو گیا تھا اور رسول کریم ﷺ لوگوں کو خاموش کروا رہے تھے، ایسے حالات میں مہاجرین وہاں رسول کریم ﷺ کا منہ تک کر خاموش رہ گئے تھے، بھلا وہاں مہاجرین کا تو بولنا حب رسول کی علامت تھی یا بولنا؟ قارئین ہی فیصلہ فرمائیں کہ اس میں بخاری کا قصور ہے یا میرٹھی صاحب کا؟

روایات میں "اختلاف"!

"یہاں ناظرین داستانِ افک کی روایت کے اس اختلاف پر بھی نظر ڈال لیں کہ زہری کی داستان کے مطابق حضرت عائشہؓ کو اپنے متعلق بہتان کی خبر تقریباً ایک ماہ بعد ہوئی تھی جب بخار اتر گیا تھا اور رات کو مسطح کی ماں کے ساتھ قضائے حاجت سے فارغ ہو کر جنگل سے گھر کی طرف آ رہی تھیں۔ اور مسروق والی داستان میں بھی مسطح کی ماں کو ہی مخبر بنایا گیا ہے مگر اس میں مذکور ہے کہ قضائے حاجت سے پہلے ہی ام المؤمنین کو مسطح کی ماں نے یہ

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۲/۳۴

❷ صحیح بخاری، [illegible] ۲۶۶۱

جاں گاہ اطلاع دے رہی تھی، اس کے سنتے ہی ان پر لرزہ طاری ہوگیا اور حاجت کا کوئی احساس ہی نہ رہا، یوں ہی گھر واپس آگئیں۔۔۔'' ❶

تبصرہ: ناظرین کو معلوم ہوگا، اگر نہیں تو معلوم ہو جانا چاہیے کہ خود میرٹھی صاحب نے لکھا ہے:

''امام بخاری نے اسے بطور حدیث نہیں بلکہ زہری کی تائید میں تعلیقاً ذکر کیا ہے۔۔۔'' ❷

ہمارا سوال ہے کہ جب امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو بطور حدیث پیش ہی نہیں کیا تو صحیح بخاری کی احادیث پر اعتراضات کے ضمن میں اسے پیش کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟ صحیح بخاری کی معلق روایات ہمارا محل نزاع ہیں ہی نہیں، بلکہ امت کا اجماع صحیح بخاری کی صرف مرفوع متصل احادیث کی صحت پر ہے۔

معلوم ہوا کہ ابو اسامہ کی روایت کو پیش کر کے صحیح بخاری پر اعتراض کرنا کوئی علمی کاوش نہیں۔

دوسرا ''اختلاف'' اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی لاعلمی!

''دوسرا اختلاف یہ ہے کہ ابو اسامہ کی روایت میں تصریح ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے مسجد کے اندر بھرے مجمع سے جب اس قصہ کا ذکر کیا اور جواب میں سعد بن معاذ نے بہتان لگانے والوں کو قتل کر دینے کی اجازت مانگی اور اس کے جواب میں ایک خزرجی شخص نے بربنائے تعصب سعد بن معاذ کی بات کا جواب دیا اور اس کے نتیجہ میں مسجد میں شور برپا ہوگیا اور بنی اوس اور بنی خزرج باہم لڑنے مرنے پر آمادہ ہوگئے تو اس وقت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے گھر ہی تھیں

---

❶ ''صحیح بخاری کا مطالعہ'' ۱/ ۱۴۳۔۱۴۴

❷ ''صحیح بخاری کا مطالعہ'' ۱/ ۱۴۰

جو بالکل مسجد سے متصل تھا لیکن ہم نشینوں کو یہ بات بالکل معلوم نہ ہو سکی کہ مسجد میں شور کیسا ہے اور کس بات پر لوگ جھگڑ رہے ہیں تو کیا یہ عقل میں آنے والی بات ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کان میں شور کی "آوازیں" پہنچیں اور آپ کو اس کی حقیقت جان لینے کا تجسس نہ ہو؟" [1]

صحیح بخاری کی حدیث کے مطابق مسجد میں آپ ﷺ کے صحابہ سے بات چیت کرنے سے پہلے ہی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو ام مسطح کی زبانی اس واقعہ کا علم ہو چکا تھا. جبکہ مسجد والے واقعہ کے وقت آپ رضی اللہ عنہا اپنے والدین کے گھر تھیں، نیز ایک معلق روایت کی بنا پر صحیح بخاری پر اعتراض کرنا زیادتی ہے، کیونکہ معلق روایات صحیح بخاری کے موضوع سے ہی خارج ہیں۔

تین روایات کا "ناقابل حل" تعارض!

"ابو اسامہ کی روایت میں ہے کہ اسی دن شام کو مسطح کی ماں سے حضرت عائشہ نے یہ خبر سنی، لیکن زہری کی روایت میں یہ ہے کہ جب حضرت عائشہ مسطح کی ماں سے خبر سن کر آپ سے اجازت لے کر تحقیق حال کے لیے اپنے تو دوسرے دن مسجد میں آپ نے لوگوں سے اس کا ذکر کیا اور سعد بن معاذ و سعد بن عبادہ کے درمیان تلخ کلامی ہوئی، یعنی اس وقت حضرت عائشہ اپنے گھر نہ تھیں، بلکہ والدین کے یہاں تھیں۔

اور ام رومان سے مروی داستان میں یہ مذکور ہے کہ وہ اپنی بیٹی حضرت عائشہ کے پاس حضور اکرم ﷺ کے یہاں گئی ہوئی تھیں کہ ایک انصاریہ عورت آ کر اپنے بیٹے کو کوسنے لگی۔۔۔

اس روایت کے مطابق حضرت عائشہ کو یہ خبر حضور ﷺ کے گھر میں ہی اپنی ماں کے سامنے ایک انصاری عورت سے معلوم ہوئی تھی۔ تینوں روایتوں کا یہ اختلاف ناقابل حل ہے اور یہ

---

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۱/۱۹۲

بجائے خود اس قصے کے غلط ہونے کی دلیل ہے۔" ❶

ازالہ میرٹھی صاحب نے یہاں صحیح بخاری کی روایات میں تعارض و منافات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ درحقیقت صحیح احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہو سکتا، ہاں! بسا اوقات ظاہری طور پر کسی کو کوئی منافات نظر آتی ہے، حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے اور ایسے تو کئی قرآنی آیات میں بھی ہے، بھلا اس وجہ سے قرآنی آیات پر بھی اعتراض کیا جائے گا؟

ابو اسامہ کی روایت تو ہے ہی معلق، لہٰذا اس پر اعتراض بے جا ہے، رہی بات امام زہری رحمہ اللہ کی روایت کی کہ اس میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے والدین کے گھر جانے کے بعد دوسرے دن مسجد میں رسول کریم ﷺ کے خطاب کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ سمجھا!! معاملہ خود تسلیم ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے والدین کے گھر سے فوراً واپس آ گئی تھیں، جیسا کہ خود میرٹھی صاحب نے لکھا ہے:

"جب حضرت عائشہ اپنے والد کے یہاں پہنچیں تو حضرت ابوبکر نے انھیں واپس جانے کی سخت تاکید کی، وہ حضور ﷺ کے یہاں اپنے گھر میں واپس آ گئیں، دوسرے دن صبح کو ابوبکر و ام رومان دونوں ان کے یہاں پہنچ گئے اور شام تک وہیں رہے۔۔۔" ❷

یہ اعتراض تو ان کے گھر سے ہی رفع ہو گیا ہے، رہا معاملہ یہ کہ ایک روایت میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو ام مسطح کی طرف سے گھر سے باہر اطلاع ملنے کا ذکر ہے اور دوسری روایت میں یہ ذکر ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ رسول کریم ﷺ کے گھر میں موجود تھیں کہ انصار کی ایک عورت نے آ کر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو اطلاع دی، اس تعارض کا حل کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۶۵

❷ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۶۶-۱۶۷

فرماتے ہیں:

وطريق الجمع بينهما أنها سمعت ذلك أولاً من أم مسطح، ثم ذهبت الى بيت أمها لتستيقن الخبر منها، فأخبرتها أمها بالأمر مجملاً.... ثم دخلت الأنصارية، فأخبرتها بمثل ذلك بحضرة أمها، فقوي عندها القطع بوقوع ذلك، فسألت هل سمعه أبوها وزوجها ترجيا منها أن لا يكونا سمعا ذلك، ليكون أسهل عليها، فلما قالت لها: أنهما سمعاه، غشي عليها....

"دونوں روایات میں تطبیق یہ ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے پہلے یہ خبر ام مسطح سے سنی، پھر وہ اس کی تصدیق کے لیے اپنی والدہ کے پاس چلی گئیں، انہوں نے مختصر انداز سے بات بتائی، پھر جب انصار کی ایک عورت نے ان کی والدہ کی موجودگی میں آکر یہ خبر دی تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس واقعہ کا قطعی یقین ہو گیا، پھر انہوں نے اس عورت سے پوچھا کیا ان کے والد (سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) اور خاوند (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی یہ خبر سنی ہے؟ آپ کو امید یہ تھی کہ ان کو یہ خبر نہیں پہنچی ہوگی لہٰذا یہ معاملہ خفیف ہوگا، لیکن جب عورت نے بتایا کہ انہوں نے بھی یہ بات سن لی ہے تو (پریشانی کی وجہ سے) آپ پر غشی طاری ہوگئی۔" [1]

کتنی واضح سی بات ہے جو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے سمجھائی ہے، عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ خبر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو کئی ذرائع سے ملی، جب ایک عام عورت نے خبر دی اور یہ بھی بتا دیا کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ بات پہنچ گئی ہے تو آپ فرطِ غم سے بے ہوش ہو گئیں۔ اس میں بھلا عقلی طور پر کون سی خرابی اور کون سا تعارض ہے جو ناقابلِ حل ہے؟

[1] فتح الباری لابن حجر: ۸/۴۶۷، ۴۶۸

اگر کوئی آدمی حق کو تسلیم نہ کرنے کی ٹھان لے تو بھلا قرآن کریم میں ایک ایک واقعہ میں اسے تعارض نظر نہیں آئے گا؟ ایک مثال پیشِ خدمت ہے:

سورۂ ق میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ﴾ [1]

"اور یقیناً ہم نے آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، اسے چھ دنوں میں پیدا کیا اور ہمیں کوئی تھکاوٹ بھی نہیں ہوئی۔"

جبکہ سورۂ حم السجدہ میں یوں فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَادًا ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ ۝ ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ۝ فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ ...﴾ [2]

"(اے نبی!) کہہ دیجیے: کیا تم اس ذات کے ساتھ کفر کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا فرمایا اور تم اس کے لیے شریک ٹھہراتے ہو، وہ تو سب جہانوں کا رب ہے، اور اس نے اس (زمین) میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس نے اس میں برکت دی اور اس نے اندازہ رکھا اس میں اس کی غذاؤں کا چار دنوں میں، سوال کرنے والوں کے لیے یہ برابر ہے، پھر اس نے آسمان کی طرف توجہ کی، اس حال میں کہ وہ دھواں تھا، چنانچہ اس نے آسمان

[1] ق: ۳۸ [2] حم السجدہ: ۹۔۱۲

اور زمین کو کہا کہ تم دونوں خوشی یا ناخوشی آؤ۔ دونوں نے کہا، ہم خوشی سے آتے ہیں۔ پھر اس نے دو دنوں میں سات آسمان بنائے۔۔۔"

اب پہلے مقام پر اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے، سب کو چھ دنوں میں پیدا کرنے کا تذکرہ فرمایا ہے، جبکہ دوسرے مقام پر دو دنوں میں زمین، چار دنوں میں زمین کی ضروری چیزوں اور دو دنوں میں آسمانوں کو بنانے کا تذکرہ کیا ہے، یوں ظاہراً آٹھ دن بنتے ہیں۔ کیا کوئی عقل مند انسان کہہ سکتا ہے کہ (معاذ اللہ!) یہ تناقض یا کھلا اختلاف ہے؟

ظاہر ہے کہ اگر آدمی اسے حق تسلیم کرے تو اپنی عقل کا قصور سمجھے گا اور کوئی نہ کوئی توجیہ کر کے ضرور اسے قبول کرے گا، لیکن اگر وہ اس حق کا مخالف و منکر ہوا تو اسے یہی بات اقرارِ حق میں رکاوٹ نظر آئے گی۔ بعینہٖ یہی معاملہ حدیث کا ہے۔ جب اس کے راویوں اور سندوں پر کئے جانے والے تمام اشکالات رفع کر دیئے گئے ہیں تو صرف اپنی عقلِ نارسا کو معیار قرار دے کر ٹھکرانا تعصب کے سوا کچھ نہیں۔

آیاتِ برائت کے محلِ نزول میں "اختلاف"!

"یونس زہری کی روایت کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان کے والدین اور ایک انصاری عورت کی موجودگی میں حضرت ابوبکر کے گھر یہ آیات نازل ہوئیں۔

لیکن ابو اسامہ کی داستان میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے والد کے یہاں پہنچیں تو حضرت ابوبکر نے انہیں واپس جانے کی سخت تاکید کی، وہ حضور ﷺ کے یہاں اپنے گھر واپس آ گئیں۔ دوسرے دن صبح کو ابوبکر و ام رومان دونوں ان کے یہاں پہنچ گئے اور شام تک وہیں رہے، عصر کی نماز پڑھ کر حضورِ اکرم ﷺ گھر تشریف لائے۔۔۔

یعنی ابو اسامہ کی روایت کے مطابق یہ آیات خود حضورِ اکرم ﷺ کے گھر اتری تھیں اور ام

ام المومنین وہیں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے یہاں سے واپس آ گئی تھیں اور ان کے والدین ابوبکر و ام رومان بھی موجود تھے۔

تیسری ام رومان والی روایت میں مذکور ہے۔ ”ایک عورت سے بہتان کی خبر سن کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بے ہوش ہو کر گر گئیں، ہوش آیا تو انھیں سخت جاڑا چڑھا ہوا تھا۔۔۔

حضور اکرم ﷺ یہ سن کر باہر تشریف لے گئے تھوڑی دیر بعد ابوبکر کے ساتھ واپس آئے اور اللہ کی طرف سے ام المومنین کی بے گناہی کی صراحت آ جانے کی بشارت دی، پہلی اس روایت کے مطابق یہ آیات حضرت عائشہ، ام رومان کے سامنے نہیں بلکہ گھر سے باہر نازل ہوئیں۔ بتائیے تینوں روایات ان کے مضمون کے اس تضاد کو کیسے رفع کیا جائے؟ اگر تین شخص ہیں نے خود ہایت ثقہ ہوں اور وہ کسی حرکت کے بارے میں گواہی دیں لیکن تینوں کا بیان باہم متضاد ہو تو کیا ان کی وہ شہادت قابل قبول ہوگی؟ ہرگز نہیں، اختلاف و تناقض کی وجہ سے تینوں کی شہادت رد کر دی جائے گی، اسی طرح یہ تینوں روایتیں گو صحیح بخاری میں درج ہیں، لیکن جب ایک ہی واقعہ کے متعلق ان کے مضامین میں باہم اس قدر اختلاف و تناقض ہے تو مقتضائے عقل یہی ہے کہ تینوں روایتیں رد کر دی جائیں اور باور کیا جائے کہ یہ افسانہ سرے سے غلط ہے۔۔۔“ ❶

جواب ① فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَن ذَنۢبِهِۦٓ إِنسٌ وَلَا جَآنٌّ ﴾ ❷

”اس (قیامت کے) دن کسی انسان اور جن سے اس کے گناہ کے بارے میں پوچھا نہیں جائے گا۔“

❶ ”صحیح بخاری کا مطالعہ“: 1/166-168

❷ الرحمن: 39

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

﴿ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ ۝ ﴾ ❶

''اور وہ (اللہ تعالیٰ) ان کو پکارے گا اور فرمائے گا، تم نے میرے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا؟''

کیا (معوذ اللہ) ان فرامین باری تعالیٰ کے بارے میں کہا جائے گا کہ:

''تو پھر ان آیات کے مضمون کے اس تضاد کو کیسے رفع کیا جائے؟ جب ایک ہی واقعے کے متعلق ان کے مضامین میں باہم اس قدر اختلاف و تناقض ہے تو مقتضائے عقل یہی ہے کہ دونوں کو رد کر دیا جائے اور باور کیا جائے کہ یہ افسانہ سرے سے غلط ہے۔۔۔''

کیونکہ ایک آیت میں مذکور ہے کہ قیامت کے روز کسی انس و جن سے اس کے گناہوں کے بارے میں پوچھا ہی نہیں جائے گا، بلکہ ویسے ہی سزا لاگو کر دی جائے گی، جبکہ دوسری کئی آیات میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں اور اپنے انبیاء کے نافرمانوں سے پوچھے گا۔

جب قرآن کے بارے میں یہ نظریہ ہے کہ اس میں کوئی تعارض نہیں، اگر کہیں ایسی بات نظر آئے تو انسانی عقل کا قصور ہے تو حدیث نبوی کو اس طرح کے حیلے بہانوں سے کیوں چھوڑا جاتا ہے؟ حالانکہ قرآن کی طرح نبی کریم ﷺ کے اقوال و افعال پر بھی عمل ضروری ہے۔ کیونکہ اسی قرآن کریم میں ہی فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ ❷

''تمہارے لیے اللہ کے رسول (کی زندگی) میں اچھا نمونہ ہے۔''

---

❶ القصص: ۶۵

❷ الاحزاب: ۲۱

کیا آپ ﷺ کی زندگی کا یہ واقعہ ہمارے لیے اسوۂ حسنہ نہیں۔ پھر اس کو ٹھکرانے کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں ہے۔ محض عقل کو معیار بنا کر حدیث رسول اور اجماع امت کا انکار کر کے خیر القرون سے لے کر اب تک کے تمام مسلمانوں کو بے عقل اور بے شعور قرار دینے کی مذموم سعی کی جا رہی ہے، کیا تمام سلف صالحین اتنا بھی شعور نہیں رکھتے تھے کہ (معاذ اللہ!) ایک جھوٹے افسانے کو عقیدے و عمل میں بنیادی حیثیت دیتے رہے؟

④ یہ کہنا کہ زہری کی روایت میں مذکور ہے کہ آیات براءت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر میں نازل ہوئیں، بالکل خلاف واقعہ بات ہے، کوئی "میرٹھی" ہمت کر کے امام زہری کی روایت میں یہ بات دکھائے تو سہی! اصل بات وہی ہے جو ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جب واقعہ افک کی تحقیق کرنے اپنے والدین کے گھر گئی تھیں تو اپنی والدہ سے پوچھ کر فوراً واپس آ گئی تھیں، جیسا کہ زہری اور ابو اسامہ دونوں کی روایت میں ہے:

واصبح ابوای عندی. "صبح کے وقت میرے والدین میرے پاس آ گئے۔" ❶

اگر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا زہری کی روایت کے مطابق والدین کے گھر میں ہی تھیں تو پھر ان کے یہ کہنے کا کیا مطلب ہوا کہ میرے والدین صبح کے وقت میرے پاس آئے؟

رہا ام رومان رضی اللہ عنہا والی روایت کے بارے میں میرٹھی صاحب کا یہ کہنا کہ:

"حضور اکرم ﷺ یہ سن کر باہر تشریف لے گئے، تھوڑی دیر بعد ابو بکر کے ساتھ واپس آئے۔۔۔ پس اس روایت کے مطابق یہ آیات حضرت عائشہ و ام رومان کے سامنے نہیں بلکہ گھر سے باہر نازل ہوئیں۔۔۔"

---

❶ صحیح بخاری: 4141، 4750

تو اسے علمی دیانت قطعاً قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہے کوئی "مہربغ" جو اس کو دیانت ثابت کرتے ہوئے اس واقعہ کے تحت صحیح بخاری میں سے رسول اکرم ﷺ کا باہر جانا، پھر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ واپس آنا اور راستے میں آیتِ براءت کا نازل ہونا دکھا کر اپنے "مہربغ" صاحب کی عزت بچالے؟

معلوم ہوا کہ صحیح بخاری کی اس روایت میں بھی باقی دونوں روایات کی طرح رسول کریم ﷺ کے گھر میں ہی ان آیات کے نزول کا تذکرہ ہے، نیز یہ تمام اعتراضات نیک نیتی اور دیانتداری کی غرض سے نہیں، بلکہ حدیث و محدثین دشمنی کے نقطۂ نظر سے کیے گئے ہیں۔

رہے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ:

وانصرف ولم يقل شيئا، فأنزل الله عذري ...

"آپ ﷺ پھر گئے اس حال میں کہ کچھ نہیں کہا، پھر اللہ تعالیٰ نے میری براءت نازل فرما دی ..." ❶

تو اطلاعاً عرض ہے کہ انصرف کا معنی ہر وقت کسی جگہ سے نکلنا نہیں، بلکہ اکثر اس کا معنی توجہ ہٹا کر دوسری طرف کرنا بھی ہوتا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری کے مطالعہ سے ہی بیسیوں مقامات مل سکتے ہیں، بطور نمونہ آپ ملاحظہ فرمائیں:

عن عائشة رضي الله عنها أن النبي صلى الله عليه وسلم صلى في خميصة لها أعلام، فلما انصرف قال: اذهبوا بخميصتي هذه ... فإنها ألهتني آنفا عن صلاتي ...

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دھاری دار چادر میں نماز پڑھی، جب

❶ صحیح بخاری: ٤١٤١

آپ نماز سے پھیرے تو فرمایا، میری یہ چادر لے جاؤ۔۔۔ کیونکہ اس نے مجھے ابھی نماز سے غافل کر دیا تھا۔۔۔" ❶

کیا یہاں کوئی شخص "انصرف" کا معنی یہ کر سکتا ہے کہ "جب آپ گھر سے باہر تشریف لے گئے تو فرمایا"؟

بالکل صاف بات ہے کہ یہاں اس کا معنی نماز سے توجہ ختم کر کے گھر والوں کی طرف توجہ مبذول کرنا ہے اور یہی معنی سیدہ ام رومان رضی اللہ عنہا والی حدیث افک میں ہے جس کو سمجھنے کی بجائے میرٹھی صاحب نے اس واقعی واقعہ کو سرے سے "محال افسانہ" قرار دے دیا ہے، حالانکہ وہاں گھر سے باہر جانے کے کوئی الفاظ نہیں ہیں۔

واقعہ افک اور صحابہ کرام کی لغزش!

"زہری و ابو اسامہ روایت کی روایت میں مذکور ہے کہ حضرت ام المؤمنین پر بہتان لگانے کی سرپرستی تو منافق اعظم عبداللہ بن ابی کر رہا تھا اور مخلص مؤمنین میں سے بھی تین شخص اس گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے تھے، ایک مشہور شاعر حضرت حسان بن ثابت انصاری خزرجی، دوم مسطح بن اثاثہ مہاجر جو خاندان بنی مطلب میں سے تھا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خالہ زاد بہن کا بیٹا تھا۔ غریب ہونے کی وجہ سے حضرت ابوبکر اس کی مالی امداد فرماتے رہتے تھے۔ اس نے بھی ام المؤمنین پر بہتان لگایا تو حضرت ابوبکر نے آئندہ کے لیے اس کی مالی مدد کرنے سے ہاتھ کھینچ لیے تھے، سوم حمنہ بنت جحش مہاجرہ تھیں۔ ان تینوں نے کھل کر حضرت ام المؤمنین پر بہتان لگایا تھا۔ محمد بن اسحاق مؤرخ کی روایت جس کی تخریج ابو داؤد نے کی ہے، یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ان تینوں پر حد قذف جاری فرمائی۔

❶ صحیح بخاری: ٣٧٣

میں کہتا ہوں حقیقت یہ ہے کہ حسان بن ثابت نے یہ جرم کیا تھا نہ مسطح بن اثاثہ نے نہ حمنہ نے، یہ ان پر دشمنوں کا بہتان ہی بہتان ہے جیسا کہ میں آگے چل کر وضاحت کے ساتھ ثابت کروں گا، یہاں میں یہ بتانے پر اکتفا کرتا ہوں کہ سورۃ احزاب سورۃ النور سے با اتفاق مفسرین پہلے نازل ہوئی ہے اور سورۃ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صراحت کے ساتھ بتا دیا تھا کہ ازواج مطہرات کا حکم و مرتبہ عام مومن عورتوں سے بہت مختلف اور نہایت بلند ہے، حضور اکرم ﷺ کی ہر بیوی تمام مومن مردوں اور مومن عورتوں کی ماں ہے ـــ اور انہیں خوب فہمائش کر دی گئی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کو اذیت دینا خود اللہ کو اذیت دینے کے معنی میں ہے، ایسے شخص پر دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اور اس کے لیے ذلیل و رسوا کر دینے والا عذاب طے ہے ـــ

ان تصریحات کے ہوتے ہوئے کسی مسلمان کی یہ مجال ہو سکتی تھی کہ حضرت ام المومنین پر بہتان باندھ کر رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچائے، کسی شریف و پارسا مسلمان عورت پر بہتان باندھنا گناہ کبیرہ اور موجب حد قذف ہے، لیکن حضور ﷺ کی بیوی پر بہتان باندھنا کفر اور موجب لعنت ہے، سخت حیرت کی بات ہے کہ حسان بن ثابت و مسطح بن اثاثہ و حمنہ بنت جحش کو مومن مخلص بھی بتایا جائے اور ان کے متعلق یہ بھی باور کرایا جائے کہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی چہیتی بیوی پر بہتان باندھ کر وہ گناہ کرلیا ہوگا جو رسول اللہ ﷺ کے کسی دشمن نے دشمن مشرک یا یہودی نے بھی نہیں کیا، اگر کوئی شریف شخص اپنی شریف و پاکیزہ ماں پر بہتان لگا سکتی ہو تو حمنہ بنت جحش نے بھی لگا دیا ہوگا اور کوئی شریف بیٹا اپنی شریف ماں کو رسوا کرنے پر تل سکتا ہو تو حسان اور مسطح نے بھی اس کا ارتکاب کرلیا ہوگا ـــ"❶

① ہم تو اس ادیبانہ کاوش پر بعد میں تبصرہ کریں گے، آپ ذرا وہ عبارت پہلے پڑھ لیں جو حق کو واضح کرنے کے لیے خود میرٹھی صاحب کی قلم سے اللہ تعالیٰ نے نکلوا دی ہے:

''ہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ حضرت حسان شاعر تھے، شاعر دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ذکی الحس ہوتا ہے اور معمولی سی بات کو بڑی اہمیت دے ڈالتا ہے، جب منافقین نے چند پارسا مومن عورتوں کے خلاف طوفان افک اٹھایا تھا تو اس موقع پر حضرت حسان سے بھی ان کی ہمنوائی کی غلطی ہو گئی تھی۔ یعنی حسان بھی کسی پارسا مومن عورت کو بے ثبوت مطعون کر بیٹھے، اس کی سزا میں ان پر حدِ قذف جاری ہوئی، وہ کون عورت تھی؟ نہ ہم اسے جانتے ہیں نہ اس کے جاننے سے کچھ حاصل...'' ①

تیری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو میرے نامۂ سیاہ میں تھی

حدیثِ افک میں سیدنا حسان رضی اللہ عنہ کا تہمت لگانے والوں میں شامل ہونا میرٹھی صاحب کو شانِ صحابیت کے سخت خلاف معلوم ہوا تھا، لیکن جب انہوں نے خود اس صحابی کو ایک پاکدامن مومنہ عورت پر تہمت لگانے میں ملوث کیا تو اس سے ان کی صحابیت میں کچھ فرق نہ پڑا نہ بے گناہ پاکدامن عورت پر تہمت لگانے کے سلسلے میں قرآنی وعیدوں میں سے کسی پر نظر پڑی۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا

① [illegible] مطالعہ: ۱۸۳

وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿﴾ ❶

"بلاشبہ وہ لوگ جو پاکدامن، بھولی بھالی، مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، وہ دنیا و آخرت میں لعنت کیے گئے ہیں اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔"

﴿وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿﴾ ❷

"اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، پھر چار گواہ نہیں لاتے، ان کو اسی کوڑے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی بھی قبول نہ کرو اور یہی لوگ فاسق ہیں۔"

یاد رہے کہ میرٹھی صاحب نے صرف ازواج مطہرات پر تہمت لگانے والے کو موجب لعنت ٹھہرایا ہے، جبکہ قرآن کریم کی زبانی عام مومن پاکدامن عورت پر تہمت لگانے والا بھی دنیا و آخرت میں لعنتی ہے۔

اب اگر کوئی آدمی میرٹھی صاحب سے بھی دو قدم آگے نکل کر کہہ دے کہ صحابی رسول سیدنا حسان رضی اللہ عنہ نے کسی بھی پاکدامن عورت پر بہتان نہیں لگایا۔ ایسی باتیں محض افسانہ و جھوٹ ہیں اور تھوڑے سے بہت تصرف کے ساتھ میرٹھی صاحب والی گردان پڑھتے ہوئے، یہ کہہ دے کہ:

"ان تصریحات کے ہوتے ہوئے کس مسلمان کی یہ مجال ہو سکتی ہے کہ وہ کسی شریف و پاکدامن عورت پر بہتان لگا کر دنیا و آخرت میں لعنت کا مستحق ہو اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مردود الشہادۃ اور فاسق قرار پائے؟"

نیز وہ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ میرٹھی صاحب کے یہ الفاظ بھی نقل کر دے کہ:

---

❶ النور: ٢٣

❷ النور: ٤

"سخت حیرت و تعجب کی بات ہے حسان بن ثابت کو مومن و مخلص بھی بتایا جائے اور ان کے متعلق یہ بھی باور کرلیا جائے کہ انہوں نے ایک پاکدامن مومن عورت پر بہتان باندھ کر بالکل وہی گناہ کرلیا تھا جس میں صرف بڑے بڑے دشمنانِ اسلام منافقین ہی ملوث ہوئے تھے!"

اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہہ کہ:

"اگر کوئی غیرت مند اور شریف بھائی اپنی شریف و پاکیزہ بہن کو رسوا کرنے پر تل سکتا ہو تو حسان نے بھی اپنی اسلامی بہن کے خلاف اس جرم کا ارتکاب کرلیا ہوگا!"

مزید برآں وہ جنگِ جمل کی صورت میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی لڑائی کا بھی ذکر کرے جس کے ابھی تک میرٹھی صاحب بھی اقراری ہیں ❶ (آنے والے دنوں میں شاید یہ واقعہ بھی ان کے معتقدین کی عقل میں نہ سمائے اور وہ اسے بھی جھوٹا افسانہ قرار دے دیں!) پھر وہ یوں عبارت بنائے کہ:

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا مومنوں کی ماں ہیں، والدین کو تو قرآن نے اُف بھی کہنے سے منع کر دیا ہے اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ والدین کی رضا میں اللہ کی رضا اور والدین کی ناراضی میں اللہ کی ناراضی ہے۔ کوئی شریف و مومن بیٹا تو اپنی والدہ کو اس کی زیادتی کے باوجود اُف تک بھی نہیں کہہ سکتا، حیرت و تعجب کی بات ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مومن و مخلص بھی بتایا جائے اور ان کے متعلق یہ بھی باور کرلیا جائے کہ انہوں نے اس ہستی کے خلاف سر عام بازارِ جنگ گرم کرلیا تھا جس کو قرآن نے سب مومنوں کی ماں کہا ہے، اگر کوئی حلال زادہ اور شریف بیٹا اپنی ماں کو علی الاعلان رسوا کرنے پر تل سکتا ہو تو مان لیں گے کہ سیدنا

❶ دیکھیں "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۴۰

علی رضی اللہ عنہ نے بھی اس کا ارتکاب کر لیا ہوگا!"

تو میرٹھی صاحب کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ جو جواب وہ اس سوال کا دیں گے، وہی ہماری طرف سے واقعۂ افک میں کیے گئے اپنے اعتراض کا سمجھ لیں۔

④ جس بات کو ماننے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں، وہ یہ ہے کہ انسان ہونے کے ناطے کچھ مسلمان بھی منافقین کی باتوں میں آ گئے اور ان کی ہمنوائی کی غلطی ان سے ہوئی، جس کو اللہ تعالیٰ نے معاف بھی کر دیا۔ خود سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اس واقعہ کے بعد بھی سیدنا حسان رضی اللہ عنہ کو سچا پکا مسلمان سمجھتی تھیں اور ان کو برا بھلا کہنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں، بلکہ ایسا کرنے والے کو ان کے مخلص مؤمن ہونے کی دلیل کے طور پر رسول کریم ﷺ اور اسلام کے دفاع میں ان کے اشعار سناتی تھیں۔ ❶

رہا یہ سوال کہ جب قرآن مجید نے بہتان باندھنے والوں کے لیے دنیا و آخرت میں لعنت کی وعید سنائی ہے تو پھر سیدنا حسان اور دوسرے اشخاص جو اس واقعہ میں ملوث ہوئے تھے، ان کو ہم مخلص و مؤمن کیسے سمجھتے ہیں؟"

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جھوٹی تہمت لگانے والوں کی سزا بیان کرتے ہوئے سورۂ نور میں ساتھ ہی یہ فرمایا:

﴿إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝﴾ ❷

"ہاں! جو لوگ اس کے بعد توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت زیادہ معاف کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔"

---

❶ صحیح بخاری: ۴۱۴۱

❷ آل عمران: ۳/۸۹، النور: ۲۴/۵

پھر اس بات پر سب مسلمانوں کا اجماع بھی ہے کہ سب صحابہ جنتی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی زندگی میں ہی ان سے راضی ہو گیا تھا۔ اتنی سی بات تھی جس کے بجھنے میں نہ آنے نے میرٹھی صاحب کو انکار حدیث پر آمادہ کر دیا!

رنج و غم اور شادی کا اجتماع کیسے؟

میرٹھی صاحب اس حدیث کے "فرضی افسانہ" ثابت کرنے کے لیے ایک "دلیل" یوں دیتے ہیں:

"اس افسانہ کے فرضی ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ام المومنین حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بنی مصطلق سے واپسی اور اس عقد فرمایا ہے ۔۔۔ محمد بن اسحاق کی روایت یہ ہے کہ اولاً جویریہ بخیثیت اسیر، حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی تھیں، یعنی مال غنیمت تقسیم کرتے وقت آپ نے جویریہ ثابت کو بخش دی تھیں، حضرت جویریہ نے ثابت سے کتابت کا معاملہ کر لیا، یعنی یہ کہ میں آپ کو اس قدر رقم دے دوں گی، آپ مجھے آزاد کر دیں، ثابت نے فوراً منظور کر لیا ۔۔۔

جویریہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! میں بنی مصطلق کے سردار حارث کی بیٹی ہوں اور مشرف بہ اسلام ہوں، ثابت بن قیس نے جس کے حصہ میں میں آئی ہوں، مجھے مکاتب کر دیا ہے، مجھے ثابت کو وہ رقم ادا کرنی ہے، آپ نے فرمایا، اگر تمہیں منظور ہو تو وہ پوری رقم میں ادا کر دوں اور تم سے نکاح کر لوں، حضرت جویریہ نے عرض کیا، مجھے بالکل منظور ہے، آپ نے ثابت کو رقم ادا کر دی اور ان سے نکاح کر لیا ۔۔۔

پس اگر غزوہ بنی مصطلق سے واپسی پر حضرت صدیقہ پر بہتان لگنے کا واقعہ ہوا ہوتا تو یہ زمانہ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے شدید رنج و غم کا تھا، جو زہری کی روایت کے مطابق ایک ماہ

تک چلا ہے، تو کیا ایسے رنج و غم کے زمانے میں حضورِ اکرم ﷺ نکاح فرماتے؟ شادی و ناشادی تو ایک دوسرے کی نقیض ہیں، ان کا اجتماع نہیں ہو سکتا۔" 1

ازالہ ⓵ شادی و ناشادی یقیناً ایک دوسرے کی نقیض ہیں اور ان کا اجتماع نہیں ہو سکتا، لیکن اس حدیث میں تو اس اجتماع کا اشارہ تک موجود نہیں، کیا کوئی منکرِ حدیث کسی حدیث سے ہمیں یہ دکھا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عین اسی زمانے میں سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا سے شادی فرمائی تھی جب آپ ﷺ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر لگائے جانے والے بہتان کے رنج و غم میں مبتلا تھے؟

واقعہ یہ ہے سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا سے شادی یا تو سفر میں ہوگئی تھی یا سفر سے واپسی کے فوراً بعد ہوئی ہے، جب ابھی تک منافقین اپنے پروپیگنڈے کو ہوا دینے کی کوشش میں تھے اور رسول کریم ﷺ اس سے واقف نہ ہوئے تھے، میرٹھی صاحب کا کوئی جانشین ہمت کر کے کسی ایک روایت میں دونوں واقعات کا اجتماع ثابت کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ میرٹھی صاحب کے اس اعتراض کی بنیاد محض اس مفروضے پر ہے کہ یہ دونوں کام غزوۂ بنی مصطلق کے بعد ہوئے ہیں، لہٰذا ان کا "اجتماع" ہو گیا ہے، حالانکہ اس مفروضے کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں، کیا صرف ایسے کمزور شبہ کی بنا پر سب ابرِ دن کے سورج کی طرح روشن واقعہ کا انکار کر دیا جائے جسے تمام صحابہ و تابعین، ائمہ دین، محدثین، مفسرین، فقہاء اور اصولیین اپنے عقیدہ و عمل کی بنیاد بناتے چلے آئے ہیں اور جس کا چودہ سو سال میں آج تک کسی مسلمان نے انکار نہیں کیا؟

کیا میرٹھی صاحب کے خیال میں چودہ سو سال میں ان کے علاوہ کوئی ایک انسان بھی اتنا زیرک پیدا نہیں ہوا تھا کہ جس کے ذہن میں اس کے "فرضی افسانہ" ہونے کی یہ دلیل آ جاتی؟

---

1 "صحیح بخاری کا مطالعہ": 2/ 171، 172

(۴) سنن ابی داؤد کی جس روایت [1] سے استدلال کر کے صحیح بخاری کی متفق علیہ حدیث پر اعتراض کیا گیا ہے، میرٹھی صاحب کے قاعدے کے مطابق وہ ناقابلِ التفات ہے، اس میں وہی محمد بن اسحاق بن یسار امام المغازی رحمہ اللہ موجود ہیں، جن کے بارے میں میرٹھی صاحب اپنی اسی کتاب میں لکھ چکے ہیں:

''اس کی روایت مؤرخ محمد بن اسحاق نے کی ہے جو ثقہ نہ تھا، ضعیف و غلط بیان اور بات کا بتنگڑ بنا دینے والا آدمی تھا۔'' [2]

اب میرٹھی صاحب کا کوئی معتقد ہی بتائے کہ ان کی ''میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو'' والی اس پالیسی کو کیا نام دیا جائے؟ کیا اب بزعمِ خود ان کے مطلب کی بات آئی ہے تو وہی ''ضعیف و غلط بیان اور بات کا بتنگڑ بنا دینے والے'' محمد بن اسحاق رحمہ اللہ عین ثقہ ہو گئے ہیں کہ ان کی روایت کو بنیاد بنا کر ساری امتِ مسلمہ کی مسلّم حدیث کا انکار کر دیا ہے۔

﴿تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ﴾ یہ بندر بانٹ ہے!

حدیثِ افک کی عصمتِ انبیاء سے ''منافات''!

''اس گھڑی ہوئی بے بنیاد کہانی کو اس لیے بھی رد کرنا ضروری ہے کہ یہ عصمتِ انبیاء کے منافی ہے، توضیح اس کی یہ ہے کہ عصمتِ نبوت کا وصف لازم ہے، اللہ تعالیٰ نے جو بھی نبی مبعوث فرمایا، وہ معصوم تھا، یعنی ان تمام جسمانی و اخلاقی عیوب سے قطعاً محفوظ جو لوگوں کی نگاہ میں ذلت و حقارت کا باعث ہوں۔۔۔

کوئی جسمانی و اخلاقی عیب کسی نبی میں نہ ظہورِ نبوت سے قبل پایا گیا نہ ظہورِ نبوت کے بعد

---

[1] سنن ابی داود، حدیث نمبر: ۳۴۳۶

[2] ''صحیح بخاری کا مطالعہ'' : ۱/ ۱۵

کا ذات حادث ہوا اور ان عیوب میں سے ناپارسائی یعنی زنا کی وجہ سے پیدا شدہ ذلت و حقارت متعدی ہوتی ہے اور دیگر عیوب سے پیدا شدہ ذلت و حقارت اسی شخص کی ذات تک محدود رہتی ہے، جس میں وہ عیب ہو، مثلاً کوئی مرد چور ہو اور اس کے اعزا و اقربا، بھائی، بہن، اولاد، ماں، باپ، دادا، دادی چور نہ ہوں تو اس چور مرد سے نفرت کی جاتی ہے اور اسے کم تر ہی ہولی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے، اس کے اعزا و اقربا سے محض اس کے جرم کی وجہ سے نفرت نہیں کی جاتی الا یہ کہ وہ اس طرح اس چور کی اعانت و حمایت کرتے ہوں۔۔۔۔

لیکن زنا ایسا جرم ہے کہ اس کی وجہ سے پیدا شدہ نفرت و حقارت زانی و زانیہ کے اصول و فروع اور اہل و عیال کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے، زانیہ عورت کے جرم کی وجہ سے اس کے ماں، باپ، دادا، دادی کی، اس کے شوہر کی، اس کی اولاد کی بھی بے عزتی ہوتی ہے۔۔۔۔

پس جس طرح کوئی بھی نبی کبھی جرم زنا کا مرتکب نہیں ہوا اسی طرح کسی نبی کے والدین اور بھائیوں، بہنوں اور اہل و عیال سے بھی کوئی اس کا مرتکب نہیں ہوا۔

نبی کی بیوی کافرہ ہو سکتی تھی مگر زانیہ نہیں، نبی کے بیٹے یا بیٹی سے کفر کا صدور ہو سکتا تھا مگر زنا کا نہیں، نبی کے ماں باپ مبتلائے کفر ہو سکتے تھے مگر ان کا مبتلائے زنا ہونا ممکن نہ تھا، پس حضور ﷺ کی طرح آپ کی تمام ازواج مطہرات اور جملہ بنات طیبات کے لیے بھی عصمت تکوینی طور پر مقدر و لازم کر دی گئی تھی، جیسے تکوینی طور پر ہر زندہ انسان کے لیے سانس لینا لازم و مقدر کر دیا گیا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کو اس امر میں اپنے نبی کی عصمت اس قدر عزیز رہی ہے کہ کسی بے ہودہ شخص یا اشخاص نے اگر کسی نبی کی ذات یا نبی سے قرابت قریبہ رکھنے والی کسی ہستی کی عفت پر الزام لگایا تو علی الفور اس قدر واضح طریقے سے اس کی تردید فرما دی جیسے بے ابر دن میں نصف

اظہار کا سورج واضح ہوتا ہے۔

عزیز مصر کی بیوی نے اپنے شوہر کے سامنے اپنے بچاؤ کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام پر ارادۂ بد کا الزام لگایا تو علی الفور عزیز کے سامنے اس کی پول کھول دی گئی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کنواری مریم صدیقہ کی گود میں دیکھ کر لوگ بھڑک گئے اور ان پر الزام رکھنے لگے تو علی الفور حق تعالیٰ نے شیر خوار مسیح بن مریم کی زبان پر وہ سنجیدہ و باوقار تقریر جاری فرما دی جسے سن کر سب لوگ مبہوت رہ گئے اور پہلے سے بھی کہیں زیادہ حضرت مریم کے معتقد بن گئے، بلکہ انبیائے کرام کے علاوہ نیک و صالح بندوں پر بھی اللہ تعالیٰ کی یہ نوازش رہتی ہے۔

چنانچہ صحیح بخاری وغیرہ میں ایک عابد و زاہد جریج نامی شخص کا قصہ مذکور ہے جو خود حضور ﷺ کا بیان فرمودہ ہے کہ شیر خوار بچے نے جو اپنی جرم کار ماں کی گود میں تھا، برملا جریج کی بے گناہی ظاہر کر دی اور عامۃ الناس یہ کرامت دیکھ کر جریج کے بے حد معتقد ہو گئے، پس اگر ام المومنین پر الزام لگایا گیا ہوتا تو سنت اللہ تعالیٰ و سنت انبیاء کے مطابق علی الفور کوئی ایسی ہی قطعی اور یقینی تشفی روز فرما دیتا جس سے اس بہتان کے پرخچے اڑ جاتے۔ ایک ماہ تک مسلسل اپنے محبوب خاتم الانبیاء ﷺ کو اس جانکاہ غم میں مبتلا نہ رکھتا۔ اس لیے میں اس کہانی کو از اول تا آخر غلط سمجھتا ہوں۔۔۔" [1]

① اگر عقل ہی معیار ہے تو میرٹھی صاحب اور ان کے ہمنوا اس رافضی اور قرآن کریم میں (نعوذ باللہ) تحریف کے دعویٰ دار آدمی کو کیا جواب دیں گے جو قرآن کریم پر یہی اعتراض کر دے اور کہہ دے کہ: (نقل کفر کفر نباشد)

"میں قرآن میں مذکور یوسف علیہ السلام کا واقعہ (نعوذ باللہ) کسی کا اپنی طرف سے گھڑا ہوا سمجھتا ہوں۔"

[1] "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/۱۷۲-۱۷۵

کیونکہ یہ عصمتِ انبیاء اور سنتِ الٰہی کے خلاف معلوم ہوتا ہے، وہ یوں کہ کسی نبی پر یا کسی ولی پر بھی ناپارسائی کا کوئی الزام لگا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فوراً علی الاعلان سب کے برملا اس کی براءت کی ہے، جبکہ سورۂ یوسف میں یہ بتایا گیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی براءت کا برملا اعلان عزیزِ مصر کی بیوی نے اس وقت کیا، جب آپ چند سال تک قید کاٹ چکے تھے، پھر اس نے کہا تھا۔

﴿ اَلْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ، اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ ﴾ ❶

(اب حق آشکارا ہوا ہے، میں نے ہی اسے اس کے نفس کے بارے میں بہلایا تھا اور بلاشبہ وہ سچے لوگوں میں سے ہیں۔)

پھر یوسف علیہ السلام کا یہ قول ذکر کیا گیا ہے۔

﴿ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ۝ ﴾ ❷

[یہ (میری طرف سے کیا گیا تحقیق کا مطالبہ) اس لیے تھا کہ وہ (عزیزِ مصر) یقین کر لے کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس سے خیانت نہیں کی اور یقیناً اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کی تدبیر کو چلنے نہیں دیتے۔]

سنتِ الٰہی کے مطابق تو یوں ہونا چاہیے تھا کہ اسی وقت سب لوگوں کو سرِ عام یوسف علیہ السلام کی براءت سے آگاہ کیا جاتا، جیسا کہ مریم علیہا السلام کی گود میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے برملا سب لوگوں کے سامنے ان کی براءت کا اظہار کیا تھا اور سب لوگ اسی وقت ان کی پارسائی پر ایمان لے آئے تھے، لیکن یہاں مذکور ہے کہ کئی سال بعد سب لوگوں کے سامنے یہ حقیقت آشکارا ہوئی

❶ یوسف : 51 ❷ یوسف : 52

تھی۔ بلکہ خود یوسف علیہ السلام نے اس امر کی ضرورت محسوس کی اور بادشاہ کو یہ پیغام بھجوایا کہ پہلے اس کیس کی تحقیقات کروائیے تاکہ بادشاہ اور تمام لوگوں کو آپ علیہ السلام کی براءت کا یقین ہو جائے اور کسی قسم کا کوئی شبہ باقی نہ رہے۔۔۔"

تو میرٹھی کی تحقیق کے پاس اس اعتراض کا کیا جواب ہوگا؟

⑦ جریج راہب کے قصہ میں بھی "علی الفور" والی کوئی بات نہیں ہے، جس کا میرٹھی صاحب نے دعویٰ کیا ہے، بلکہ لوگوں نے عورت کے الزام پر یقین کر کے اس کے عبادت خانے کو مسمار کر دیا تھا اور اسے گالیاں بھی دی تھیں، صحیح بخاری ہی کے الفاظ ہیں:

((فأتوه، فكسروا صومعته، وأنزلوه، وسبّوه ...))

"لوگ اس کی طرف آئے، اس کے عبادت خانے کو ڈھا دیا، اس کو باہر نکالا اور اسے گالی گلوچ کیا۔۔۔"❶

اس واقعہ کو تو خود میرٹھی صاحب نے اپنے موقف کی تائید کے لیے پیش کیا ہے، اگر کوئی آدمی کہہ دے کہ:

"اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے نیک بندوں کو اس طرح کے الزام کی وجہ سے کوئی گزند پہنچنے سے پہلے ہی بری کر دیتا ہے لیکن جریج کے واقعہ کو میں غلط سمجھتا ہوں، کیونکہ اس میں یہ مذکور ہے کہ لوگوں نے اس کا عبادت خانہ مسمار کر دیا تھا، اسے باہر نکال دیا تھا اور اسے گالی گلوچ بھی کی تھی، حالانکہ چاہیے یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ علی الفور اس کی براءت کا اظہار فرماتا۔"

تو میرٹھی صاحب اور ان کے ہمنواؤں کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ جو وہ جواب اپنے ہاں اس تسلیم شدہ واقعہ کا دیں گے، وہی حدیثِ افک کا ہم دے دیں گے۔

❶ صحيح بخاري: ٢٤٨٢

(۳) اگر کوئی منکر قرآن یہ دعویٰ کرے:

"میں قرآن میں مذکور مریم علیہا السلام کا واقعہ تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ اس میں مذکور ہے کہ لوگوں نے سیدہ مریم علیہا السلام پر بہتان رکھ دیا تھا کہ تیرے ماں باپ تو ایسے بدکار نہ تھے تو نے کیا کیا ہے؟ حالانکہ عقل کا تقاضا یہ ہے اللہ کے نیک بندوں کے بارے میں ایسی بات ہونے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کوئی نشانی ظاہر کر کے لوگوں کو مطمئن کر دے۔ اس لیے کہ ایسی بات کا ایک دفعہ کہہ دیا جانا بھی انبیاء و صلحاء کی عصمت و عظمت کے منافی ہے۔"

تو منکرین صحیح بخاری کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا؟؟؟ وہی ہمارا جواب سمجھ لیں!!!

(۴) قرآن و سنت میں اللہ تعالیٰ کی یہ سنت مذکور ہے اور ہر مسلمان اس کا اقراری بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی آزمائش کرتا ہے، نیز ہر ذی شعور آدمی یہ سمجھتا ہے کہ جتنا کوئی انسان اللہ کے زیادہ قریب ہوگا، اتنی ہی اس کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے۔

تمام انبیاء و صلحاء مل کر بھی آقائے دو جہاں ﷺ کے مقام و مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے۔ آپ کا چونکہ مقام و مرتبہ سب سے اونچا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی آزمائش بھی سخت کی گئی، لہٰذا دیگر انبیاء و صلحاء کے اس طرح کے واقعات کے بنسبت اللہ تعالیٰ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت کا اعلان بھی دیر سے کیا، نیز اس میں بہت سی بلیغ حکمتیں پوشیدہ تھیں، جن کے تذکرے کا یہ مقام نہیں ہے۔

فصل ثالث: تاریخی اعتراضات کا جائزہ

بریرہ خادمہ کا فتح مکہ کے بعد سیدہ عائشہ کی خدمت میں آنے کا دعویٰ!

"بریرہ خادمہ رضی اللہ عنہا کا ذکر اس داستان میں اس کے سرتاپا جھوٹ ہونے کی واضح دلیل ہے، کیونکہ بریرہ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ کی آزاد کردہ کنیز تھی۔ ام المؤمنین نے اس کو فتح

مکہ کے بعد خریدا اور آزاد فرمادیا تھا۔۔۔۔

حضور اکرم ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی اپنے اہل وعیال کے ساتھ فتح مکہ کے بعد ہی مدینے میں منتقل ہوئے تھے۔۔۔۔

الغرض بریرہ کا ام المومنین رضی اللہ عنہا کی خدمت میں رہنا یقیناً فتح مکہ کے بعد کی بات ہے اور حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا پر بہتان لگنے کا واقعہ غزوۂ بنی المصطلق کے بعد بتایا جاتا ہے، اس وقت تو بریرہ ام المومنین کی خدمت میں آئی ہی نہ تھیں، والا کہ یہ غلط ہے، آزادی کے بعد ہی بریرہ کو خیار عتق (آزادی کے بعد لونڈی کو غلام خاوند کے ساتھ رہنے یا نہ رہنے کا اختیار) حاصل ہوا ہے جب ہی اس کے شوہر کو بے تابیاں لاحق ہوئی ہے اور ان دونوں کا متضاد حال دیکھ کر حضور اکرم ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہا:

الا تعجب من حب مغيث بريرة، ومن بغض بريرة مغيثاً.

(کیا آپ بریرہ سے مغیث کی محبت اور بریرہ کی مغیث سے نفرت پر تعجب نہیں کرتے؟)

اور یہی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بچشم خود مغیث کا بریرہ کے پیچھے روتے ہوئے پھرنا دیکھا ہے۔

اور تمام محدثین ومورخین قطعاً اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت عباس اور ان کے اہل وعیال فتح مکہ کے بعد ہی مدینہ منتقل ہوئے ہیں، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ اس داستان میں بریرہ کا ذکر قطعاً غلط ہے اور یہ غلط حضرت ام المومنین کی بیان کردہ نہیں ہے، یقیناً یہ غیب شپ بعد لوگوں نے وضع کر کے ام المومنین کی طرف منسوب کردی ہے۔

اس داستان کے مصنف کو یہ تو معلوم تھا کہ بریرہ نامی ایک باندی حضور اکرم ﷺ کے گھر حضرت عائشہ کی خدمت میں رہتی تھی، مگر اسے بحمد اللہ اس کا پتہ نہ تھا کہ وہ کس سنہ میں اور کب ام المومنین کی خدمت میں آئی تھی، پس اپنا افسانہ مکمل کرنے کے لیے اس نے اس میں

بریرہؓ کا اور اس سے پوچھ گچھ کیے جانے کا ذکر کر دیا ہے۔ اگر انہیں یہ بات معلوم ہوتی تو وہ اس کا ذکر نہ کرتے۔ حیرت اس پر ہے کہ محققین حتیٰ کہ امام بخاری ؒ جیسے حضرات کو بھی اس پر تنبہ نہ ہوا۔“ ❶

تبصرہ

① جناب نے یہ اعتراض کر کے اپنا ہی نقصان کیا ہے، کیونکہ وہ خود لکھ چکے ہیں کہ:

”یہ بے شک گھڑا ہوا ہے حضرت عائشہ ؓ پر بہتان لگنے والی داستان تھی۔۔۔“ ❷

ان کی عقل تو ٹھکانے آنے سے رہی، اللہ کے لیے آپ ہی سوچیں کہ اس حدیث میں بریرہؓ کے تذکرے کا صحیح یا غلط ہونا اس دور کے لوگوں کو زیادہ معلوم تھا یا چودہ سو سال بعد آنے والے شخص کو؟ اگر یہ غلط ہوتا تو کیا عروہ ؒ جو کہ ام المومنین سیدہ عائشہ ؓ کے بھانجے تھے، ان کو اور اسی طرح دوسرے تمام راویوں کو یہ معلوم نہ ہوتا؟ یقیناً یہ اعتراض کوئی عاقل شخص نہیں کر سکتا۔

② خود محدثین کرام نے حدیث افک کے بارے میں بعض لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے والے اس اشکال کا ازالہ کر کے وضاحت کر دی ہے، کاش حضرت صاحب صحیح بخاری کو سمجھنے کی کوشش کرتے، لیکن جب آدمی کے قلب و ذہن میں انکار حدیث کا فتور ڈیرا ڈال لے تو پھر وہ صحیح حدیث کو کب سمجھ سکتا ہے؟

• حافظ ابن حجر ؒ لکھتے ہیں:

وقد قيل إنّ تسميتها هنا وهم، لأنّ قصّتها كانت بعد فتح مكة... وقد أجاب غيره بأنّها كانت تخدم عائشة بالأجرة، وهي في رقّ مواليها

❶ ”صحیح بخاری کا مطالعہ“: ۱/۱۵۶۔۱۵۸ ❷ ”صحیح بخاری کا مطالعہ“: ۱/۲۲

قبل وقوع قصتها في المكاتبة.

"(اعتراض کرتے ہوئے یہ) کہا گیا ہے کہ اس حدیث میں اس (بریرہ) کا نام لینا (راوی کا) وہم ہے، کیونکہ اس کا (آزادی والا) قصہ فتح مکہ کے بعد کا ہے۔۔۔ بلا شبہ ان کے علاوہ (دوسرے محدثین) نے (اس اعتراض کا) یہ جواب دیا ہے کہ بریرہ رضی اللہ عنہا اپنے مکاتبت والے قصہ کے رونما ہونے سے پہلے، جبکہ ابھی اپنے مالکوں کی غلامی میں تھیں، اجرت پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت کرتی تھیں۔" ❶

معلوم ہوا کہ محدثین نے صدیوں پہلے اس اعتراض کا جواب دے دیا تھا، لیکن منکرین حدیث نے اپنی جہالت مطلقہ کا پورا پورا ثبوت دیتے ہوئے اس کو دہرایا ہے، لہٰذا ان کو امام بخاری رحمہ اللہ پر جرح کرنے کی بجائے اپنی بے عقلی و لاعلمی پر جرح کرنی چاہیے۔

جن بہت سے علمائے امت نے اس اشکال کو دور کیا ہے، ان میں سے صرف چند ایک کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

- علامہ تقی الدین سبکی (۶۸۳-۷۵۶ھ) فرماتے ہیں:

انها كانت تخدم عائشة قبل شرائها.

"وہ (بریرہ رضی اللہ عنہا) ان (سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا) کے خریدنے سے پہلے ان کی خدمت کرتی تھیں۔" ❷

- علامہ محمد بن عبدالباقی الزرقانی (م ۱۱۲۲ھ) لکھتے ہیں:

وكانت تخدم عائشة قبل أن تعتق، كما في حديث الافك.

❶ فتح الباری لابن حجر: ۸/ ۴۶۱

❷ فتح الباری لابن حجر: ۹/ ۴۰۳

"وہ (بریرہ رضی اللہ عنہا) آزادی پانے سے پہلے ہی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں رہتی تھیں، جیسا کہ حدیثِ افک میں (ان کا ذکر موجود) ہے۔" ❶

● خود حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وكانت تخدم عائشة قبل أن تعتق .

"وہ (بریرہ رضی اللہ عنہا) آزاد ہونے سے پہلے ہی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت کرتی تھیں۔" ❷

● ملا علی قاری حنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وإنما ذكرها في قصة الافك مع تقدمها فوجهه بأنها كانت تخدم عائشة قبل شرائها ...

"رہا ان (بریرہ رضی اللہ عنہا) کا واقعہ افک میں ذکر آنا، حالانکہ وہ واقعہ پہلے رونما ہو چکا تھا تو اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ بریرہ رضی اللہ عنہا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے خریدنے سے پہلے بھی ان کی خدمت میں رہتی تھیں۔" ❸

● علامہ محمد عبدالرحمٰن مبارکپوری ❹، علامہ عبیداللہ مبارکپوری ❺ وغیرہما رحمہم اللہ نے بھی یہی جواب ذکر کر کے صحیح بخاری کی حدیثِ افک کا دفاع کیا ہے۔

اب قارئین ہی فیصلہ فرمائیں کہ بتصریح محدثین خادمہ بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ افک میں تذکرہ اس حدیث کی صحت میں کوئی شبہ پیدا نہیں کرتا، بلکہ میرٹھی صاحب کا یہ اعتراض خود ان کا اپنا نقصان

❶ شرح الزرقاني على الموطأ: ١٦٢/٤

❷ فتح الباري لابن حجر: ١٨٨/٥

❸ مرقاة المفاتيح: ١٣٩/١٠ ❹ تحفة الأحوذي: ٣٩٠/٤

❺ مرعاة المفاتيح: ٢١٨/٦

ہے، کیونکہ بریرہ رضی اللہ عنہا کو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بعد میں آزاد کرنا عقل سلیم کے مطابق اس بات کے بالکل منافی نہیں ہے کہ وہ پہلے بھی آپ رضی اللہ عنہا کی خدمت کرتی ہوں۔

سیدنا سعد بن معاذ کی شہادت اور واقعۂ افک تاریخ کے تناظر میں!

"اس داستان میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا ذکر ہونا اس کے قطعی جھوٹ ہونے کی نہایت واضح و قطعی دلیل ہے، اس لیے کہ تمام مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ غزوۂ بنی مصطلق جسے غزوۂ المریسیع بھی کہا جاتا ہے، غزوۂ احزاب کے تقریباً نو ماہ بعد ہوا ہے۔۔۔

اور زہری کی داستان میں یہ ہے کہ حضرت ام المؤمنین پر افک و بہتان لگنے کا قصہ غزوۂ بنی مصطلق سے واپسی میں پیش آیا تھا۔۔۔اسی پر تمام مؤرخین نے اعتماد کیا ہے اور ناظرین کو معلوم ہوگا اور معلوم نہیں ہے تو ہو جانا چاہیے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ غزوۂ بنی مصطلق کے وقت اس عالم میں تھے ہی نہیں، کیونکہ ان کی وفات غزوۂ احزاب سے تقریباً چالیس دن بعد ہوئی ہے، جنگ احزاب میں ان کی رگ اکحل میں کسی مشرک کا تیر لگ گیا تھا۔۔۔

بنی قریظہ کی مہم ختم ہوتے ہی رات کو زخم کا منہ کھل گیا اور جسم سے خون نچڑ نچڑ کر بہہ گیا اور وفات ہوگئی۔۔۔اس پر تمام مؤرخین کا اتفاق ہے، خود ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی وفات کا پورا قصہ بیان کیا ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کی تین جگہ تخریج فرمائی ہے۔۔۔

جب کہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے بنی قریظہ کے بعد متصلاً وفات پائی ہے تو خود وہی کیسے یہ بیان کر سکتی تھیں کہ نو دس ماہ بعد سعد بن معاذ نے مسجد کے اندر بھرے مجمع میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا۔۔۔؟

یہ اشکال نہایت واضح ہے اور سخت حیرت ہے کہ محقق محدثین و مؤرخین حتیٰ کہ امام بخاری

جیسے شخص کا ذہن بھی اس کی طرف منتقل نہ ہوا۔۔۔"[1]

جواب: ① میرٹھی صاحب حدیثِ رسول کو (معاذ اللہ) جھوٹ ثابت کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لے رہے ہیں، ان کا یہ کہنا کہ تمام مؤرخین غزوۂ بنی المصطلق کے غزوۂ احزاب کے بعد رونما ہونے پر متفق ہیں، ایسا کالا جھوٹ ہے، جیسا کہ مرزا غلام احمد قادیانی دجال کا دعویٰ نبوت، کیونکہ:

- امام موسیٰ بن عقبہ رحمہ اللہ (م ۱۴۱ھ) کے بقول غزوۂ بنی المصطلق غزوۂ احزاب سے پہلے کا ہے۔[2]

- امام محمد بن مسلم بن شہاب زہری رحمہ اللہ (م ۱۲۵ھ) فرماتے ہیں:

ثمّ قاتل بني المصطلق وبني لحيان في شعبان سنة خمس.

"پھر آپ ﷺ نے بنو مصطلق اور بنو لحیان سے شعبان پانچ ہجری میں قتال فرمایا۔"[3]

- مغازی کے ماہر ابو معشر المدنی (م ۱۷۰ھ) نے غزوۂ بنی المصطلق کو پہلے اور غزوۂ احزاب کو بعد میں ذکر کیا ہے۔[4]

غزوۂ احزاب شوال میں ہوا ہے، لہٰذا امام زہری رحمہ اللہ کے نزدیک غزوۂ بنی المصطلق لامحالہ پہلے ہوا ہے، کیونکہ وہ اسی سال کے ماہ شعبان میں ہوا ہے۔

- امام اسماعیل بن اسحاق القاضی رحمہ اللہ (م ۲۸۲ھ) فرماتے ہیں:

---

1. "صحیح بخاری کا مطالعہ" ۲/۱۶۲
2. فتح الباری لابن حجر: [illegible] وسندہ صحیح
3. السنن الکبریٰ للبیہقی: ۹/۵۴ وسندہ صحیح
4. فتح الباری لابن حجر: ۷/۴۳۰

اختلفوا في ذلك ، والأولى أن تكون المريسيع قبل الخندق ، وعلى هذا فلا اشكال ...

"لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے، زیادہ بہتر یہی ہے کہ غزوۂ مریسیع کو غزوۂ احزاب سے پہلے سمجھا جائے، اس طرح کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔" ❶

❁ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ (۶۹۱-۷۵۱ھ) نے بھی پہلے غزوۂ مریسیع کو اور بعد میں غزوۂ احزاب کو ذکر کیا ہے۔ ❷

❁ مؤرخ اسلام علامہ ذہبی رحمہ اللہ (۶۷۳-۷۴۸ھ) نے اپنی مشہور زمانہ کتاب تاریخ اسلام میں غزوۂ مریسیع کو پہلے اور غزوۂ احزاب کو بعد میں ذکر کیا ہے۔

❁ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (۷۷۳-۸۵۲ھ) لکھتے ہیں:

فيظهر أن المريسيع كانت في سنة خمس في شعبان لتكون قد وقعت قبل الخندق ، لأن الخندق كانت في شوال من سنة خمس أيضا فتكون بعدها ...

"(ان دلائل سے) ظاہر ہوتا ہے کہ غزوۂ مریسیع شعبان پانچ ہجری میں ہوا تھا، اس لیے غزوۂ خندق سے پہلے رونما ہوا ہے، کیونکہ غزوۂ خندق پانچ ہجری ہی کے شوال میں ہوا تھا، چنانچہ احزاب بعد میں ہے۔" ❸

❁ عالم عرب کے مشہور عالم شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

---

❶ شرح مسلم للنووی: ۲/۳۰۵، زاد المعاد لابن قیم: ۲/۱۲۸، فتح الباری: ۸/۴۳۷

❷ دیکھیں: زاد المعاد لابن القیم

❸ فتح الباری لابن حجر: ۷/۴۳۰

لأن غزوة الخندق كانت في شوال في السنة الخامسة .

"بلاشبہ غزوۂ خندق شوال پانچ ہجری میں ہی پیش آیا تھا۔" ❶

لہٰذا ان کے نزدیک بھی لامحالہ غزوۂ احزاب بعد میں، اور غزوۂ مریسیع کا واقعہ پہلے ہی پیش آیا ہے۔

❂ موجودہ دور میں عالم عرب کے معروف و محقق مؤرخ محمد الغزالی لکھتے ہیں:

وكتاب السيرة على أن حديث الإفك وغزوة بني المصطلق كانا بعد الخندق ، لكننا تابعنا ابن القيم في اعتبارها من حوادث السنة الخامسة قبل هجوم الأحزاب على المدينة ، والتحقيق يساند ابن القيم و متابعيه ....

"سیرت کی کتاب میں یہ ہے کہ واقعہ افک اور غزوۂ بنی المصطلق غزوۂ خندق (احزاب) کے بعد ہوئے تھے، لیکن ہم نے حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کی پیروی کرتے ہوئے سنہ پانچ ہجری میں غزوۂ احزاب سے پہلے شمار کیا ہے اور تحقیق (بھی) حافظ ابن قیم اور ان کے پیروکاروں کے موقف کی تائید کرتی ہے ...." ❷

❂ عصر حاضر کے ایک اور مؤرخ محمد الخضری نے بھی غزوۂ بنی المصطلق کو غزوۂ احزاب سے پہلے کا واقعہ قرار دیا ہے۔ ❸

❂ اردو اور عربی زبان میں معروف کتاب سیرت "الرحیق المختوم" کے مصنف مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے بھی دلائل کے لحاظ سے راجح اسی بات کو قرار دیا ہے کہ غزوۂ

❶ شرح بلوغ المرام للشيخ العثيمين : ٥/٢٩٨

❷ فقه السيرة لمحمد الغزالي : ٢٦٦

❸ نور اليقين في سيرة سيد المرسلين لمحمد الخضري : ١٥٧

مریسیع کو غزوۂ احزاب سے مقدم کہا جائے۔ ❶

مذکورہ مؤرخین کے علاوہ بھی بہت سے متقدمین مؤرخین، مثلاً:

① ابوعبداللہ محمد بن عمر الواقدی (م ۲۰۷ھ) ❷

② محمد بن سعد بن منیع المعروف ابن سعد (۱۶۸-۲۳۰ھ) ❸

③ احمد بن یحییٰ بن جابر البلاذری ❹

نیز متاخرین، مثلاً:

④ ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی ❺

⑤ ڈاکٹر محمد بن محمد ابو شہبہ ❻

⑥ حسن الساعاتی ❼ اور

⑦ الصابونی ❽

وغیرہم نے بھی غزوۂ بنی المصطلق کو شعبان پانچویں ہجری میں بتایا ہے اور ان کے نزدیک غزوۂ خندق پانچویں ہجری ہی کے ماہ شوال میں پیش آیا تھا، لہٰذا بدیہی بات ہے کہ ان مؤرخین کے نزدیک بھی غزوۂ مریسیع پہلے پیش آیا ہے۔

---

❶ الرحیق المختوم اردو: صفحہ ۳۴۲-۳۴۳

❷ مغازی الواقدی: ۱/۴۰۴ ❸ طبقات ابن سعد: ۶۳/۲

❹ انساب قریش للبلاذری: ۱/۳۴۰-۳۴۱

❺ فقہ السیرۃ للبوطی: ۳۰۲/۲

❻ السیرۃ النبویۃ فی ضوء القرآن والسنۃ: ۱۹۶/۲

❼ الفتح الربانی فی ترتیب مسند احمد: ۱۰۹/۲۱

❽ روائع البیان فی تفسیر آیات الاحکام للصابونی: ۱۱۹/۲

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی یاد رہے کہ جن مؤرخین نے غزوۂ مریسیع کو چار ہجری کے واقعات میں شمار کیا ہے، بلاشبہ ان کے نزدیک بھی غزوۂ احزاب اس کے بعد ہی پیش آیا ہے۔ ان میں سے مشہور یہ ہیں:

ابو الحسن علی بن الحسین بن علی المسعودی (م ۳۴۶ھ) ❶

محمد بن عبداللہ بن محمد المعافری ابوبکر ابن العربی المالکی رحمہ اللہ (۴۶۸ ـ ۵۴۳ھ) ❷

ثابت ہوا کہ غزوۂ بنی المصطلق کے غزوۂ احزاب کے بعد ہونے پر اتفاق کا دعویٰ میرٹھی صاحب کی بے بنیاد بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بارے میں مؤرخین کی آرا مختلف ہیں اور دلائل کی رو سے راجح بات یہی ہے کہ غزوۂ بنی المصطلق کا واقعہ غزوۂ احزاب سے پہلے کا ہے، کیونکہ قدیم و جدید مؤرخین میں سے محققین نے اسی کو حق و صواب قرار دیا ہے، نیز صحیح بخاری کی صحت پر علمائے امت کا اجماع بھی اسی موقف کی تائید کرتا ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور دیگر علمائے امت نے صراحت کر دی ہے۔

رہا غزوۂ بنی المصطلق کو پہلے قرار دینے پر یہ اشکال پیش کرنا کہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا رسول کریم ﷺ کے نکاح میں آنے اور پردے کی آیات نازل ہونے کے واقعات غزوۂ احزاب کے بعد کے ہیں، پھر ان کا ذکر حدیثِ افک میں کیسے آ گیا؟ تو میرٹھی صاحب کا یہ اشکال بھی سابقہ اعتراض کی طرح محض ایک مغالطہ ہی ہے، کیونکہ پردے کی آیت کے نزول اور پھر سیدہ زینب رضی اللہ عنہا سے رسول کریم ﷺ کے نکاح کا واقعہ بھی راجح موقف کے مطابق تین یا چار ہجری میں غزوۂ مریسیع سے پہلے پیش آیا تھا، جیسا کہ

---

❶ مروج الذهب للمسعودي: ۲/۲۹۵

❷ عارضة الأحوذي شرح جامع الترمذي: ۱۷۲/۷

ابو عمرو خلیفہ بن خیاط العصفری (م ۲۴۰ھ) ❶

ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ (۱۱۴ـ۲۰۸ھ) ❷

وغیرہ کے نزدیک یہ واقعات تین ہجری کے ہیں، جبکہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ وغیرہ چار ہجری میں بتاتے ہیں۔

⊙ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

والحجاب كان في ذي القعدة سنة أربع عند جماعة، فيكون المريسيع بعد ذلك..

"(نزول) حجاب (پردہ کا واقعہ) بہت سے مؤرخین کے ہاں ذوالقعدہ چار ہجری کا ہے، یوں یہ غزوہ مریسیع کے بعد پیش آیا ہے۔۔۔"

نیز لکھتے ہیں: فحصلنا في الحجاب على ثلاثة أقوال أشهرها سنة أربع...

"چنانچہ ہمیں نزولِ حجاب کے بارے میں تین اقوال ملے ہیں، ان میں سے زیادہ مشہور قول چار ہجری کا ہے۔۔۔" ❸

اس کے برعکس پانچ ہجری میں غزوۂ احزاب کے بعد نزولِ حجاب والے قول کے بارے میں فرماتے ہیں:

وأمّا قول الواقدي: إنّ الحجاب كان في ذي القعدة سنة خمس، فمردود.

---

❶ تاریخ خلیفہ بن خیاط

❷ الاستیعاب فی معرفة الأصحاب لابن عبد البر ۲/ ۵۷، اسد الغابة فی معرفة الصحابة لابن الأثیر ۲۵۷/۳

❸ فتح الباری لابن حجر ۷/ ۴۳۰

الحمدللہ! میرٹھی صاحب کے صحیح بخاری کی حدیث ایک پر کیے گئے تمام اعتراضات کا ہم نے مفصل جواب دے دیا ہے۔ ان اعتراضات کے آخر میں خلط بحث سے کام لیتے ہوئے میرٹھی صاحب نے دس سے زائد صفحات خواہ مخواہ سیاہ کیے ہیں، کہتے ہیں:

"رہا یہ سوال کہ اس قرشی کہانی کا مصنف کون ہے اور وجہ تصنیف کیا تھی؟ تو اس کا جواب دینے سے قبل میں ان تینوں روایتوں کی اسناد پر بحث کروں گا۔" ❶

اسناد پر اعتراضات کا تو ہم نے تفصیلی جواب شروع میں عن کی اعتراضات اور ان کے جوابات کے ضمن میں دے دیا ہے، باقی میرٹھی صاحب نے خود یہ اعتراف بھی کر لیا ہے کہ ان کے نزدیک جو اس کہانی کا مصنف ہے، اس کا نام وہ نہیں جانتے۔ نہ معلوم پھر وہ اٹکل پچو سے کام کیوں لے رہے ہیں؟

رہی وجہ تصنیف تو اس میں انھوں نے نہایت بے بنیاد باتیں کی ہیں، جن کا ان کے موضوع، یعنی صحیح بخاری سے کوئی تعلق نہیں، لہٰذا ہم ان کی اس کاوش کی طرف التفات نہیں کر رہے، حالانکہ وہاں بھی جا بجا ان پر گرفت کی جا سکتی ہے، لیکن یہ سب کچھ ہمارے موضوع سے خارج ہے اور ہم اس بے فائدہ کام میں اپنا وقت صرف نہیں کرنا چاہتے۔

جس کی قسمت میں ہدایت ہے، وہ مذکورہ دلائل کا مطالعہ کر کے ضرور صراطِ مستقیم کا راہی بنے گا۔ ان شاء اللہ!

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حق کو سمجھ کر اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

---

❶ "صحیح بخاری کا مطالعہ": ۱/ ۱۷

اشاریہ رواۃ

وہ راوی یا ائمہ جرح و تعدیل جن کے بارے میں تفصیلی معلومات درج کی گئی ہے

اشاریہ اصول حدیث

اشاریہ صاحب کتاب

اشاریۂ متفرقات